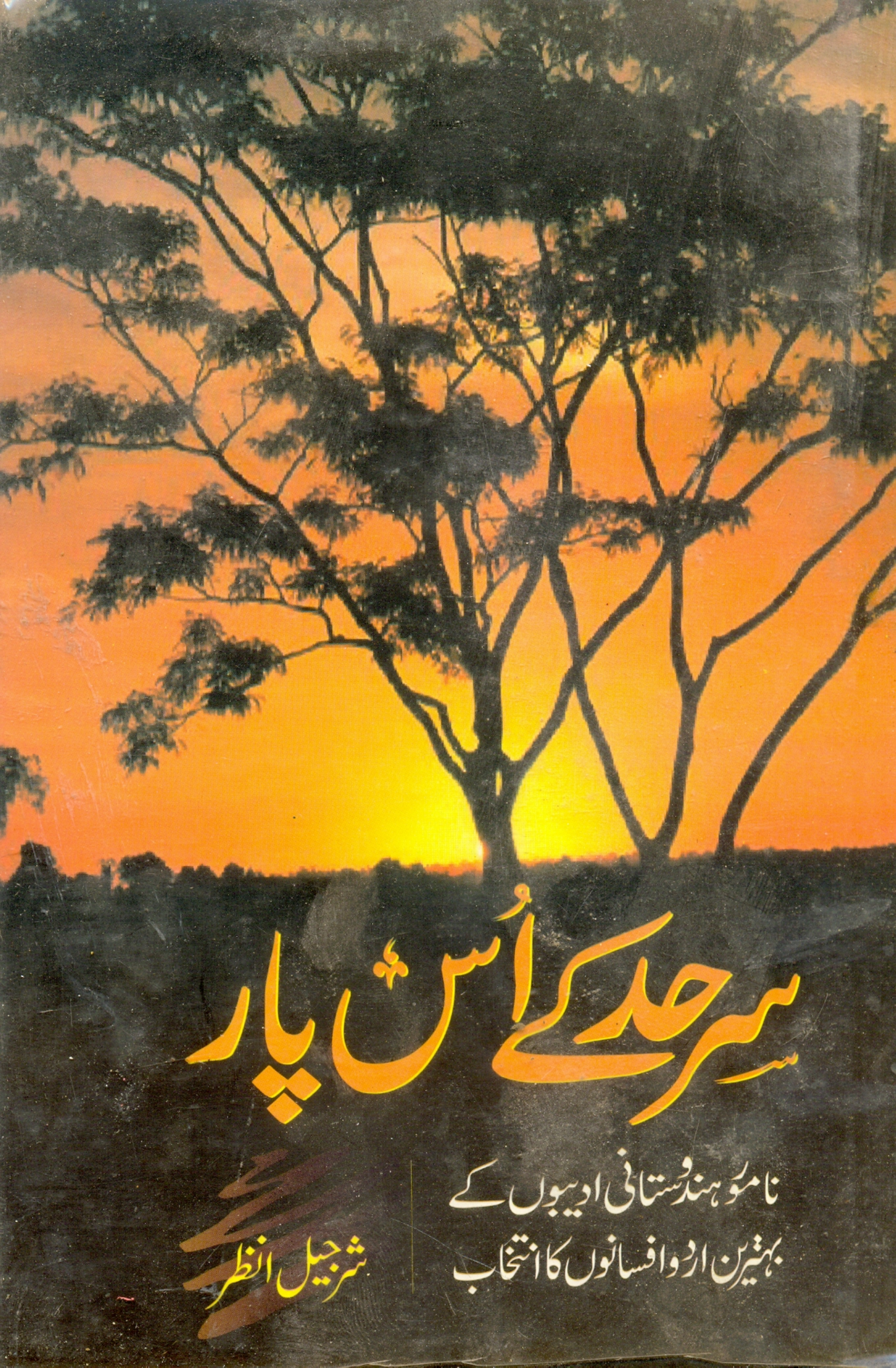
سرحد کے اُس پار
نامور ہندوستانی ادیبوں کے
بہترین اردو افسانوں کا انتخاب
شرجیل انظر

سرحد کے اُس پار

ہندوستان میں لکھے جانے والے اُردو افسانوں کا انتخاب

انتخاب

شرجیل انظر

نگارشات

24- مزنگ روڈ ○ لاہور فون:0092-42-7322892

E-mail:nigarshat@yahoo.com nigarshat@wol.net.pk

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: سرحد کے اُس پار

انتخاب: شرجیل انظر

ناشر: آصف جاوید

برائے نگارشات پبلشرز، 24- مزنگ روڈ، لاہور

فون: 7322892

مطبع: المطبعتہ العربیہ، لاہور

سال اشاعت: 2003ء

قیمت: 200 روپے

فہرست

علی عباس حسینی

⇦ میلہ گھومنی 9

حیات اللہ انصاری

⇦ بھرے بازار میں 14

کرشن چندر

⇦ پورے چاند کی رات 22

راجندر سنگھ بیدی

⇦ لاجونتی 31

عصمت چغتائی

⇦ دو ہاتھ 42

دیوندر ستیارتھی

⇦ اَنّ دیوتا 50

بلونت سنگھ

⇦ کٹھن ڈگریا 57

امرتا پریتم

⇦ شاہ دی کنجری 67

سہیل عظیم آبادی

⇦ بھابی جان 73

رتن سنگھ

⇦ ہزاروں سال لمبی رات 80

قاضی عبدالستار

⇦ مالکن 83

اوپندر ناتھ اشک

⇦ بینگن کا پودا 96

خواجہ احمد عباس

⇦ بارہ گھنٹے 102

رضیہ سجاد ظہیر

⇦ کچھ تو کہیے 111

ہنس راج راہبر

⇦ مہاوت 115

قرۃ العین حیدر

⇦ ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی 120

انور عظیم

⇦ ساری رات 129

جیلانی بانو

⇦ جوائے 134

رام لعل

⇦ نئی دھرتی پرانے گیت 142

جوگندر پال

⇦ بُو 152

اقبال متین
⇦ شعلہ پوش 161
سریندر پرکاش
⇦ سرکس 168
بلراج مینرا
⇦ وہ 174
کلام حیدری
⇦ سخی 180
غیاث احمد گدی
⇦ دیمک 186
اقبال مجید
⇦ ایک حلفیہ بیان 197
دیوندر اسر
⇦ جنگل 202
احمد یوسف
⇦ بلب ایک گزرگاہ کا 207
عابد سہیل
⇦ سب سے چھوٹا غم 213
سلام بن رزاق
⇦ ندی 218
الیاس احمد گدی
⇦ ٹام جیفرسن کے پنجرے 225
آمنہ ابوالحسن
⇦ لحاف 234

سلطان سبحانی
⇦ زیریں دنیا کی نگاہیں........................ 237
انور خان
⇦ راستے اور کھڑکیاں........................ 244
ساجد رشید
⇦ جلتے پروں سے اُڑان........................ 250
نیر مسعود
⇦ ندبہ........................ 254
انور قمر
⇦ چوراہے پر ننگا آدمی........................ 266
حسین الحق
⇦ مردہ راڈار........................ 270
شوکت حیات
⇦ گھڑیال........................ 277
عبدالصمد
⇦ دوسری حکومت........................ 281
سید محمد اشرف
⇦ آدمی........................ 285
علی امام نقوی
⇦ شائبہ........................ 292
شرون کمار ورما
⇦ ایک تھا تاراچند........................ 299
شفق
⇦ چٹکی بھر زندگی........................ 308

انیس رفیع
⇦ اب وہ اُترنے والا ہے 313
گلزار
⇦ مائیکل اینجلو 317

☆☆☆

علی عباس حسینی

میلہ گھومنی

کانوں کی سنی نہیں کہتا' آنکھوں کی دیکھی کہتا ہوں' کسی بدیسی واقعہ کا بیان نہیں' اپنے ہی دیس کی داستان ہے گاؤں گھر کی بات ہے۔ جھوٹ سچ کا الزام جس کے سر پر جی چاہے رکھئے۔ مجھے کہانی کہنا ہے اور آپ کو سننا۔

دو بھائی تھے۔ چنو منّو نام کہلاتے تھے پٹھان۔ مگر ننھیال' جولا ہے ٹولی میں تھا اور ددیہال' سیدواڑے میں۔ ماں پر جا کی طرح میر صاحب کے ہاں کام کرنے آئی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی صاحب نے اس سے کچھ اور کام بھی لیے اور نتیجے میں ہاتھ آئے چنو منو۔ وہ تو یادگار چھوڑ کر جنت سدھارے اور خمیازہ بھگتا بڑے میر صاحب نے انہوں نے بی جولاہن کو ایک کچا مکان عطا کیا اور چنّو منّو کی پرورش کے لیے کچھ روپے دیئے۔ وہ دونوں پلے بڑھے۔ اچھے ہاتھ پاؤں نکالے' چنو ذرا سنجیدہ تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی میر صاحب کے کارندوں میں ملازم ہوا اور ہمسن میر صاحبان کا مصاحب بنا۔ منّو لاابالی تھا۔ اہیروں کے ساتھ اکھاڑوں میں کشتی لڑا اور نام کے لیے کھیتی باڑی کرنے لگا۔

لیکن دونوں جوان ہوتے ہی اعصاب کا شکار ہوئے۔ خون کی گرمیاں وراثت اور ماحول سے ملی تھیں۔ دونوں جنسیات کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے لگے۔ شدہ شدہ میر صاحب کے کانوں تک ان کارناموں کی داستانیں پہنچیں۔ انہوں نے چنو کو اسی طرح کی ایک لڑکی سے بیاہ کر باندھ دیا لیکن چنو چھٹے سانڈ کی طرح مختلف کھیت چرتا رہا۔ اس کی ہنگامہ آرائیوں کا غلغلہ دور تک پہنچا۔ بالآخر میر صاحب کے پاس اہیر ٹولی' چمار ٹولی۔ جولاہے ٹولی ہر سمت اور ہر محلے سے فریاد کی صدائیں پہنچنے لگیں۔ انہوں نے عاجز آ کر ایک دن اس کی ماں کو بلوا بھیجا' وہ جب گھونگھٹ نکال کے لجاتی' سہمتی ان کی بیوی کے پلنگ کے پاس زمین پر آ کر بیٹھی تو میر صاحب نے منو کی شکایت کی اور کہا اس لونڈے کو روکو ورنہ ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے۔''

اس نے آہستہ سے کہا۔

''تو میں کیا کر سکتی ہوں' آپ ہی چنو کی طرح اسے بھی کسی ناند سے لگا دیجئے۔''

میر صاحب بڑی سوچ میں پڑ گئے۔ یہ نئی قوم کا قلمی پودا کسی مناسب ہی تھالے میں لگایا جا سکتا تھا۔ ہر زمین تو اس کو قبول نہیں کر سکتی۔ اور وہاں اس کے کارناموں کی شہرت نے ہر جگہ شوریت پیدا کردی تھی، وہ زنان خانے سے سوچتے ہوئے باہر چلے آئے اور برابر سوچتے ہی رہے۔

اتفاق سے انہی دنوں دوری کے میلے سے واپس ہونے والوں کے ساتھ ایک نامعلوم قبیلے کی عورت گاؤں میں آئی اور ایک دن میر صاحب کے ہاں نوکری کی تلاش کے بہانے پہنچی۔ سیّدانی بی نے شکل صورت دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ ان کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے رہنے والی عورت نہیں پوچھنے گچھنے سے یہ بھی معلوم کرلیا کہ وہ گاؤں کے درزی کے ساتھ میلے سے آئی ہے اور اس کے ہاں ٹکی بھی ہے۔ سیدانی بی ان درزی کی حرکات سن چکی تھیں۔ جب سے اس کی درزن سدھاری تھی، اس نے میلوں سے نئی نئی عورتوں کو لانا اور گاؤں کی نسوانی آبادی میں اضافہ کرنا اپنا وطیرہ بنالیا تھا۔ پھر بھی سیدانی بی بی کے رئیسانہ مزاج نے صاف صاف انکار کی اجازت نہ دی۔ انہوں نے کہا۔

اچھا گھر میں رہو اور کام کرو۔ دو چار دن میں تمہارے لیے کوئی بندوبست کروں گی۔

ادھر مردانے میں میر صاحب کو ان کے ہم جلیسوں نے نووارد کی خبر دی۔ ایک صاحب نے جو ذرا ظریف بھی تھے، ان کی تاریخ یوں بیان کی۔

راویانِ صادق کا قول ہے کہ اصل کی بنجارن ہے، وہ بنجارن سے ٹھکرائن۔ ٹھکرائن سے پٹھانی، پٹھانی سے کبڑن، کبڑن سے درزن اور اب درزن سے سیّدانی بننے کے ارادے رکھتی ہے۔

''ایک صاحب نے پوچھا اور اس کے بعد؟''

وہ دونوں شانے اٹھا کر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے ''خدا ہی جانے شاید اس کے بعد فرشتوں سے آنکھ لڑائے گی۔'' میر صاحب جب گھر آئے تو بیوی نے ان محترمہ کے آنے کی خبر دی۔ بہت جز بز ہوئے، اس سیرت کی عورت اور شرفاء کے گھر میں؟ وہ نیک قدم خود بھی کسی کام کے سلسلہ میں سامنے آئیں۔ میر صاحب بل کھانے لگے۔ نوکری کرنے آئی تھی، اگر انکار کرتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں تو اسے معصیت کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ پیٹ کے لیے انسان کیا کچھ نہیں کرتا ہے۔ اگر اپنے ہاں باندھ دیتے ہیں تو گھر میں ماشاء اللہ کئی چھوٹے میر صاجان ہیں۔ کہیں چنومنو کی نسل اور نہ بڑھے، ان ناموں کی یاد سے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ مسکرا مسکرا کر بیوی سے سرگوشی کرنے لگے، پھر منو کی نسبت طے کردی ہے، اس سے کہہ دو کل اس کا عقد ہوگا۔

بے چاری جولاہن کو چون و چرا اس کی مجال نہ تھی۔ وہ بہت اچھا کہہ کے ہونے والی بہو پر ایک نظر ڈالنے چلی گئی، وہ بھی رشتے سے بالکل بے خبر تھی، اس لیے بہت کھل کے باتیں ہوئیں جو لاہن اس کے طور طریقے سے زیادہ مطمئن تو نہ ہوئی، لیکن جانتی تھی، میر صاحب کی خوشنودی اس میں ہے اختلاف کا یارا نہیں، رہنے کا ٹھکانا انہی کا دیا ہے، چنو کی نوکری انہی کی عطا کردہ ہے، اور منو کی

جوت میں کھیت بھی انہی کے ہیں' پھر لالچ بھی تھا۔ اپنی خوشی سے شادی کریں گے تو سارا خرچ بھی خود ہی اٹھائیں گے غرض گھر آئی اور اس نے رات کو میر صاحب کا فیصلہ سنا دیا۔ وہ اسے درزی ہی کے گھر بھاوج کی حیثیت سے دیکھ کر پسند کرتا۔ جلدی سے راضی ہو گیا۔

دوسرے دن صاحب بلائے گئے' متو کو نئی دھوتی نیا کُرتا میر صاحب نے پہنوایا دلہن کو شاہانہ چند چاندی کے زیورات ان کی بیوی نے پہنائے پھر میر صاحب اور ان کی طرف سے رونمائی کے نام سے دس روپے متو کی ماں کو دے کر دلہن کو اس کے ہاں رخصت کر دیا دن بیتتے گئے' مہینہ بیتا' ایک سال ہونے کو آیا مگر متو اور اُس کی دلہن کی کوئی شکایت سننے میں نہ آئی میر صاحب کو اطمینان سا ہو چلا کہ نسخہ کارگر ہو چلا ہے۔ دفعتاً ایک دن بی جولاہن روتی بسورتی پہنچیں' معلوم ہوا متو نے مارا ہے پوچھ گچھ سے پتا چلا کہ چھ مہینے سے اسے نشے کا شوق ہے اور جس طرح وہ نشہ بیوی پر اتارتا ہے۔ اسی طرح غصہ ماں پر۔ کل رات میں تو اس نے مارا ہی نہیں بلکہ اسے ایک کوٹھری میں بے آب و دانہ بند رکھا' اب چھٹی ہے تو فریاد لے کر آئی ہے۔ میر صاحب کے اس سوال پر کہ پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ فوری تدارک سے شاید بری عادت نہ پڑنے پاتی۔ جولاہن سوائے مامتا کے اور کیا جواب دے سکتی تھی انہوں نے حکم دے دیا آج سے یہیں رہو گھر جانے کی ضرورت نہیں۔

مگر میر صاحب کو متو کی فکر ہو گئی۔ خون گندی نالی میں بہہ کر تہہ تو بدل جاتا ہے ورنہ پھٹ کر سپید ہو جاتا ہے' اس لیے اسے بلا بھیجا اور حد سے زیادہ خفا ہوئے اور یہاں تک کہہ دیا کہ اگر پھر سنا کہ تو نے تاڑی پی۔ تو درخت سے بندھوا کر اتنا پٹواؤں گا کہ چمڑا ادھڑ جائے گا۔ ساتھ ہی پاسی کے پاس مخصوص کارندہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ اب اگر متو کو ایک قطرہ بھی پینے کو ملا تو تاڑی خانہ پھنکوا دوں گا۔ غرض متو کی پورے طور پر بندش کر دی گئی اور تاڑی بند ہو گئی۔ نشے کا انجکشن ممنوع قرار دے دیا گیا۔

مگر جونک اپنا کام کرتی رہی۔ اور تاڑی بند ہونے کے چھ ماہ بعد وہ آنکھیں مانگنے لگا۔ بالکل زرد سوکھا ہوا آم بن گیا اور کھانسی بخار کا شکار ہوا۔ جب میر صاحب کو خبر ملی کہ عیادت کے بہانے یاروں کی نشستیں ہونے لگیں اور متو کی بہو نے نینوں کے بان چلانا شروع کر دیئے تو انہوں نے بی جولاہن کو کچھ روپے دے کر گھر بھیجا اور بیٹے کے علاج اور بہو کی نگرانی کی تاکید کی۔

لیکن یہ نگرانی وہاں اسی طرح ناگوار گزری جس طرح چوروں کو پولیس کی نگرانی کھٹکتی ہے۔ دو چار ہی دن گزارنے کے بعد زبان کی چھری تیز ہونے لگی۔ ساس بھلا کس سے کم تھیں۔ انہوں نے کلہ بہ کلہ جواب دینا شروع کر دیا۔ ایک دن تو نوبت ہاتھاپائی تک پہنچی جوانی اور بڑھاپے کا مقابلہ کیا تھا۔ بہو ساس کے سینے پر سوار ہو گئی۔ متو پلنگ سے جھپٹ کر اٹھا۔ اور لڑکھڑاتا ہوا ماں کو بچانے پہنچا۔ بیوی نے سینے پر وہ لات ماری کہ وہ ہائے کر کے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دونوں لڑنا بھول کر اس کی تیمارداری میں مشغول رہیں۔ لیکن بلغم کے ساتھ تھوڑا سا خون بھی آنے لگا اور وہ ایک ہفتہ بعد

گھر سے اٹھ کر قبر میں چلا گیا۔

اب رونا دھونا شروع ہوا' بین ہونے لگے اور ساس بہو میں اسی پر مقابلہ اٹھتا کہ دیکھیں سوگ کون زیادہ مناتا ہے پانچ روز تو اس طوفان میں وہ طغیانی رہی کہ میر صاحب کو خود آ کر سمجھانا پڑا لیکن آہستہ آہستہ سیلابِ غم گھٹنا شروع ہوا اور ساس بہو کو ایک دوسرے سے چھٹکارا پانے اور رشتہ قرابت ٹوٹ جانے کی غیر شعوری طور پر خوشی ہونے لگی کہ دفعتاً چنو کی بیوی قبل از وقت مرا ہوا بچہ جن کر دیور کے پاس چلی گئی' بی جولاہن کی چار چھوٹے چھوٹے پوتے پوتیوں کو سنبھالنا پڑا اور منّو کی بیوی کو عدّت کے احکام بھول جانے کے مواقع ملنے لگے۔ ایسے ہی ایک موقع سے چنو غم بھلانے اور جی بہلانے دیورانی کے پاس آ بیٹھا' خاطر تواضع ہوئی اور باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا' درِدل بیان ہوئے تنہائیوں کا ذکر چھڑا اور اس کے دور کرنے کے ذرائع پر غور ہوا بالآخر ایک شب امتحان قرار پائی۔ جب اس کی صبح سرخروئی سے ہوئی تو چنو نے ماں سے اصرار کیا کہ اس رشتے کو عقد کے ذریعے مستحکم بنا دے۔

وہ بیٹے کو لے کر مولوی صاحب کے پاس پہنچی وہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے شروع کی کتابیں اب تک نہ بھولے تھے انہوں نے امتحان اور اس کے نتائج سے واقف ہوتے ہی کان پر ہاتھ رکھا اور نکاح کے ممنوع ہونے کا فتویٰ فوراً صادر فرما دیا۔ بڑی بی دیر تک ایک وکیل کی طرح بحثتی رہی۔ پر جب مولوی صاحب اپنے فیصلے سے نہ ٹلے تو جل کر بیٹے سے بولیں' چل اے گھر چل۔ مانگ میں میرے سامنے سیندور بھر دینا وہ اب تیری بیوی ہے میں خوش میرا خدا خوش' چنو نے ماں کا کہنا کیا مانگ میں سیندور کی چٹکی ڈال دیا۔ اور اپنے چاروں بچوں سمیت اس گھر میں منتقل ہو آیا۔

ایک مہینہ بیتا' دو بیتے' تین مہینے بیتے مگر چوتھے مہینے چنو کی کمر میں چوک آ گئی' اکڑنا' برسنا' تن کے چلنا چھوٹ گیا۔ وہ اب ذرا جھک کے چلنے لگا۔ محسن میر صاحبان میں سے ایک صاحب طبیب تھے' ان کو دکھایا انہوں نے معجونیں اور گولیاں کھلانا شروع کیں۔ دواؤں کے زور پر کچھ دن اور چلا بدقسمتی سے حکیم صاحب ایک ریاست میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ بس چنو کی کمر کچی لکڑی کی طرح بوجھ پڑنے سے جھک گئی۔ ساتھیوں نے افیون کی صلاح دی۔ شروع میں تو کافی سرور آیا مگر افیون کی خشکی نے دبوچا اور بی چنیا بیگم مانگتی ہیں۔ دودھ' مکھن' گھی' ملائی اور یہ چیزیں چار روپے کی کمائی میں کہاں نصیب وہ لگا گھسے نکال کے ہاتھ پھیلانے اور پلیٹیں کھانے مگر اس پر بھی جو کچھ ملتا بھاویں نہ سماتا اور افیون کی لت پڑ چکی تھی۔ وہ چھوٹتی نہیں اس نے آہستہ آہستہ دل و جگر کو چھلنی کیا اور چنو خان کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے اور سوکھی کھانسی آنے لگی۔

ایک دن جنوری کے مہینے میں جب بوندا باندی ہو رہی تھی' اولے پڑنے والے تھے' کہ چنو کو اختلاج شروع ہو گیا ڈیوڑھی پر کسی کام کے سلسلہ میں حاضر تھا رلیا برتن چھوڑ چھاڑ گھر کی طرف بھاگا راستے ہی میں کوندا لپکا اور جان پڑا اسی کے سر پر بجلی گری منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ سنبھل کر اٹھا

مگر دل کا یہ حال تھا کہ منہ سے نکلا پڑا تھا۔ بے ساختہ ارے ماں ارے ماں چیختا ہوا دوڑا۔ راستہ سجائی نہ دیتا تھا۔ دم گھٹا جا رہا تھا مگر پاؤں پہیے کی طرح لڑھک رہے تھے گھر کی دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ دوسرا کڑاکا ہوا وہ ٹھوکر کھاتا سنبھلتا پھسلتا لڑکھڑاتا دالان والے پلنگ پر جا کر بکری کے نیچے سے چھوٹے ہوئے کبوتر کی طرح بھد سے گر پڑا اور اسی طرح اس کا ہر عضو پھڑ کنے لگا۔

بیوی ''ارے کیا ہو گیا لوگو'! کہتی ہوئی دوڑی۔ چنو نے بایاں پہلو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا۔

''اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا؟'' اور ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

چنو کی فاتحہ کے تیسرے دن اس کی خوش نہ ہونے والی بیوہ گاؤں کے ایک جوان کسان کے ساتھ کمبھ کا میلہ گھومنے الٰہ آباد چلی گئی۔

❀ ❀ ❀

حیات اللہ انصاری

بھرے بازار میں

کوئی چیز رکھی کے پیٹ پر پھد سے گری۔ رکھی کنمنائی اور آنکھیں کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر ایک زیادہ وزنی چیز آ کر چھاتی پر گری اور ساتھ ہی ایک قہقہہ سنائی دیا۔ اب رکھی کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گلی کے نکڑ پر کلو کو دیکھا جس نے رکھی سے آنکھیں ملاتے ہی ایک فحش فقرہ چپکایا اور سڑک کی بھیڑ میں غائب ہوگیا۔

رکھی نے اپنی چھاتی پر سے ''چیز'' اٹھائی۔ یہ چار کیلوں کا ایک گچھا تھا۔ اس پر نگاہ پڑتے ہی رکھی کھل گئی اور بیتابی سے ایک کیلا چھیل کر منہ میں رکھ لیا اور دو تین بار اِدھر اُدھر منہ مار کر نگل گئی۔ پھر دوسرا کیلا چھیلا' اور آدھا دانت سے کاٹ کر ذرا مزے لے کر کھانے لگی اتنے میں کچھ خیال آیا جلدی سے رکھی نے اسی طرح لیٹے لیٹے اِدھر اُدھر ٹٹولا تو ایک نارنگی ہاتھ لگی۔

نارنگی کو دیکھتے ہی اس کے دل کی کلی کھل گئی۔ دس بارہ روز بیمار رہنے کے بعد ایسا خراب منہ کا مزا ہوجاتا ہے! ایسے موقع پر نارنگی کا مل جانا رکھی سوچنے لگی ایسی کھٹی کھٹی نارنگی نمک مرچ کے ساتھ کھائی جاتی تو؟ مگر نمک مرچ اس وقت کہاں؟ مجبوراً رکھی نمک مرچ کو یاد کر کے ایک پھانک منہ میں رکھنے لگی اور اس کو خوب چٹخارے لے کر کھانے لگی۔

گھڑگھڑ کرتی سامنے سڑک پر ٹرام نکلی۔ اس میں ایک صاف ستھری لڑکی' سیاہ کنارے کی اجلی ساڑھی باندھے بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہ ادھر پڑ گئی تو اس نے دیکھا کہ بغل کی پتلی سی گلی میں کچھ دوری پر ایک دوکان کے آگے ایک تختہ سا لٹکا ہوا ہے جو زمین سے بمشکل دو فٹ اونچا ہوگا۔ اس کے نیچے ایک میلی گندی' زرد عورت بڑے آرام سے لیٹی نارنگی کی پھانکیں کھا رہی ہے۔ چہرے پر ایسا اطمینان ہے گویا وہ آبادی کے کنارے کسی پرسکون مکان کے ڈرائنگ روم میں صوفہ پر اطمینان سے لیٹی ہو۔ لڑکی جب تک رکھی کو دیکھ سکی' دیکھتی رہی۔ رکھی نے بھی اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی اس کی ساڑھی اور صاف ستھری گردن کو ذرا غور سے دیکھا اور پھر بلاارادہ اپنی گردن مل مل کر میل کی بتیاں چھڑانے لگی۔

رکھی اٹھ کر بیٹھ گئی اور انگڑائی کے لیے دونوں ہاتھ اوپر اٹھانا چاہے مگر اوپر اتنی جگہ ہی نہ تھی۔ رکھی نے ذرا بے چین ہوکر بدن کو ایک بل دیا۔ اور جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ داہنی طرف

پھینک دیئے۔ پھر پیٹھ میں ایک بل دے کر انگڑائی لی۔ مگر فوراً ہی ایک سسکی بھر کر سیدھی ہوگئی اور گھبرا کر پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ دیکھتی کیا ہے کہ اس کے سر کے کچھ بال چیچک کے سوکھے دانوں میں چپک گئے ہیں۔ پھر اس نے سر پر ہاتھ پھیرا تو سر کو چکٹا ہوا پایا۔

میل تھا کہ بدن کو کھائے جا رہا تھا۔ رکھی کچھ ایسی گھبرائی کہ بلبلا کر اپنے بل سے باہر نکل آئی، کھڑی ہوئی تھی کہ چکر آ گیا۔ اس نے جلدی سے دوکان کے پٹرے پکڑ لیے، پھر ذرا سنبھل کر پاس والے نل سے پانی پیا اور سوچنے لگی کہ کہاں چل کر نہانا چاہیے۔

جب تندرست تھی تو صاف ساڑھی لے کر دریا پر جاتی، وہاں میلی ساڑھی دھوتی تھی، پھر جی بھر کر نہاتی تھی۔

ادھر بارہ روز تک بیمار رہی۔ اتنے دنوں تک میلی گندی پڑی رہی۔ پہلے بچہ ہوا، اس کا بندوبست کیا ہی تھا کہ چیچک نکلی۔ اس میں آٹھ روز تک پڑی رہی۔ بیماری ایسی تھی کہ کسی کو بتا نہیں سکتی تھی جو کوئی پوچھتا اس سے کہہ دیتی کہ بخار ہے، کونین کھا رہی ہوں غنیمت ہوا کہ چیچک نے چہرے اور ہاتھوں پر قبضہ نہیں چلا۔ ورنہ جہاں پڑی تھی وہاں سے الگ نکالی جاتی اور جو یار آشنا تھے وہ الگ ساتھ چھوڑ دیتے۔

بارہ روز بیمار رہی۔ اچھے لوگ ایسی بری عورت کے قریب کیا بھٹکتے، بڑے لوگوں نے اس کی خبر لی۔ پورن نے دکان کے نیچے پڑا رہنے دیا۔ مہابیر، کلو نے دودھ لا کر کھانے پینے کی خبر لی۔ خیر، بُرے دن کٹ گئے۔ دو چار روز میں پھر گالوں پر رونق آ جائے گی اور پھر وہی پارک کی تفریحیں ہوں گی اور نگاہوں کو رجھانا۔

کہاں چل کر نہانا چاہیے؟ دریا اتنی دور ہے کہ اس کا خیال ہی فضول ہے۔ مہابیر اور کلو مزدوری پر گئے ہوں گے اور ان کے گھروں میں تالے پڑے ہوں گے۔ وہ لوگ ہوتے بھی تو ان کے یہاں نہانے کی جگہ کہاں؟ وہ اب نل پر نہاتے ہیں۔ چلو نل گھٹ چلیں۔

کارپوریشن کی طرف سے ایک بڑا سا غسل خانہ بنا تھا۔ رکھی اس کو نل گھٹ کہا کرتی تھی۔ اور کبھی کبھی جب دیر ہو جاتی تو دریا کے بجائے نہانے دھونے وہیں چلی جاتی تھی۔ اس وقت اسی طرف چلی۔ راستہ میں یہ سوچی جاتی تھی کہ نہا کر پہنوں گی کیا ایک ساڑھی پہنے ہوئے ہوں اور اس کے جوڑ کی جو ساڑھی تھی وہ بچے کے ساتھ گئی۔

رکھی ڈگمگا ڈگمگا کر چل رہی تھی۔ اگر نہانے کی تمنا اس کے سر پر ایسی مسلط نہ ہوتی تو شاید اس کو اٹھتے بھی برا لگتا۔ لیکن اس وقت تو یہ خیال دل میں گھسا ہوا تھا کہ اگر میں نہا ڈالوں تو میل، بیماری، کمزوری اور بدن کی بے رونقی سب کچھ دور ہو جائے۔ اور آج ہی پارک کے قابل ہو جاؤں۔ اس خیال نے اس کو ایسی ہمت دی کہ پاؤں کانپ رہے تھے مگر وہ آگے بڑھی چلی جاتی تھی۔ تھوڑی

دور چلی تھی کہ بدن پر ایک دم سے چونٹیاں سی رینگتی معلوم ہوئیں۔ یہ کھجلی۔۔۔ وہ کھجلی' سارے بدن میں کھجلی ہی کھجلی۔ توبہ' یہ سب میل ہے اور کچھ بھی نہیں۔ اگر جلدی میل دور نہ ہوا تو مورچے کی طرح مرے بدن کی رنگ و روہت کھا جائے گا۔

رکھی کا' نل گھٹ' سامنے آ گیا۔ کچھ لوگ کپڑے دھو رہے تھے۔ پانی کی بوندیں' دیوار کے اوپر اڑ اڑ کر دھوپ میں چمک رہی تھیں موتی کی ایسی بوندیں! یہ سب میل صاف کر دیں گی۔ کہیں صابن بھی مل جاتا!

رکھی اندر گھسی' ایک موٹی عورت اوکڑوں بیٹھی آگے کی طرف جھکی کپڑے زمین پر پٹک رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی پاس بیٹھی اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے صابن کا پھین اکٹھا کر کے ٹیلا بنا رہی تھی۔ مگر ادھر یہ ٹیلا بنا کر اونچا کرتی...... اور ادھر پانی کی دو ایک بوندیں گر کر اس کی ساری محنت اکارت کر دیتیں۔ یہ پھر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی۔ دوسرے کونے میں دو عورتیں بدن مل رہی تھیں ایک طرف ایک لڑکی نہا کر صاف کپڑے پہن رہی تھی۔ رکھی نے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ سب نے فوراً اس کی طرف دیکھا اور سب نے بہت برا منہ بنایا۔ رکھی کی ہمت ان کی نگاہوں کو دیکھ کر کمزور پڑ گئی۔ یہ نفرت کیوں؟ کیا یہ جانتی ہیں کہ میں کون ہوں؟ کیسے جاننے لگیں؟ کوئی میرے ماتھے پر میرا پیشہ لکھا ہوا ہے؟''

رکھی (موٹی عورت سے) ''بہن ذرا میں نہا لوں؟''

موٹی عورت نے پلٹ کر اس کی طرف بڑی تیز نظروں سے دیکھا اور پھر ہاتھ جھٹک کر بولی:

''بھاگ بھاگ' ملچھ' اس کے پاس سے بو کیسی آ رہی ہے؟''

سب عورتیں ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔ ایک دم سے بول اٹھیں۔

''رے تیرے پاس کیسی بو آ رہی ہے۔ الگ الگ۔''

''ادھر سے جا''

''دریا پر جا۔ وہاں جا کر نہا۔''

''جاتی ہے کہ نکالوں''

''ہٹ یہاں سے ہٹ۔ اس کو دق ہے اس کی صورت تو دیکھو۔''

موٹی عورت: ''بنا پولیس کے نہیں جائے گی''

رکھی ان کی چاؤں چاؤں سے گھبرا گئی۔ ایک کو جواب دینے لگتی کہ دوسری بھڑ جاتی۔ آخر کو رکھی کو غصہ آ گیا۔ اس کے جی میں آ رہا تھا کہ ان سب کا منہ نوچ لوں۔ بال خوب نوچ لوں اور بن پڑے تو کاٹ کھاؤں! اتنے میں موٹی عورت اٹھی اور اس نے اپنی بچی کا بنایا ہوا صابن کے پھین کا ٹیلا ہاتھ میں لے کر رکھی کے منہ پر کھینچ مارا۔ رکھی کی آنکھوں میں مرچیں سی لگنے لگیں۔ اس نے گھبرا کر

ساڑھی کا پلو آنکھوں میں بھر لیا اور بڑی بے بسی سے چلانے لگی۔ دونوں عورتیں اور لڑکی قہقہہ مار کر ہنسیں۔

رکھی اچھی ہوتی تو ایسی آسانی سے تو نہ بھاگتی۔ بلکہ موٹی عورت کو تو اس کے کیے کی سزا دے ہی دیتی مگر اب اسے بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ گھبرائی ہوئی باہر نکل آئی۔ آنکھوں میں ایسی تکلیف تھی کہ میل کچیل بنانا دھونا سب بھول کر باہر بھاگ آئی۔ نل ول کو بڑی مشکلوں سے ایک آنکھ کھول کر ادھر ادھر دیکھا تو دو سو گز کے فاصلہ پر ایک نل تھا۔ رکھی دوڑ کر ادھر گئی۔ پانی سے آنکھوں کو خوب دھویا جب ذرا آرام ملا تو کچھ سوچ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ایک دوکان پر ایک آدمی پنکھا منہ پر رکھے سو رہا تھا۔ اس کے پاس ایک نوجوان سفید کرتا پہنے ہوئے بیٹھا نیند بھری آنکھوں سے رکھی کو تک رہا تھا۔ کچھ دور ایک کپڑے والے کی دوکان پر ایک میاں صاحب دھوپ سے بچنے کو رومال منہ پر ڈالے کھڑے بھاؤ تاؤ کر رہے تھے۔ ان کے قریب رکشہ والے پسینے اور میل میں سنے کھڑے تھے۔ رکھی نے دکان والے نوجوان کو ایک بار دیکھا اور کچھ ارادہ کر کے اپنی ساڑھی سمیٹی۔ مگر پھر جھجکی۔ آخر جی کڑا کر کے ایک بار نل کے نیچے بیٹھ ہی گئی۔ اور ایک ہاتھ سے کھٹکا دبایا۔ کمزوری کی وجہ سے کھٹکا اچھی طرح نہیں دبایا۔ مگر پھر بھی تھوڑا تھوڑا پانی اس کے سر اور پیٹھ پر گرنے لگا۔

نوجوان چلایا۔ ''ہائیں ہائیں — ہائیں ہائیں۔''

نوجوان کا باپ (......کر چلایا) ''بازار میں نہائے گی۔ اری او بے حیا کیا کرتی ہے۔''

اس سڑک پر شریف دکاندار تھے۔ سب بے تحاشا چلانے لگے۔ ''مستانی ہے''۔ کپڑے کی دکان کے میاں صاحب بھاؤ تاؤ چھوڑ چھاڑ ادھر دوڑ پڑے۔ پاس آ کر انہوں نے رکھی کی انگلیوں پر چھڑی ماری۔ رکھی کے ہاتھ سے نل کا کھٹکا چھوٹ گیا۔ نل بند ہو گیا۔

اب انہوں نے رکھی کی پیٹھ میں چھڑی چبھوئی اور چلائے۔

''چل ہٹ سڑک پر سے۔ بڑی آئی ہے نہانے۔''

نل کے گرد میلہ لگ گیا۔

چھڑی کی نوک جیسے گڑی، رکھی نے تکلیف سے منہ کھول دیا آنکھیں سکوڑ لیں اور منہ سے ایک چھوٹی سی چیخ نکل گئی پھر فوراً ہی ذانت بھینچ کر دونوں ہاتھوں سے نل پکڑ لیا اور جم کر وہیں بیٹھ گئی۔

بڑے میاں۔ ''ارے ہٹ ہٹ، ارے ہٹی نہیں۔''

''کیا کرنا چاہتی ہے۔''

''کیا یہاں نہائے گی؟''

''کلکتہ میں کتنی بے حیائی ہے رام رام۔''

''اور ساری تو دیکھو کیسی مہین ہے۔''

''شکل چڑیلوں کی مزاج پریوں کا۔ آ ئیں ہیں نہانے۔''

بڑے میاں نے ہمت کر کے ایک بار زور سے چھڑی گڑ وائی اور پھر ہار کر ہاتھ ڈھیلا کر لیا۔

رکھی نے پھر نل کا کھٹکا دبایا۔ یہ دیکھ کر رکشا والے جو مجمع چیر کر اندر آ گئے تھے۔ بولے:

''کیا ہے کیا— نہا بھی لینے دیجئے۔''

''نہا لینے دیجئے بچاری کو۔''

''گرمی سخت ہے۔''

مجمع سے ایک نے آواز کسی۔

''چلو میرے گھر میں نہاؤ۔ ایسا غوطہ دوں......!''

ایک تہمد باندھے کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ایک بار جوش میں آگے بڑھے۔ دیکھنے والے سمجھے کہ دو چار ہاتھ تو اس بے حیا عورت پر جھاڑ دیں گے کہ اتنے میں پولیس والا نہ معلوم کدھر سے اندر گھس آیا اور اس نے رکھی کا ہاتھ پکڑ کر ایک جھٹکے میں اس کو اپنی جگہ سے اٹھا کر مجمع کے باہر کر دیا اور پھر فاتحانہ انداز میں بولا۔

''نہیں ہٹتی تھی— ایک عورت کو نہیں بھگا سکتے۔''

مجمع میں تالیاں سیٹیاں بجنے لگیں۔ قہقہے اڑے اور آوازے کسے گئے۔ رکھی ہارے جنرل کی طرح سر جھکائے پیٹھ سہلاتی آگے بڑھی۔

اس نے پلٹ کر سپاہی کو دیکھا اور پھر تہمد والے شخص کو دیکھا۔ ان حضرت کو تو اس نے پہچان لیا۔ ایک دن ان سے بھی دوستی رہ چکی تھی۔ مگر رکھی کو ان کا نام یاد نہیں تھا۔ ورنہ اس وقت پکار کر ذلیل کر دیتی۔

رکھی کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ لوگ کیسے ظالم ہوتے ہیں۔ ایسی ہی غیرت آتی تھی تو آنکھیں بند کر لیتے۔ مجھے تو نہا لینے دیتے اور غیرت کیسی؟ میں ساری تو باندھے ہوئے تھی۔ یہی غیرت مند لوگ جب زنانے گھاٹ پر عورتیں نہاتی ہوں آ کر پرا باندھ کر بیٹھتے ہیں اور خوب گھورتے ہیں۔ اس وقت غیرت نہیں آتی!

رکھی کو اپنا بچپن یاد آنے لگا۔ اس کی ماں دوپہر کو اس کے لیے گڑیاں بناتی تھی اور شام کو نہلا دھلا کر صاف کپڑے پہناتی تھی۔ اگر کپڑے کھیل کود میں میلے ہو جاتے تو بہت بگڑتی تھی۔ پھر رکھی کو اپنا بچہ یاد آیا جو بارہ دن ہوئے دو بجے رات کو پیدا ہوا تھا۔ لڑکا تھا بچارے نے ایک ہی بار 'کہ ہاؤں' کیا تھا کہ رکھی نے اس کا منہ، اس کی ننھی گردن اور اس کا سارا بدن اپنی ساری میں لپیٹ دیا۔ اور پھر وہ پوٹلی ایک گلی میں لے جا کر نالے کا منہ کھول کر اندر ڈال دی۔ اس کام میں سوہنی نے بھی ہاتھ بٹایا اور کیوں نہ بٹاتی؟ اس کو بھی کسی نہ کسی دن رکھی کی مدد کی ضرورت ہو گی۔ یوں ہی لوگ ایک

دوسرے کے کام آتے ہیں — ہا— بچ گیا اور ساری کی ساری۔ اس وقت تو نہا کر پہننے کے کام آتی۔ سر اور پیٹھ کے بھیگ جانے سے نہانے کا شوق اور تیز ہو گیا۔ بلکہ اب تو رکھی کو ایک طرح کی ضد آ گئی کہ کچھ ہو نہا کر رہیں گے۔ چلو دریا چلو۔ لیکن وہ دور ہے۔ دور ہی سہی کیا ہو گا کیا؟ راستہ میں تھک کر گر پڑیں گے؟ مر جائیں گے اور اچھا ہے ایسی زندگی سے نجات ملے گی۔

ایک چائے کی دکان پر کچھ بے فکرے بیٹھے قہقہے اڑا رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر رکھی سوچنے لگی کہ کاش ایسا ہوتا کہ یہ لوگ پکارتے!

''آہاہا' کون جا رہا ہے؟''

''ایک نظر ادھر بھی۔''

میں جواب تو نہ دیتی مگر اپنی لگاوٹ والی نگاہ مار دیتی اور پھر اٹھلاتی' قدم پھینکتی آگے بڑھتی پھر کوئی کہتا۔

''ارے ذرا ادھر تو آ جا۔ ارے بات تو سن۔''

''سن تو سہی کوئی تجھے کھائے گا کیا؟''

میں پلٹ پڑتی تو کہتی۔

''کیا غل مچا رکھا ہے۔ میں جا رہی ہوں دریا' نہانے' کیسی گرمی ہے۔ میل' ہے کہ بدن کو کھائے جا رہا ہے۔''

چائے والا کہتا

''آؤ تو یہاں۔ یہاں نہا لو۔''

میں کہتی۔

''باتیں نہ بناؤ۔''

''پھر خود ہی گنگنانے لگتی۔''

''ہٹو جاؤ' باتیں نہ بناؤ۔''

چائے والا: ''تمہاری جان کی قسم۔ ادھر دیکھو مکان کے اندر حوض بنا ہے۔''

چائے والا مجھ کو خوشامد در آمد کر کے اندر لے جاتا تو وہاں سچ مچ ایک حوض ہوتا پھر چائے والا مجھ کو ایک ساری لا کر دیتا۔ میں چائے والے سے باہر جانے کو کہتی مگر وہ نہ مانتا اور ضد کرتا کہ میں تو اندر ہی ٹھہروں گا۔ آخر بڑی خوشامد کے بعد باہر جاتا اور میں خوب نہاتی' پھر بالوں میں کنگھی کرتی' ساری پہنتی۔

رکھی سوچنے لگی کہ اگر یہ خواب پورا ہو جائے تو کیا کہنا۔ بدن ہلکا ہلکا ہو جائے گویا دوبارہ زندگی مل جائے۔

سورج ڈوبنے پر تھا۔ اور پارک کی چہل پہل شباب پر تھی۔ تال کے اس پار چھوٹے چھوٹے بچے تیتریوں کی طرح ادھر ادھر اڑتے اڑتے پھر رہے تھے اور غل مچا رہے تھے۔ ایک بچہ ایک کتے کی رسی پکڑے ٹہلا رہا تھا اور دوسرا کتے کی پیٹھ پر ببو کو سوار کر رہا تھا۔ ان کی آیائیں گھاس پر ٹانگیں پھیلائے آدھی لیٹی اور آدھی بیٹھی اپنی اپنی بک بک میں کھوئی ہوئی تھیں۔ وہاں سے دور دو تین نوجوان مرد اور عورتیں نمائشی کپڑوں میں لپٹے ایک دوسرے کو اپنے فقرے اور قہقہے سنا رہے تھے۔ دوسری طرف دس پندرہ سفید پوشوں کا مجمع تھا۔ جس میں سے چار پانچ تال میں وضو کر رہے تھے۔ ایک مولوی صاحب تال میں پاس اپنے بارہ برس کے لڑکے کو لیے دوزانو بیٹھے نماز کے وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک کانسٹیبل اکیلا وقت گزاری کے لیے ٹہل رہا تھا اس مجمع میں رکھی آ نکلی۔ اس نے اپنی منزل طے کر لی تھی۔ دریا قریب تھا۔ بندرگاہ پر کھڑے جہاز دکھائی دے رہے تھے۔ جہاز پر کام کرنے والی مشینوں کی چھپ چھپ اور قلیوں کی چیخ و پکار صاف سنائی دے رہی تھی۔

دریا قریب تھا لیکن پارک کی اس چہل پہل اور اس فراغت سے بھرپور سماں نے رکھی کو ایسا پکڑا کہ یہ تھکی ہاری تالاب کے کنارے بیٹھ گئی اور اپنے دونوں پاؤں گھٹنوں گھٹنوں پانی میں پھیلا دیئے نیلے تال کے اندر پھیلی ہوئی سبز بیل کے بیچ بیچ شام کے سرخ بادلوں کا عکس تھا۔ تال ایسا دلکش تھا کہ بس جی چاہتا تھا کہ دیکھے ہی جاؤ، رکھی ذرا دیر تو کھوئی سی بیٹھی رہی۔ پھر کچھ سوچ کر اس نے جلدی جلدی ادھر ادھر دیکھا اور چھم سے پانی میں اتر گئی۔

کانسٹیبل یہ دیکھ کر چلاتا ہوا دوڑا۔ نمازیوں نے غل مچایا۔ مولوی صاحب نے لاحول پڑھی اور آیائیں چونک کر کھڑی ہو گئیں۔ سپاہی گھبرایا ہوا تال کے کنارے دوڑ رہا تھا اور چلا رہا تھا۔ ''اری چالان ہو جائے گا۔ جیل میں ڈال کر سڑا ڈالی جائے گی۔''

وضو کرنے والوں کو بھی غصہ آ گیا۔ وہ کانسٹیبل کو ڈانٹنے لگے کہ ''اسے نکال اسے نکال''۔ کانسٹیبل دیر سے یہی ارادہ کر رہا تھا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ نکالوں تو کیسے نکالوں۔

رکھی اپنے اوپر یہ نرغہ دیکھ کر گھٹنوں گھٹنوں پانی میں سینہ تان کر کھڑی ہو گئی۔ جسم کے سارے اتار چڑھاؤ ساری پر اتر آئے۔ بیماری نے چہرہ ضرور چوس لیا تھا مگر بدن کا کس بل بہت کچھ باقی تھا۔ خوش پوش نوجوانوں کو یہ دیکھ کر ساتھ کی لیڈیوں کے سامنے شرم آنے لگی۔ وہ لوگ ادھر پیٹھ پھیر کر کھڑے ہو گئے۔

رکھی کے اس ناگہانی حملے سے سب حملہ آور ٹھٹک گئے۔ رکھی کے ہونٹوں پر دن میں پہلی بار کامیابی ناچنے لگی۔ اب اس نے دوسرا حملہ کیا۔ وہ بھیڑ کو بھول کر اطمینان سے ساری ہٹا کر بدن ملنے لگی۔ آیاؤں نے بچوں کو کھینچا۔ مولوی صاحب نے اپنے لڑکے کو جو ٹکٹکی باندھے ادھر تک رہا تھا۔ چٹاخ سے ایک تھپڑ رسید کیا۔ وہ بھوں بھوں رونے لگا۔ وضو کرنے لگا۔ وضو کرنے والوں نے گردنیں

جھکا لیں اور وضو پھر سے شروع کیا۔ پولیس والا اس عورت کو پاگل سمجھ کر خاموشی سے اس کی حرکتیں دیکھنے لگا۔ رکھی حملہ آواروں کی پسپائی دیکھ کر بہت خوش ہوئی مگر اس کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں یہ کانسٹیبل اپنے اور ساتھیوں کو بلا کر مجھے پکڑوا نہ دے۔ اس لیے وہ جلدی جلدی نہائی اور فتح یاب ہو کر نکل آئی۔ بدن پر ساری چپکی ہوئی تھی اور رکھی اٹھلاتی اپنا پسندیدہ گیت ''راجدھانی رے'' گاتی ایک طرف کو چل کھڑی ہوئی۔ پولیس والا سوچتا ہی رہا کہ اس پاگل کو پکڑوں یا نہ پکڑوں۔ مرد گھوم گھوم کر دیکھ رہے تھے کہ کہیں یہ پگلی ایسا تو نہیں کرتی کہ اپنی ساری نچوڑ کر سوکھنے کو پھیلا دے۔

❀ ❀ ❀

کرشن چندر

پورے چاند کی رات

اپریل کا مہینہ تھا۔ بادام کی ڈالیاں پھولوں سے لد گئی تھیں۔ اور ہوا میں برفیلی خنکی کے باوجود بہار کی لطافت آ گئی تھی۔ بلند و بالا تنگوں کے نیچے مخملیں دوب پر کہیں کہیں برف کے ٹکڑے سپید پھولوں کی طرح کھلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ اگلے ماہ تک یہ سپید پھول اسی دوب میں جذب ہو جائیں گے، اور دُوب کا رنگ گہرا سبز ہو جائے گا۔ اور بادام کی شاخوں پر ہرے ہرے بادام پکھراج کے نگینوں کی طرح جھلملائیں گے اور نیلگوں پہاڑوں کے چہروں سے کہرا دور ہوتا جائے گا۔ اور اس جھیل کے پل کے پار پگڈنڈی کی خاک ملائم بھیڑوں کی جانی پہچانی باآ آ سے جھنجھنا اٹھے گی۔ اور پھر ان بلند و بالا تنگوں کے نیچے چرواہے بھیڑوں کے جسموں سے سردیوں کی پلی ہوئی موٹی موٹی گف اون گرمیوں میں کترتے جائیں گے اور گیت گاتے جائیں گے۔

لیکن ابھی اپریل کا مہینہ تھا۔ ابھی تنگوں پر پتیاں نہ پھوٹی تھیں۔ ابھی پہاڑوں پر برف کا کہرا تھا۔ ابھی پگڈنڈی کا سینہ بھیڑوں کی آواز سے گونجا نہ تھا۔ ابھی سمل کی جھیل پر کنول کے چراغ روشن نہ ہوئے تھے۔ جھیل کا گہرا سبز پانی اپنے سینے کے اندر ان لاکھوں روپوں کو چھپائے بیٹھا تھا۔ جو بہار کی آمد پر یکا یک اس کی سطح پر ایک معصوم اور بے لوث ہنسی کی طرح کھل جائیں گے۔ پل کے کنارے کنارے بادام کے پیڑوں کی شاخوں پر شگوفے چمکنے لگے تھے۔ اپریل میں زمستان کی آخری شب میں جب بادام کے پھول جاگتے ہیں اور بہار کے نقیب بن کر جھیل کے پانی میں اپنی کشتیاں تیراتے ہیں۔ پھولوں کے ننھے ننھے شکارے سطح آب پر رقصاں ولرزاں بہار کی آمد کے منتظر ہیں۔

پل کے جنگل کا سہارا لے کر میں ایک عرصہ سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ سہ پہر ختم ہو گئی۔ شام آ گئی جھیل ولر کو جانے والے ہاؤس بوٹ پل کر سنگلاخی محرابوں کے بیچ میں سے گزر گئے۔ اور اب وہ افق کی لکیر پر کاغذ کی ناؤ کی طرح کمزور اور بے بس نظر آ رہے تھے۔ شام کا قرمزی رنگ آسمان کے اس کنارے سے اس کنارے تک پھیلتا گیا۔ اور قرمزی سے سرمئی اور سرمئی سے سیاہ ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ بادام کے پیڑوں کی قطار کی اوٹ میں پگڈنڈی بھی سو گئی اور پھر رات کے سناٹے میں پہلا تارہ کسی مسافر کے گیت کی طرح چمک اٹھا۔ ہوا کی خنکی تیز تر ہوتی گئی اور نتھنے اس کے برفیلے لمس

سے سن ہو گئے۔

اور پھر چاند نکل آیا۔

اور پھر وہ آ گئی۔

تیز قدموں سے چلتی ہوئی' بلکہ پگڈنڈی کے ڈھلان پر دوڑتی ہوئی۔ وہ میرے قریب آ کے رک گئی اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ہائے!''

اس کی سانس تیزی سے چل رہی تھی' پھر رک جاتی' پھر تیزی سے چلنے لگتی۔ اس نے میرے شانے کو اپنی انگلیوں سے چھوا اور پھر اپنا سر وہاں رکھ دیا۔ اور اس کے گہرے سیاہ بالوں کا پریشان گھنا جنگل دور تک میری روح کے اندر پھیلتا چلا گیا اور میں نے اس سے کہا:

''سہ پہر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔''

اس نے ہنس کر کہا۔ ''اب رات ہو گئی ہے' بڑی اچھی رات ہے یہ''۔ اس نے اپنا کمزور ننھا چھوٹا سا ہاتھ میرے دوسرے شانے پر رکھ دیا اور جیسے بادام کے پھولوں سے بھری شاخ جھک کر میرے کندھے پر سو گئی ہو۔

دیر تک وہ خاموش رہی۔ دیر تک میں خاموش رہا۔ پھر وہ آپ ہی آپ ہنسی بولی۔ ''ابا میرے پگڈنڈی کے موڑ تک میرے ساتھ آئے تھے' کیونکہ میں نے کہا' مجھے ڈر لگتا ہے۔ آج مجھے اپنی سہیلی رجو کے گھر سونا ہے' سونا نہیں ہے' جاگنا ہے۔ کیونکہ بادام کے پہلے شگوفوں کی خوشی میں ہم سب سہیلیاں رات بھر جاگیں گی اور گیت گائیں گی اور یہی تو سہ پہر سے تیاری کر رہی تھی' ادھر آنے کی۔ لیکن دھان صاف کرنا تھا اور کپڑوں کا یہ جوڑا کل دھویا تھا آج سوکھا نہ تھا۔ اسے آگ پر سکھایا اور اماں جنگل سے لکڑیاں چننے گئی تھیں۔ وہ ابھی آئی نہ تھیں۔ اور جب تک وہ نہ آتیں میں مکئی کے بھٹے اور خشک خوبانیاں اور جر والو تمہارے لیے کیسے لا سکتی ہوں۔ دیکھو یہ سب کچھ لائی ہوں تمہارے لیے۔ ہائے تم تو سچ مچ خفا کھڑے ہو۔ میری طرف دیکھو میں آ گئی ہوں۔ آج پورے چاند کی رات ہے۔ آؤ کنارے لگی ہوئی کشتی کھولیں اور جھیل کی سیر کریں۔''

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا اور میں نے اس کی محبت اور حیرت میں گم پتلیوں کو دیکھا' جن میں اس وقت چاند چمک رہا تھا اور یہ چاند مجھ سے کہہ رہا تھا' جاؤ کشتی کھول کے جھیل کے پانی پر سیر کرو۔ آج بادام کے پہلے شگوفوں کا مسرت بھرا تیوہار ہے۔ آج اس نے تمہارے لیے اپنی سہیلیوں اپنے ابا' اپنی ننھی بہن اپنے بڑے بھائی سب کو فریب میں رکھا ہے' کیونکہ آج پورے چاند کی رات ہے اور بادام کے سپید خنک شگوفے برف کے گالوں کی طرح چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور کشمیر کے گیت اس کی چھاتیوں میں رکے دودھ کی طرح امڈ آئے ہیں۔ اس کی گردن میں تم نے موتیوں کی یہ ست لڑی دیکھی۔ یہ سرخ ست لڑی اس کے گلے میں ڈال دی اور اس سے کہا: ''آج

رات بھر جاگے گی۔ آج کشمیر کی بہار کی پہلی رات ہے۔ آج تیرے گلے سے کشمیر کے گیت یوں کھلیں گے، جیسے چاندنی رات میں زعفران کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ سرخ ست لڑیاں پہن لے۔''

چاند نے یہ سب کچھ اس کی حیران پتلیوں سے جھانک کے دیکھا پھر یکا یک کہیں کسی پیڑ پر ایک بلبل نغمہ سرا ہو اٹھی اور کشتیوں میں چراغ جھلملانے لگے اور تنگوں سے پرے بستی میں گیتوں کی مدہم صدا بلند ہوئی۔ گیت اور بچوں کے قہقہے اور مردوں کی بھاری آوازیں اور ننھے بچوں کے رونے کی مہک، مچھلی اور بھات اور کڑم کے ساگ کا نرم نمکین اور لطیف ذائقہ اور پورے چاند کی رات کا بہار آفرین جوبن۔ میرا غصہ ڈھل گیا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس سے کہا: ''آؤ چلیں جھیل پر۔''

پل گزر گیا، پگڈنڈی گزر گی، بادام کے درختوں کی قطار ختم ہوگئی۔ تلہ گزر گیا، اب ہم جھیل کے کنارے کنارے چل رہے تھے۔ جھاڑیوں میں مینڈک بول رہے تھے۔ مینڈک اور جھینگر اور بینڈے، ان کی بے ہنگم صداؤں کا شور بھی ایک نغمہ بن گیا تھا۔ ایک خوابناک سُغنی اور سوئی ہوئی جھیل کے بیچ میں چاند کی کشتی کھڑی تھی، ساکن چپ چاپ، محبت کے انتظار میں، ہزاروں سال سے اسی طرح کھڑی تھی۔ میری اور اس کی محبت کی منتظر، تمہاری اور تمہارے محبوب کی مسکراہٹ کی منتظر، انسان کے انسان کو چاہنے کی آرزو کی منتظر، یہ پورے چاند کی حسین پاکیزہ رات کسی کنواری کے بے چھوئے جسم کی طرح محبت کے مقدس لمس کی منتظر ہے۔

کشتی خوبانی کے ایک پیڑ سے بندھی تھی، جو بالکل جھیل کے کنارے اگا تھا۔ یہاں پر زمین بہت نرم تھی اور چاندنی پتوں کی اوٹ سے چھنتی ہوئی آ رہی تھی اور مینڈک ہولے ہولے گا رہے تھے اور جھیل کا پانی بار بار کنارے کو چومتا جاتا تھا اور اس کے چومنے کی صدا بار بار ہمارے کانوں میں آ رہی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ، اس کی کمر میں ڈال دیئے اور اسے زور زور سے اپنے سینے سے لگا لیا۔ جھیل کا پانی بار بار کنارے کو چوم رہا تھا۔ پہلے میں نے اس کی آنکھیں چومیں اور جھیل کی سطح پر لاکھوں کنول کھل گئے۔ پھر میں نے اس کے رخسار چومے، اور نرم ہواؤں کے لطیف جھونکے یکا یک بلند ہو کے صدہا گیت گانے لگے۔ پھر میں نے اس کے ہونٹ چومے اور لاکھوں مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں میں دعاؤں کا شور بند ہوا اور زمین کے پھول اور آسمان کے تارے اور ہواؤں میں اڑنے والے بادل سب مل کر ناچنے لگے۔ پھر میں نے اس کو تھوڑی کو چوما اور پھر اس کی گردن کے پیچ وخم کو۔ اور کنول کھلتے کھلتے سمٹتے گئے کلیوں کی طرح۔ اور گیت بلند ہو ہو کے مدہم ہوتے گئے اور ناچ دھیما پڑتا پڑتا رک گیا۔ اب وہی مینڈک کی آواز تھی۔ وہی جھیل کے نرم نرم بوسے اور کوئی چھاتی سے لگا سسکیاں لے رہا تھا۔

میں نے آہستہ سے کشتی کھولی۔ وہ کشتی میں بیٹھ گئی۔ میں نے چپو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کشتی کو کھے کر جھیل کے مرکز میں لے گیا۔ یہاں کشتی آپ ہی آپ کھڑی ہوگئی۔ نہ ادھر بہتی تھی نہ

ادھر۔ میں نے چپو اٹھا کر کشتی میں رکھ لیا۔ اس نے پوٹلی کھولی۔ اس میں سے جروالو نکال کر مجھے دیئے خود بھی کھانے لگی۔

جروالو خشک تھے اور کھٹے میٹھے۔

وہ بولی یہ پچھلی بہار کے ہیں۔

میں جروالو کھاتا رہا اور اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ آہستہ سے بولی۔

''پچھلی بہار میں تم نہ تھے۔''

پچھلی بہار میں' میں نہ تھا اور جروالو کے پیڑ پھولوں سے بھر گئے تھے۔ اور ذرا سی شاخ ہلانے پر پھول ٹوٹ کر سطح زمین پر موتیوں کی طرح بکھر جاتے تھے۔ پچھلی بہار میں' میں نہ تھا اور جروالو کے پیڑ پھلوں سے لدے پھندے تھے۔ سبز سبز جروالو' سخت کھٹے جروالو جو نمک مرچ لگا کر کھائے جاتے تھے اور زبان سی سی کرتی تھی اور ناک بہنے لگتی تھی۔ اور پھر بھی کھٹے جروالو کھائے جاتے تھے۔ پچھلی بہار میں' میں نہ تھا۔ اور یہ سبز سبز جروالو' پک کر پیلے اور سنہرے اور سرخ ہوتے گئے۔ اور ڈال ڈال میں مسرت کے سرخ شگوفے جھوم رہے تھے' اور مسرت بھری آنکھیں' چمکتی ہوئی معصوم آنکھیں انہیں جھومتا ہوا دیکھ کر رقص سا کرنے لگتیں۔ پچھلی بہار میں' میں نہ تھا۔ اور سرخ جروالو خوبصورت ہاتھوں نے اکٹھے کر لیے۔ خوبصورت لبوں نے ان کا تازہ رس چوسا اور انہیں اپنے گھر کی چھت پر لے جا کر سوکھنے کے لیے رکھ دیا کہ جب وہ جروالو سوکھ جائیں گے' جب ایک بہار گزر جائے گی اور دوسری بہار آنے کو ہو گی تو میں آؤں گا اور اس کی لذت سے لطف اندوز ہو سکوں گا۔

جروالو کھا کے ہم نے خشک خوبانیاں کھائیں۔ خوبانی پہلے تو بہت میٹھی معلوم نہ ہوتی مگر جب دہن کے لعاب میں گھل جاتی تو شہد و شکر کا مزہ دینے لگتی۔

''نرم نرم بہت میٹھی ہیں یہ''۔ میں نے کہا۔

اس نے ایک گٹھلی کو دانتوں سے توڑا اور خوبانی کا بیج نکال کر مجھے دیا: ''کھاؤ'' بیج بادام کی طرح میٹھا تھا۔

''ایسی خوبانیاں میں کبھی نہیں کھائیں۔''

اس نے کہا: ''یہ ہمارے آنگن کا پیڑ ہے۔ ہمارے ہاں خوبانی کا ایک ہی پیڑ ہے۔ مگر اتنی بڑی سرخ اور میٹھی خوبانیاں ہوتی ہیں اس کی کہ میں کیا کہوں۔ جب خوبانیاں پک جاتی ہیں تو میری ساری سہیلیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ اور خوبانیاں کھلانے کو کہتی ہیں...... پچھلی بہار میں......

اور میں نے سوچا' پچھلی بہار میں' میں نہ تھا۔ مگر خوبانی کا پیڑ آنگن میں اسی طرح کھڑا تھا' پچھلی بہار میں وہ نازک پتوں سے بھر گیا تھا۔ پھر ان میں کچی خوبانیوں کے سبز اور نوکیلے پھل لگے

تھے...... ابھی ان خوبانیوں میں گٹھلی پیدا ہوئی تھی اور یہ کچے کھٹے پھل دوپہر کے کھانے کے ساتھ چٹنی کا کام دیتے تھے۔ پچھلی بہار میں، میں نہ تھا اور ان خوبانیوں میں گٹھلیاں پیدا ہوگئی تھیں اور خوبانیوں کا رنگ ہلکا سنہرا ہونے لگا تھا۔ اور گٹھلیوں کے اندر نرم نرم بیج اپنے ذائقے میں سبز باداموں کو بھی مات کرتے تھے۔ پچھلی بہار میں، میں نہ تھا اور یہ سرخ سرخ خوبانیاں جو اپنی رنگت میں کشمیری دوشیزاؤں کی طرح صبیح تھیں اور ایسی ہی رسدار۔ سبز سبز پتوں کے جھومروں سے جھانکتی نظر آتی تھیں۔ پھر الھڑ لڑکیاں آنگن میں ناچنے لگیں۔ اور چھوٹا بھائی درخت کے اوپر چڑھ گیا اور خوبانیاں توڑ توڑ کر اپنی بہن کی سہیلیوں کے لیے پھینکتا گیا۔ کتنی میٹھی تھیں، وہ پچھلی بہار کی رس بھری خوبانیاں۔ جب میں نہ تھا......

خوبانیاں کھا کے اس نے مکئی کا بھٹا نکالا۔ ایسی سوندھی سوندھی خوشبو تھی۔ سنہرا سینکا ہوا بھٹا۔ اور کرکرے دانے صاف شفاف موتیوں کی سی جلا لیے ہوئے اور ذائقے میں بیحد شیریں۔

وہ بولی: ''یہ مصری مکئی کے بھٹے ہیں۔''

''بے حد میٹھے''۔ میں نے بھٹا کھاتے ہوئے کہا۔

وہ بولی: ''پچھلی فصل کے رکھے تھے، گھروں میں چھپا کے۔ اماں کی آنکھ سے اوجھل۔''

میں نے بھٹا ایک جگہ سے کھایا۔ دانوں کی چند قطاریں رہنے دیں، پھر اس نے اسی جگہ سے کھایا اور دانوں کی چند قطاریں میرے لیے رہنے دیں۔ جنہیں میں کھانے لگا اور اس طرح ہم دونوں ایک ہی بھٹے سے کھاتے گئے۔ اور میں نے سوچا، یہ مصری مکئی کے بھٹے کتنے میٹھے ہیں۔ یہ پچھلی فصل کے بھٹے۔ جب تو تھی لیکن میں نہ تھا۔ جب تیرے باپ نے ہل چلایا تھا کھیتوں میں۔ گوڈی کی تھی، بیج بوئے تھے، بادلوں نے پانی دیا تھا۔ زمین نے سبز سبز رنگ کے چھوٹے چھوٹے پودے اگائے تھے۔ جن میں تو نے نلائی کی تھی۔ پھر پودے بڑے ہو گئے تھے اور ان کے سروں پر سریان نکل آئی تھیں اور ہوا میں جھومنے لگی تھیں۔ اور تو مکئی کے پودوں پر ہرے ہرے بھٹے دیکھنے جاتی تھی۔ جب میں نہ تھا لیکن بھٹوں کے اندر دانے پیدا ہو رہے تھے، دودھ بھرے دانے، جن کی نازک جلد کے اوپر اگر ذرا سا بھی ناخن لگ جائے تو دودھ باہر نکل آتا ہے۔ ایسے نرم و نازک بھٹے اس دھرتی نے اگائے تھے اور نہ تھا اور میں پھر یہ بھٹے جوان اور توانا ہو گئے اور ان کا رس پختہ ہو گیا۔ پختہ اور سخت۔ اب ناخن لگانے سے کچھ نہ ہوتا تھا۔ اپنے ناخن ہی کے ٹوٹنے کا احتمال تھا۔ بھٹوں کی مونچھیں جو پہلے پیلی تھیں۔ اب سنہری اور پھر آخر میں سیاہی مائل ہوتی گئیں۔ مکئی کے بھٹوں کا رنگ زمین کی طرح بھورا ہوتا گیا۔ اب جب بھی میں نہ آیا تھا اور پھر کھیتوں میں کھلیان لگے اور کھلیانوں میں بیل چلے اور بھٹوں سے دانے الگ ہو گئے۔ اور تو نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ محبت کے گیت گائے اور تھوڑے سے بھٹے چھپا کے سینک کے الگ رکھ دیئے۔ جب میں نہ تھا، دھرتی تھی، تخلیق تھی، محبت کے گیت تھے۔ آگ پر سینکے ہوئے بھٹے تھے لیکن میں نہ تھا۔

میں نے مسرت سے اس کی طرف دیکھا اور کہا: ''آج پورے چاند کی رات کو جیسے ہر بات پوری ہوگئی ہے۔ کل رات پوری نہ تھی آج پوری ہے۔''

اس نے بھٹا میرے منہ سے لگا دیا۔ اس کے ہونٹوں کا گرم گرم نمناک لمس ابھی تک اس بھٹے پر تھا۔ میں نے کہا: ''میں تمہیں چوم لوں؟''

وہ بولی: ''ہُش، کشتی ڈوب جائے گی۔''

''تو پھر کیا کریں؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولی: ''ڈوب جانے دو۔''

☆☆☆

وہ پورے چاند کی رات مجھے اب تک نہیں بھولتی۔ میری عمر ستر برس کے قریب ہے۔ لیکن وہ پورے چاند کی رات میرے ذہن میں اس طرح چمک رہی ہے، جیسے ابھی وہ کل آئی تھی۔ ایسی پاکیزہ محبت میں نے آج تک نہیں کی ہوگی۔ اس نے بھی نہیں کی ہوگی۔ وہ جادو ہی کچھ اور تھا۔ جس نے پورے چاند کی رات کو ہم دونوں کو ایک دوسرے سے یوں ملا دیا کہ وہ پھر گھر نہیں گئی۔ اسی رات میرے ساتھ بھاگ آئی اور ہم پانچ چھ دن محبت میں کھوئے ہوئے بچوں کی طرح ادھر ادھر جنگلوں کے کنارے ندی نالوں پر اخروٹوں کے سائے تلے گھومتے رہے، دنیا و مافیہا سے بے خبر۔ پھر میں نے اسی جھیل کے کنارے ایک چھوٹا سا گھر خرید لیا اور اس میں ہم دونوں رہنے لگے۔ کوئی ایک مہینہ کے بعد میں سری نگر گیا اور اس سے یہ کہہ کے گیا کہ تیسرے دن لوٹ آؤں گا، تیسرے دن لوٹ آؤں گا، تیسرے دن میں لوٹ آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ ایک نوجوان سے گھل مل کے باتیں کر رہی ہے۔ وہ دونوں ایک ہی رکابی میں کھانا رکھا رہے تھے۔ ایک دوسرے کے منہ میں لقمے ڈالتے جاتے ہیں۔ اور ہنستے جاتے ہیں۔ میں نے انہیں دیکھ لیا لیکن انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ وہ اپنی مسرت میں اس قدر محو تھے کہ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ اور میں نے سوچا کہ یہ پچھلی بہار یا اس سے بھی پچھلی بہار کا محبوب ہے، جب میں نہ تھا۔ اور پھر شاید اور آگے بھی کتنی ہی ایسی بہاریں آئیں گی، کتنی ہی پورے چاند کی راتیں، جب محبت ایک فاحشہ عورت کی طرح بے قابو ہو جائے گی اور عریاں ہو کے رقص کرنے لگے گی۔ آج تیرے گھر میں خزاں آ گئی ہے۔ جیسے ہر بہار کے بعد آتی ہے۔ اب تیرا یہاں کیا کام۔ اس لیے میں یہ سوچ کر ان سے ملے بغیر اسی وقت واپس چلا گیا اور پھر اپنی پہلی بہار سے کبھی نہیں ملا۔

اور اب میں اڑتالیس برس کے بعد لوٹ کے آیا ہوں۔ میرے بیٹے میرے ساتھ ہیں میری بیوی مر چکی ہے۔ لیکن میرے بیٹوں کی بیویاں اور ان کے بچے میرے ساتھ ہیں اور شام ہوگئی ہے اور میں دیر تک پل کے کنارے آ نکلا ہوں اور اپریل کا مہینہ ہے سہ پہر سے شام ہوگئی ہے اور میں دیر تک پل کے کنارے کھڑا بادام کے پیڑوں کی قطاریں دیکھتا جاتا ہوں اور خنک ہوا میں سفید

شگوفوں کے گچھے لہراتے جاتے ہیں اور پگڈنڈی کی خاک پر سے کسی جانے پہچانے قدموں کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ایک حسین دوشیزہ لڑکی ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی پوٹلی دبائے پل پر سے بھاگتی ہوئی گزر جاتی ہے اور میرا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ دور پار تنگوں سے پرے بستی میں کوئی بیوی اپنے خاوند کو آواز دے رہی ہے اور اسے کھانے پر بلا رہی ہے۔ کہیں سے ایک دروازہ بند ہونے کی صدا آتی ہے اور ایک روتا ہوا بچہ یکایک چپ ہو جاتا ہے' چھتوں سے دھواں نکل رہا ہے اور پرندے شور مچاتے ہوئے ایک دم درختوں کی گھنی شاخوں میں اپنے پر پھڑپھڑاتے ہیں اور پھر ایک دم چپ ہو جاتے ہیں۔ ضرور کوئی مانجی گا رہا ہے اور اس کی آواز گونجتی گونجتی افق کے اس پار گم ہوتی جا رہی ہے۔

میں پل کو پار کر کے آگے بڑھتا ہوں۔ میرے بیٹے اور ان کی بیویاں اور بچے میرے پیچھے آ رہے ہیں۔ الگ الگ ٹولیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہاں پر بادام کے پیڑوں کی قطار ختم ہو گئی۔ تلہ بھی ختم ہو گیا۔ جھیل کا کنارہ ہے۔ یہ خوبانی کا درخت ہے' لیکن کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ مگر کشتی' یہ کشتی ہے۔ مگر کیا یہ وہی کشتی ہے۔ سامنے وہ گھر ہے میری پہلی بہار کا گھر۔ میری پورے چاند کی رات کی محبت۔

گھر میں روشنی ہے بچوں کی صدائیں ہیں۔ کوئی بھاری آواز میں گانے لگتا ہے۔ کوئی بڑھیا اسے چیخ کر چپ کر دیتی ہے۔ میں سوچتا ہوں' آدھی صدی ہو گئی۔ میں نے اس گھر کو نہیں دیکھا۔ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ آخر میں نے اسے خریدا تھا۔ دیکھا جائے تو میں ابھی تک اس کا مالک ہوں۔ دیکھ لینے میں ہرج ہی کیا ہے۔ میں گھر کے اندر چلا جاتا ہوں۔

بڑے اچھے پیارے بچے ہیں۔ ایک جوان عورت اپنے خاوند کے لیے رکابی میں کھانا رکھ رہی ہے۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹک جاتی ہے۔ دو بچے لڑ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر حیرت سے چپ ہو جاتے ہیں۔ بڑھیا جو ابھی غصہ میں ڈانٹ رہی تھی' تھم کے پاس آ کے کھڑی ہو جاتی ہے' کہتی ہے: ''کون ہو تم؟''

میں نے کہا: ''یہ میرا گھر ہے۔'' وہ بولی: ''تمہارے باپ کا ہے۔''

میں نے کہا: ''میرے باپ کا نہیں ہے' میرا ہے۔ کوئی اڑتالیس برس ہوئے' میں نے اسے خریدا تھا۔ بس اس وقت تو یونہی میں اسے دیکھنے کے لیے چلا آیا۔ آپ لوگوں کو نکالنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ یہ گھر تو بس سمجھئے اب آپ ہی کا ہے۔ میں تو یونہی...... میں یہ کہہ کر لوٹنے لگا۔ بڑھیا کی انگلیاں سختی سے تھم پر جم گئیں۔ اس نے سانس زور سے اندر کو کھینچی۔ بولی: ''تو تم ہو...... اب اتنے برس کے بعد کوئی کیسے پہچانے......

وہ تھم سے لگی دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ میں نیچے آنگن میں چپ چاپ کھڑا اس کی طرف تکتا رہا۔ پھر وہ آپ ہی آپ ہنس دی۔ بولی: ''آؤ میں تمہیں اپنے گھر کے لوگوں سے ملاؤں...... دیکھو یہ میرا بڑا بیٹا ہے۔ یہ اس سے چھوٹا ہے' یہ بڑے بیٹے کی بیوی ہے۔ یہ میرا بڑا پوتا

ہے' سلام کرو بیٹا۔ یہ پوتی...... یہ میرا خاوند ہے' شش اسے جگانا نہیں۔ پرسوں سے اسے بخار آ رہا ہے' سونے دو اسے......''

وہ بولی: ''تمہاری کیا خاطر کروں۔''

میں نے دیوار پر کھونٹی سے ٹنگے ہوئے مکئی کے بھٹوں کو دیکھا' سینکے ہوئے بھٹے سنہرے موتیوں کے سے شفاف دانے۔

ہم دونوں مسکرا دیئے۔

وہ بولی: ''میرے تو بہت سے دانت جھڑ چکے ہیں' جو ہیں بھی وہ کام نہیں کرتے۔''

میں نے کہا: ''یہی حال میرا بھی ہے۔ بھٹا نہ کھا سکوں گا۔''

مجھے گھر کے اندر گھستے دیکھ میرے گھر کے افراد بھی اندر چلے آئے تھے۔ اب خوب گھما گھمی تھی۔ بچے ایک دوسرے سے بہت جلد مل جل گئے۔

ہم دونوں آہستہ آہستہ باہر چلے آئے۔ آہستہ آہستہ جھیل کے کنارے چلے گئے۔

وہ بولی: ''میں نے چھ برس تمہارا انتظار! تم اس روز کیوں نہیں آئے؟''

میں نے کہا: ''میں آیا تھا مگر تمہیں کسی دوسرے نوجوان کے ساتھ دیکھ کر واپس چلا گیا تھا۔''

''کیا کہتے ہو؟'' وہ بولی۔

''ہاں تم اس کے ساتھ کھانا کھا رہی تھیں' ایک ہی رکابی میں اور وہ تمہارے منہ میں اور تم اس کے منہ میں لقمے ڈال رہی تھیں۔''

وہ ایک دم چپ ہوگئی۔ پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ وہ بولی: ''ارے وہ تو میرا سگا بھائی تھا۔''

وہ پھر زور زور سے ہنسنے لگی۔ ''وہ مجھ سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ اسی روز تم بھی آنے والے تھے۔ وہ واپس جا رہا تھا۔ میں نے روک لیا کہ تم سے مل کے جائے۔ تم پھر آئے ہی نہیں۔''

وہ ایک دم سنجیدہ ہوگئی۔ چھ برس میں نے تمہارا انتظار کیا۔ تمہارے جانے کے بعد مجھے خدا نے بیٹا دیا۔ تمہارا بیٹا۔ مگر ایک سال بعد وہ بھی مر گیا۔ چار سال اور میں نے تمہاری راہ دیکھی۔ مگر تم نہیں آئے پھر میں نے شادی کر لی۔''

دو بچے باہر نکل آئے۔ کھیلتے کھیلتے ایک بچہ دوسری بچی کو مکئی کا بھٹا کھلا رہا تھا۔

اس نے کہا: ''وہ میرا پوتا ہے۔'' میں نے کہا: ''وہ میری پوتی ہے۔''

وہ دونوں بھاگتے بھاگتے جھیل کے کنارے کنارے دور تک چلے گئے۔ زندگی کے دو خوبصورت مرقعے۔ ہم دیر تک انہیں دیکھتے رہے۔ وہ میرے قریب آ گئی۔ بولی: ''آج تم آئے ہو تو مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ میں نے اب اپنی زندگی بنا لی ہے۔ اس کی ساری خوشیاں اور غم دیکھے ہیں۔ میرا ہرا

بھرا گھر ہے۔ اور آج تم بھی آئے ہو' میرا ذرا بھی دل نہیں لگ رہا ہے۔"

میں نے کہا: "یہی حال میرا ہے۔ سوچتا تھا زندگی بھر تمہیں نہیں ملوں گا۔ اسی لیے اتنے برس ادھر کبھی نہیں آیا۔ اب آیا ہوں تو ذرا رتی بھر بھی برا نہیں لگ رہا۔"

ہم دونوں چپ ہو گئے۔ بچے کھیلتے کھیلتے ہمارے پاس واپس آ گئے۔ اس نے میری پوتی کو اٹھا لیا' میں نے اس کے پوتے کو' اس نے میری پوتی کو چوما' میں نے اس کے پوتے کو' اور ہم دونوں خوشی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ اس کی پتلیوں میں چاند چمک رہا تھا اور وہ چاند حیرت سے مسرت سے کہہ رہا تھا: "انسان مر جاتے ہیں' لیکن زندگی نہیں مرتی۔ بہار ختم ہو جاتی ہے' لیکن پھر دوسری بہار آ جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی محبتیں بھی ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن زندگی کی بڑی عظیم سچی محبت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ تم دونوں پچھلی بہار میں نہ تھے یہ بہار تم نے دیکھی' اس سے اگلی بہار میں تم نہ ہو گے۔ لیکن زندگی بھی ہو گی اور محبت بھی ہو گی اور خوبصورتی اور رعنائی اور معصومیت بھی......

بچے ہماری گود سے اتر پڑے کیونکہ وہ الگ سے کھیلنا چاہتے تھے۔ وہ بھاگتے ہوئے خوبانی کے درخت کے قریب چلے گئے' جہاں کشتی بندھی تھی۔

میں نے پوچھا: "یہ وہی درخت ہے۔" اس نے مسکرا کر کہا: "نہیں یہ دوسرا درخت ہے۔"

❀ ❀ ❀

راجندر سنگھ بیدی

لاجونتی

''ہتھ لائیاں کملاں نی لاجونتی دے بوٹے......''
(یہ چھوئی موئی کے پودے ہیں انہیں ہاتھ بھی لگاؤ تو کمھلا جاتے ہیں)
—ایک پنجابی گیت

بٹوارہ ہوا اور بے شمار زخمی لوگوں نے اٹھ کر اپنے بدن پر سے خون پونچھ ڈالا اور پھر سب مل کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے جن کے بدن صحیح و سالم تھے، لیکن دل زخمی......

گلی گلی محلے محلے ''پھر بساؤ'' کمیٹیاں بن گئی تھیں اور شروع شروع میں بڑی تندہی کے ساتھ ''کاروبار میں بساؤ'' ''زمین پر بساؤ'' اور ''گھروں میں بساؤ'' پروگرام شروع کر دیا گیا تھا لیکن ایک پروگرام ایسا تھا جس کی طرف کسی نے توجہ نہ دی تھی۔ وہ پروگرام مغویہ عورتوں کے سلسلے میں تھا جس کا سلوگن تھا ''دل میں بساؤ'' اور اس پروگرام کی نارائن باوا کے مندر اور اس کے آس پاس بسنے والے قدامت پسند طبقے کی طرف سے بڑی مخالفت ہوئی تھی۔

اس پروگرام کو حرکت میں لانے کے لیے مندر کے پاس محلے ''ملاشکور'' میں ایک کمیٹی قائم ہوگئی اور گیارہ ووٹوں کی اکثریت سے سندر لال بابو کو اس کا سکریٹری چن لیا گیا۔ وکیل صاحب صدر، چوکی کلاں کو بوڑھا محرر اور محلے کے دوسرے معتبر لوگوں کا خیال تھا کہ سندر لال سے زیادہ جانفشانی کے ساتھ اس کام کو کوئی اور نہ کر سکے گا۔ شاید اس لیے کہ سندر لال کی بیوی اغوا ہو چکی تھی اور اس کا نام بھی تھا لاجو—لاجونتی۔

چنانچہ پربھات پھیری نکالتے ہوئے جب سندر لال بابو، اس کا ساتھی رسالو اور نیکی رام وغیرہ مل کر گاتے— ''آتھ لائیاں کملانی لاجونتی دے بوٹے......'' تو سندر لال کی آواز ایک دم بند ہو جاتی اور وہ خاموشی کے ساتھ چلتے چلتے لاجونتی کی بابت سوچتا—جانے کی آواز کہاں گئی ہوگی، کس حال میں ہوگی، ہماری بابت کیا سوچ رہی ہوگی، وہ آئے گی بھی یا نہیں؟......اور پتھریلے فرش پر چلتے چلتے اس کے قدم لڑکھڑانے لگتے۔

اور اب تو یہاں تک نوبت آ گئی تھی کہ اس نے لاجونتی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا

تھا۔اس کا غم اب دنیا کا غم ہو چکا تھا۔اس نے اپنے دکھ سے بچنے کے لیے لوک سیوا میں اپنے آپ کو غرق کر دیا۔اس کے باوجود دوسرے ساتھیوں کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے اسے یہ خیال ضرور آتا ــــ انسانی دل کتنا نازک ہوتا ہے۔ ذرا سی بات پر اسے ٹھیس لگ سکتی ہے۔ وہ لاجونتی کے پودے کی طرح ہے۔ جس کی طرف ہاتھ بھی بڑھاؤں تو کمھلا جاتا ہے لیکن اس نے اپنی لاجونتی کے ساتھ بدسلوکی کرنے میں کوئی بھی سکر نہ اٹھا رکھی تھی۔ وہ اسے جگہ بے جگہ اٹھنے بیٹھنے' کھانے کی طرف بے توجہی برتنے اور ایسی ہی معمولی معمولی باتوں پر پیٹ دیا کرتا تھا۔

اور لاجو ایک پتلی شہتوت کی ڈال کی طرح نازک سی دیہاتی لڑکی تھی۔زیادہ دھوپ دیکھنے کی وجہ سے اس کا رنگ سنولا چکا تھا۔طبیعت میں ایک عجیب طرح کی بے قراری تھی۔اس کا اضطرار شبنم کے اس قطرے کی طرح تھا جو پارہ بن کر اس کے بڑے سے پتے پر کبھی ادھر اور کبھی ادھر لڑھکتا رہتا ہے۔اس کا دبلا پن اس کی صحت کے خراب ہونے کی دلیل نہ تھی' ایک صحت مندی کی نشانی تھی جسے دیکھ کر بھاری بھرکم سندر لال پہلے تو گھبرایا لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاجو ہر قسم کا بوجھ' ہر قسم کا صدمہ حتیٰ کہ مار پیٹ تک سہ گزرتی ہے تو وہ اپنی بدسلوکی کو بتدریج بڑھاتا گیا اور اس نے حدوں کا خیال ہی نہ کیا جہاں پہنچ جانے کے بعد کسی بھی انسان کا صبر ٹوٹ سکتا ہے۔ان حدوں کو دھندلا دینے میں لاجونتی خود بھی تو ممد ثابت ہوئی تھی۔ چونکہ وہ دیر تک اداس نہ بیٹھ سکتی تھی اس لیے بڑی سے بڑی لڑائی کے بعد بھی سندر لال کے صرف ایک مسکرا دینے پر وہ اپنی ہنسی نہ روک سکتی اور لپک کر اس کے پاس چلی آتی اور گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہہ اٹھتی ــــ ''پھر مارا تو میں تم سے نہیں بولوں گی......'' صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک دم ساری مار پیٹ بھول چکی ہے۔گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی جانتی تھی کہ مرد ایسا ہی سلوک کیا کرتے ہیں بلکہ عورتوں میں کوئی بھی سرکشی کرتی تو لڑکیاں خود ہی ناک پر انگلی رکھ کر کہتیں ــــ ''لے وہ بھی کوئی مرد ہے بھلا۔عورت جس کے قابو میں نہیں آتی......'' اور یہ مار پیٹ ان کے گیتوں میں چلی گئی تھی۔خود لاجو گایا کرتی تھی۔ میں شہر کے لڑکے سے شادی نہ کروں گی۔ وہ بوٹ پہنتا ہے اور میری کمر بڑی پتلی ہے لیکن پہلی ہی فرصت میں لاجو نے شہر ہی کے لڑکے سے لو لگائی اور اس کا نام تھا سندر لال' جو ایک برات کے ساتھ لاجونتی کے گاؤں چلا آیا تھا اور جس نے دولہا کے کان میں صرف اتنا سا کہا تھا ــــ ''تیری سالی تو بڑی نمکین ہے یار' بیوی بھی چٹ پٹی ہو گی''۔ لاجونتی نے سندر لال کی اس بات کو سن لیا تھا مگر وہ یہ بھول ہی گئی کہ سندر لال کتنے بڑے بڑے اور بھدے بوٹ پہنے ہوئے ہے اور اس کی اپنی کمر کتنی پتلی ہے!

اور پربھات پھیری کے سمے ایسی ہی باتیں سندر لال کو یاد آئیں اور وہ یہی سوچتا ایک بار' صرف ایک بار لاجو مل جائے تو میں اسے سچ مچ ہی دل میں بسا لوں اور لوگوں کو بتا دوں ان ــــ بیچاری عورتوں کے اغوا ہو جانے میں ان کا کوئی قصور نہیں۔فسادیوں کی ہوسناکیوں کا شکار ہو جانے میں ان

کی کوئی غلطی نہیں۔ وہ سماج جو ان معصوم اور بے قصور عورتوں کو قبول نہیں کرتا۔ انہیں اپنا نہیں لیتا — ایک گلا سڑا سماج ہے اور اسے ختم کر دینا چاہیے ...... وہ ان عورتوں کو گھروں میں آباد کرنے کی تلقین کیا کرتا اور انہیں ایسا مرتبہ دینے کی پریرنا کرتا جو گھر میں کسی بھی عورت' کسی بھی ماں' بیٹی' بہن یا بیوی کو دیا جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا — انہیں اشارے اور کنائے سے بھی ایسی باتوں کی یاد نہیں دلانی چاہیے جو ان کے ساتھ ہوئیں — کیونکہ ان کے دل زخمی ہیں۔ وہ نازک ہیں' چھوئی موئی کی طرح — ہاتھ بھی لگاؤ تو کمھلا جائیں گے......

گویا ''دل میں بساؤ'' پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے محلّہ ملا شکور کی اس کمیٹی نے کئی پربھات پھیریاں نکالیں۔ صبح چار پانچ بجے کا وقت ان کے لیے موزوں ترین وقت ہوتا تھا۔ نہ لوگوں کا شور' نہ ٹریفک کی الجھن' رات بھر چوکیداری کرنے والے کتے تک بجھے ہوئے تنوروں میں سر دے کر پڑے ہوتے تھے۔ اپنے اپنے بستروں میں دبکے ہوئے لوگ پربھات پھیری والوں کی آواز سن کر صرف اتنا کہتے — او! وہی منڈلی ہے! اور پھر کبھی صبر اور کبھی تنک مزاجی سے وہ بابو سندر لال پروپیگنڈا سنا کرتے۔ وہ عورتیں جو بڑی محفوظ اس پار پہنچ گئی تھیں گوبھی کے پھولوں کی طرح پھیلی پڑی رہتیں اور ان کے خاوند ان کے پہلو میں ڈنٹھلوں کی طرح اکڑے پڑے پڑے پربھات پھیری کے شور پر احتجاج کرتے ہوئے منہ میں کچھ منمناتے چلے جاتے۔ یا کہیں کوئی بچہ تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں کھولتا اور ''دل میں بساؤ'' کے فریادی اور اندوہ گیں پروپگنڈے کو صرف ایک گانا سمجھ کر پھر سو جاتا۔

لیکن صبح کے سمے کان میں پڑا ہوا شبد بیکار نہیں جاتا۔ وہ سارا دن ایک تکرار کے ساتھ دماغ میں چکر لگاتا رہتا ہے اور بعض وقت تو انسان اس کے معنی کو بھی نہیں سمجھتا۔ پر گنگناتا چلا جاتا ہے۔ اسی آواز کے گھر کر جانے کی بدولت ہی تھا کہ انہیں دنوں جب کہ مس مردولا سارا بھائی ہند اور پاکستان کے درمیان اغوا شدہ عورتیں تبادلے میں لائیں تو محلّہ ملا شکور کے کچھ آدمی انہیں پھر سے بسانے کے لیے تیار ہو گئے۔ ان کے وارث شہر سے باہر چوکی کلاں پر انہیں ملنے کے لیے گئے۔ مغویہ عورتیں اور ان کے لواحقین کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر سر جھکائے اپنے اپنے برباد گھروں کو پھر سے آباد کرنے کے کام پر چل دیئے۔ رسالو اور نیکی رام اور سندر لال بابو کبھی ''مہندر سنگھ زندہ باد'' اور کبھی ''سوہن لال زندہ باد'' کے نعرے لگاتے ...... اور وہ نعرے لگاتے رہے حتیٰ کہ ان کے گلے سوکھ گئے۔

لیکن مغویہ عورتوں میں ایسی بھی تھیں جن کے شوہروں' جن کے ماں باپ' بہن اور بھائیوں نے انہیں پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ آخر وہ مر کیوں نہ گئیں؟ اپنی عفت اور عصمت کو بچانے کے لیے انہوں نے زہر کیوں نہ کھا لیا؟ کنویں میں چھلانگ کیوں نہ لگا دی؟ وہ بزدل تھیں جو اس طرح زندگی

سے چمٹی ہوئی تھیں۔ سینکڑوں ہزاروں عورتوں نے اپنی عصمت لٹ جانے سے پہلے اپنی جان دے دی لیکن انہیں کیا پتہ کہ وہ زندہ رہ کر کس بہادری سے کام لے رہی ہیں۔ کیسے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے موت کو گھور رہی ہیں ایسی دنیا میں جہاں ان کے شوہر تک انہیں نہیں پہچانتے۔ پھر ان میں سے کوئی جی ہی جی میں اپنا نام دہراتی — سہاگ ونتی — سہاگ والی...... اور اپنے بھائی کو اس جم غفیر میں دیکھ کر آخری بار اتنا کہتی...... تو بھی مجھے نہیں پہچانتا بہاری؟ میں نے تجھے گودی کھلایا تمہارے...... اور بہاری چلا دینا چاہتا۔ پھر وہ ماں باپ کی طرف دیکھتا اور ماں باپ اپنے جگر پر ہاتھ رکھ کر نارائن بابا کی طرف دیکھتے اور نہایت بے بسی کے عالم میں نارائن بابا آسمان کی طرف دیکھتا جو دراصل کوئی حقیقت نہیں رکھتا اور جو صرف ہماری نظر کا دھوکا ہے۔ جو صرف ایک حد ہے جس کے پار ہماری نگاہیں کام نہیں کرتیں۔

لیکن فوج ٹرک میں مس سارا بھائی تبادلے میں جو عورتیں لائیں' ان میں لاجو نہ تھی۔ سندرلال نے امید و بیم سے آخری لڑکی کو ٹرک سے نیچے اترتے دیکھا اور پھر اس نے بڑی خاموشی اور بڑے عزم سے اپنی کمیٹی کی سرگرمیوں کو دوچند کر دیا۔ اب وہ صرف صبح کے سمے ہی پربھات پھیری کے لیے نہ نکلتے تھے بلکہ شام کو بھی جلوس نکالنے لگے اور کبھی کبھی ایک آدھ چھوٹا موٹا جلسہ بھی کرنے لگے جس میں کمیٹی کا بوڑھا صدر وکیل کالکا پرشاد صوفی کھنکاروں سے ملی جلی ایک تقریر کر دیا کرتا اور رسالو ایک پیکدان لیے ڈیوٹی پر ہمیشہ موجود رہتا۔ لاؤڈ اسپیکر سے عجب طرح کی آوازیں آتیں۔ پھر کہیں نیکی رام محرر چوکی کچھ کہنے کے لیے اٹھتے لیکن وہ جتنی بھی باتیں کرتے اور یوں میدان ہاتھ سے جاتے دیکھ کر سندرلال بابو اٹھتا لیکن وہ دو فقروں کے علاوہ کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔ اس کا گلا رک جاتا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے اور روہانسا ہونے کے کارن وہ تقریر نہ کر پاتا۔ آخر بیٹھ جاتا لیکن مجمع پر ایک عجیب طرح کی خاموشی چھا جاتی اور سندرلال بابو کی ان دو باتوں کا اثر جو کہ اس کے دل کی گہرائیوں سے چلی آتیں' وکیل کالکا پرشاد صوفی کی ساری ناصحانہ فصاحت پر بھاری ہوتا۔ لیکن لوگ وہیں رو دیتے' اپنے جذبات کو آسودہ کر لیتے اور پھر خالی الذہن گھر لوٹ جاتے۔

ایک روز کمیٹی والے سانجھ کے سمے بھی پرچار کرنے چلے آئے اور ہوتے ہوتے قدامت پسندوں کے گڑھ میں پہنچ گئے۔ مندر کے باہر پیپل کے پیڑ کے اردگرد سیمنٹ کے تھڑے پر کئی شردھالو بیٹھے تھے اور رامائن کی کتھا ہو رہی تھی۔ نارائن باوا رامائن کا وہ حصہ سنا رہے تھے جہاں ایک دھوبی نے اپنی دھوبن کو گھر سے نکال دیا تھا۔ اور اس سے کہہ دیا — میں راجا رام چندر نہیں جو اتنے سال راون کے ساتھ رہ آنے پر بھی سیتا کو بسا لے گا اور رام چندر جی نے مہاستونتی سیتا کو گھر سے نکال دیا — ایسی حالت میں وہ جب کہ وہ گربھ وتی تھی۔ ''کیا اس سے بھی بڑھ کر رام راج کا کوئی ثبوت مل سکتا ہے؟'' — نارائن باوا نے کہا — ''یہ ہے رام راج! جس میں ایک دھوبی کی بات کو بھی اتنی ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔''

کمیٹی کا جلوس مندر کے پاس رک چکا تھا اور لوگ رامائن کی کتھا اور شلوک کا درنن سننے کے لیے ٹھہر چکے تھے۔ سندر لال آخری فقرے سنتے ہوئے کہہ اٹھا۔۔۔

''ہمیں ایسا رام راج نہیں چاہیے بابا!''

''چپ رہو جی''۔۔۔ ''تم کون ہوتے ہو؟''۔۔۔ ''خاموش!'' مجمع سے آوازیں آئیں اور سندر لال نے بڑھ کر کہا۔۔۔ ''مجھے بولنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

پھر ملی جلی آوازیں آئیں۔۔۔ ''خاموش!''۔۔۔ ''ہم نہیں بولنے دیں گے''۔ اور ایک کونے میں سے یہ بھی آواز آئی۔۔۔ ''مار دیں گے۔''

نارائن بابا نے بڑی میٹھی آواز میں کہا۔۔۔ ''تم شاستروں کی مان مرجادا کو نہیں سمجھتے سندر لال!''

سندر لال نے کہا۔۔۔ ''میں ایک بات تو سمجھتا ہوں بابا۔۔۔ رام راج میں دھوبی کی آواز تو سنی جاتی ہے لیکن سندر لال کی نہیں۔''

انہی لوگوں نے جو ابھی مارنے پہ تلے تھے' اپنے نیچے سے پیپل کی گولریں ہٹا دیں اور پھر سے بیٹھتے ہوئے بول اٹھے۔ ''سنو' سنو' سنو......''

رسالو اور نیکی رام نے سندر لال بابو کو ٹھوکا دیا اور سندر لال بولے۔۔۔ شری رام نیتا تھے' پر یہ کیا بات ہے بابا جی' انہوں نے دھوبی کی بات کو ستیہ سمجھ لیا' مگر اتنی بڑی مہارانی کے ستیہ پر وشواس نہ کر پائے؟''

نارائن بابا نے اپنی داڑھی کی کھچڑی پکاتے ہوئے کہا۔۔۔ ''اس لیے سیتا ان کی اپنی پتنی تھی۔ سندر لال! تم اس بات کی مہانتا کو نہیں جانتے۔''

''ہاں بابا۔۔۔ ''سندر لال بابو نے کہا۔۔۔ ''اس سنسار میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ پر میں سچا رام راج اسے سمجھتا ہوں جس میں انسان اپنے آپ پر بھی ظلم نہیں کر سکتا۔ اپنے آپ سے بے انصافی کرنا اتنا ہی بڑا پاپ ہے جتنا کسی دوسرے سے بے انصافی کرنا...... آج بھی بھگوان رام نے سیتا کو گھر سے نکال دیا ہے۔ اس لیے کہ وہ راون کے پاس رہ آئی ہے...... اس میں کیا قصور تھا سیتا کا؟ کیا وہ بھی ہماری بہت سی ماؤں بہنوں کی طرح ایک اچھل اور کپٹ کی شکار نہ تھی؟ اس میں سیتا کے ستیہ اور استیہ کی بات ہے یا راکشش راون کے وحشی پن کی جس کے دس سر انسان کے تھے لیکن ایک اور سب سے بڑا سر گدھے کا؟''

......آج ہماری سیتا نردوش گھر سے نکال دی گئی ہے......سیتا...... لاجونتی ...... اور سندر لال بابو نے رونا شروع کر دیا۔ رسالو اور نیکی رام نے تمام وہ سرخ جھنڈے اٹھا لیے جن پر آج ہی اسکول کے چھوکروں نے بڑی صفائی سے نعرے کاٹ کر چپکا دیئے تھے اور پھر وہ سب ''سندر لال

بابو زندہ باد' کے نعرے لگاتے ہوئے چل دیئے۔ جلوس میں سے ایک نے کہا— ''مہاستی سیتا زندہ باد' ایک طرف سے آواز آئی۔ ''شری رام چندر......''

اور پھر بہت سی آوازیں آئیں— ''خاموش! خاموش!'' اور نارائن باوا کی مہینوں کی کتھا چلی گئی۔ بہت سے لوگ جلوس میں شامل ہو گئے جس کے آگے آگے وکیل کالکا پرشاد حکم سنگھ محرر چوکی کلاں جا رہے تھے' اپنی بوڑھی چھڑیوں کو زمین پر مارتے اور ایک فاتحانہ سی آواز پیدا کرتے ہوئے — اور ان کے درمیان کہیں سندر لال جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہہ رہے تھے۔ آج اس کے دل کو بری طرح ٹھیس لگی تھی اور لوگ بڑے جوش کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گا رہے تھے۔

''ہتھ لائیاں کملاں فی لاجونتی دے بوٹے......''

ابھی گیت کی آواز لوگوں کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ ابھی صبح بھی نہیں ہو پائی تھی اور محلہ ملاشکور کے مکان 414 کی بدھوا ابھی تک اپنے بستر میں کربناک انگڑائیاں لے رہی تھی کہ سندر لال کا ''گرائیں'' لال چند سے جسے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے سندر لال اور خلیفہ کالکا پرشاد نے راشن ڈپو لے دیا تھا' دوڑا دوڑا آیا اور اپنے گاڑھے کی چادر سے ہاتھ پھیلائے ہوئے بولا—

''بدھائی ہو سندر لال۔''

سندر لال نے میٹھا گڑ چلم میں رکھتے ہوئے کہا— ''کس بات کی بدھائی لاچند؟''

''میں نے لاجو بھابی کو دیکھا ہے۔''

سندر لال کے ہاتھ سے چلم گر گئی اور میٹھا تمباکو فرش پر گر گیا— ''کہاں دیکھا ہے؟'' اس نے لال چند کو کندھوں سے پکڑتے ہوئے پوچھا اور جلد جواب نہ پانے پر جھنجھوڑ دیا۔

''واگہ کی سرحد پر۔''

سندر لال نے لال چند کو چھوڑ دیا اور اتنا سا بولا۔ ''کوئی اور ہو گی۔''

لال چند نے یقین دلاتے ہوئے کہا— ''نہیں بھیا وہ لاجو ہی تھی لاجو......''

''تم اسے پہچانتے بھی ہو؟'' سندر لال نے پھر سے میٹھے تمباکو کو فرش پر سے اٹھاتے اور ہتھیلی پر مسلتے ہوئے پوچھا اور ایسا کرتے ہوئے اس نے رسالو کی چلم حقے پر سے اٹھا لی اور بولا—

''بھلا کیا پہچان ہے اس کی؟''

''ایک تیندولہ ٹھوڑی پر ہے' دوسرا گال پر—''

''ہاں ہاں ہاں'' اور سندر لال نے خود ہی کہہ دیا۔ ''تیسرا ماتھے پر''۔ وہ نہیں چاہتا تھا اب کوئی خدشہ رہ جائے اور ایک دم سے اسے لاجونتی کے جانے پہچانے جسم کے سارے تیندوے یاد آ گئے جو اس نے بچپنے میں اپنے جسم پر بنوا لیے تھے جو ان ہلکے ہلکے سبز دانوں کی مانند تھے جو چھوئی

موئی کے پودے کے بدن پر ہوتے ہیں اور جس کی طرف اشارہ کرتے ہی وہ کملانے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح ان تیندولوں کی طرف انگلی کرتے ہی لاجونتی شرما جاتی تھی — اور کسی نامعلوم خزانے کے لٹ جانے سے وہ مفلس ہوگئی ہو...... سندر لال کا سارا جسم ایک ان جانے خوف، ایک ان جانی محبت اور اس کی مقدس آگ میں پھنکنے لگا اس نے پھر سے لال چند کو پکڑ لیا اور پوچھا —

''لاجو واگہ کیسے پہنچ گئی؟''

لال چند نے کہا — ''ہند اور پاکستان میں عورتوں کا تبادلہ ہو رہا تھا نا۔''

''پھر کیا ہوا — ؟'' سندر لال نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا ''کیا ہوا پھر؟''

رسالو بھی اپنی چارپائی پر اٹھ بیٹھا اور تمباکو نوشوں کی مخصوص کھانسی کھانستے ہوئے بولا — ''سچ مچ آ گئی ہے لجونتی بھابی؟''

لال چند نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''واگہ پر سولہ عورتیں پاکستان نے دے دیں اور اس کے عوض سولہ عورتیں لے لیں — لیکن ایک جھگڑا کھڑا ہوگیا۔ ہمارے والنٹیر اعتراض کر رہے تھے کہ تم نے جو عورتیں دی ہیں ان میں ادھیڑ بوڑھی اور بیکار عورتیں زیادہ ہیں۔ اس تنازع پر لوگ جمع ہوگئے اور ادھر کے والنٹیر وں نے لاجو بھابی کو دکھاتے ہوئے کہا ''تم اسے بوڑھی کہتے ہو؟ دیکھو...... دیکھو...... جتنی عورتیں تم نے دی ہیں ان میں سے ایک بھی برابری کرتی ہے اس کی؟'' اور ہاں لاجو بھابی سب کی نظروں کے سامنے اپنے تیندوے چھپا رہی تھی۔''

پھر جھگڑا بڑھ گیا۔ دونوں نے اپنا اپنا ''مال'' واپس لے لینے کی ٹھان لی۔ میں نے شور مچایا — ''لاجو — لاجو بھابی......'' مگر ہماری فوج کے سپاہیوں نے ہمیں ہی مار مار کے بھگا دیا۔

اور لال چند اپنی کہنی دکھانے لگا، جہاں اسے لاٹھی پڑی تھی۔ رسالو اور نیکی رام چپ چاپ بیٹھے رہے اور سندر لال کہیں دور دیکھنے لگا۔ شاید سوچنے لگا۔ لاجو آئی بھی پر نہ آئی...... اور سندر لال کی شکل ہی سے جان پڑتا تھا جیسے وہ بیکانیر کا صحرا پھاند کر آیا ہے اور اب کہیں درخت کی چھاؤں میں زبان نکالے ہانپ رہا ہے۔ منہ سے اتنا بھی نہیں نکلتا — ''پانی دے دو۔'' اسے یوں محسوس ہوا۔ بٹوارے سے پہلے اور بٹوارے کے بعد کا تشدد ابھی تک کارفرما ہے۔ صرف اس کی بدل گئی ہے۔ اب لوگوں میں پہلا سا دریغ بھی نہیں رہا۔ کسی سے پوچھو، سانبھر والا میں لہنا سنگھ رہا کرتا تھا اور اس کی بھابی بنتو — تو وہ جھٹ سے کہتا ''مر گئے'' اور اس کے بعد موت اور اس کے مفہوم سے بالکل بے خبر بالکل عاری آگے چلا جاتا۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر بڑے ٹھنڈے دل سے تاخیر انسانی مال، انسانی گوشت اور پوست کی تجارت اور اس کا تبادلہ کرنے لگے۔ مویشی خریدنے والے کسی بھینس یا گائے کا جبڑا ہٹا کر دانتوں سے اس کی عمر کا اندازہ کرتے تھے۔

اب وہ جوان عورت کے روپ، اس کے نکھار، اس کے عزیز ترین رازوں، اس کے

تیندولوں کی شارع عام میں نمائش کرنے لگے۔ تشدد اب تاجروں کی نس نس میں بس چکا ہے۔ پہلے منڈی میں مال بکتا تھا اور بھاؤ تاؤ کرنے والے ہاتھ ملا کر اس پر ایک رومال ڈال لیتے اور یوں ''گپتی'' کر لیتے گویا رومال کے نیچے انگلیوں کے اشاروں سے سودا ہو جاتا تھا۔ اب ''گپتی'' کا رومال بھی ہٹ چکا تھا اور سامنے سودے ہو رہے تھے اور لوگ تجارت کے آداب بھی بھول گئے تھے۔ یہ سارا لین دین یہ سارا کاروبار پرانے زمانے کی داستان معلوم ہو رہا تھا جس میں عورتوں کی آزادانہ خرید وفروخت کا قصہ بیان کیا جاتا ہے۔ از بیک ان گنت عریاں عورتوں کے سامنے کھڑا ان کے جسموں کو ٹوہ ٹوہ کر دیکھ رہا ہے اور جب وہ کسی عورت کے جسم کو انگلی لگاتا ہے تو اس پر ایک گلابی سا گڑھا پڑ جاتا ہے اور اس کے اردگرد ایک زرد سا حلقہ اور پھر زردیاں اور سرخیاں ایک دوسرے کی جگہ لینے کے لیے دوڑتی ہیں ...... از بیک آگے گزر جاتا ہے اور ناقابل قبول عورت ایک اعترافِ شکست' ایک انفعالیت کے عالم میں ایک ہاتھ سے ازار بند تھامے اور دوسرے سے اپنے چہرے کو عوام کی نظروں سے چھپائے سسکیاں لیتی ہے......

☆☆☆

سندر لال امرتسر (سرحد) جانے کی تیاری کر رہی رہا تھا کہ اسے لاجو کے آنے کی خبر ملی۔ ایک دم ایسی خبر مل جانے سے سندر لال گھبرا گیا۔ اس کا ایک قدم فوراً دروازے کی طرف بڑھا لیکن وہ پیچھے لوٹ آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ روٹھ جائے اور کمیٹی کے تمام پلے کارڈوں اور جھنڈیوں کو بچھا کر بیٹھ جائے اور پھر روئے لیکن وہاں جذبات کا یوں مظاہرہ ممکن نہ تھا۔ اس نے مردانہ وار اس اندرونی کشاکش کا مقابلہ کیا اور اپنے قدموں کو ناپتے ہوئے یوں چوکی کلاں کی طرف چل دیا کیونکہ وہی جگہ تھی جہاں مغویہ عورتوں کی ڈلیوری دی جاتی تھی۔

اب لاجو سامنے کھڑی تھی اور ایک خوف کے جذبے سے کانپ رہی تھی۔ وہی سندر لال کو جانتی تھی' اس کے سوائے کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ پہلے ہی اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا تھا اور اب جبکہ وہ ایک مرد کے ساتھ زندگی کے دن بتا کر آئی تھی' نہ جانے کیا کرے گا۔'' سندر لال نے لاجو کی طرف دیکھا۔ وہ خالص اسلامی طرز کا لال دوپٹہ اوڑھے تھی اور بائیں بکل مارے ہوئے تھی ...... عادتاً محض عادتاً — دوسری عورتوں میں گھل مل جانے اور بالآخر اپنے صیاد کے دام سے بھاگ نکلنے کی آسانی تھی اور وہ سندر کے بارے میں اتنا زیادہ سوچ رہی تھی کہ اسے کپڑے بدلنے یا دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھنے کا بھی خیال نہ رہا۔ وہ ہندو اور مسلمان کی تہذیب کے بنیادی فرق — دائیں بکل اور بائیں بکل میں امتیاز کرنے سے قاصر رہی تھی ......اب وہ سندر لال کے سامنے کھڑی تھی اور کانپ رہی تھی' ایک امید اور ایک ڈر کے جذبے کے ساتھ۔

سندر لال کو دھچکا سا لگا۔ اس نے دیکھا لاجونتی کا رنگ کچھ نکھر گیا تھا اور وہ پہلے کی بہ نسبت

کچھ تندرست سی نظر آتی تھی' نہیں وہ موٹی ہوگئی تھی۔۔۔ سندرلال نے جو کچھ لاجو کے بارے میں سوچ رکھا تھا وہ سب غلط تھا۔ وہ سمجھتا تھا غم میں گھل جانے کے بعد لاجونتی بالکل مریل ہوچکی ہوگی اور آواز اس کے منہ سے نکالے نہ نکلتی ہوگی۔ اس خیال ہے کہ وہ پاکستان میں بڑی خوش رہی ہے' اسے بڑا صدمہ ہوا' لیکن وہ چپ رہا کیونکہ اس نے چپ رہنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اگرچہ وہ نہ جان پایا کہ اتنی خوش تھی تو پھر چلی کیوں آئی؟ اس نے سوچا شاید ہند سرکار کے دباؤ کی وجہ سے اسے اپنی مرضی کے خلاف یہاں آنا پڑا۔۔۔ لیکن ایک چیز وہ نہ سمجھ سکا کہ لاجونتی کا سنولایا ہوا چہرہ زردی لیے ہوئے تھا اور غم' محض غم سے اس کے بدن کے گوشت نے ہڈیوں کو چھوڑ دیا تھا۔ وہ غم کی کثرت سے موٹی ہوگئی تھی اور صحت مند نظر آتی تھی لیکن یہ ایسی صحت مندی تھی جس میں دو قدم چلنے پر آدمی کا سانس پھول جاتا ہے......

مغویہ کے چہرے پر پہلی نگاہ ڈالنے کا تاثر کچھ عجیب سا ہوا۔ لیکن اس نے سب خیالات کا ایک اثباتی مردانگی سے مقابلہ کیا۔ اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ کسی نے کہا۔۔۔ ''ہم نہیں لیتے مسلمر ان (مسلمان) کی جھوٹی عورت۔۔۔''

اور یہ آواز رسالو نیکی رام اور چوکی کلاں کے بوڑھے محرر کے نعروں میں گم ہوکر رہ گئی۔ ان سب آوازوں سے الگ کالکا پرشاد کی پھٹتی اور چلاتی آواز آرہی تھی۔ وہ سانس بھی لیتا اور بولتا بھی جاتا۔ وہ اس نئی شدھی کا شدت سے قائل ہوچکا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا آج اس نے کوئی نیا وید' کوئی نیا پران اور شاستر پڑھ لیا ہے اور اپنے اس حصول میں دوسروں کو بھی حصے دار بنانا چاہتا ہے...... ان سب لوگوں اور ان کی آوازوں میں گھرے ہوئے لاجو اور سندر لال اپنے ڈیرے کو جارہے تھے اور ایسا جان پڑتا تھا جیسے ہزاروں سال پہلے کے رام چندر اور سیتا کسی بہت لمبے اخلاقی بن باس کے بعد اجودھیا لوٹ رہے ہیں۔ ایک طرف تو لوگ خوشی کے اظہار میں دیپ مالا کررہے ہیں اور دوسری طرف انہیں اتنی لمبی اذیت دیئے جانے پر تاسف بھی۔

لاجونتی کے چلے آنے پر سندرلال بابو نے اسی شدومد سے 'دل میں بساؤ' پروگرام کو جاری رکھا۔ اس نے قول اور فعل دونوں اعتبار سے اسے نبھا دیا تھا۔ اور وہ لوگ جنہیں سندرلال کی باتوں میں خالی خولی جذباتیت نظر آتی تھی' قائل ہونا شروع ہوئے۔ اکثر لوگوں کے دل میں خوشی تھی اور بیشتر کے دل میں افسوس۔ مکان نمبر 414 کی بیوہ کے علاوہ محلہ ملا شکور کی بہت سی عورتیں سندرلال بابو سوشل ورکر کے گھر آنے سے گھبراتی تھیں۔

لیکن سندرلال کو کسی کی اعتنا یا بے اعتنائی کی پروا نہ تھی۔ اس کے دل کی رانی آچکی تھی اور اس کے دل کا خلا پٹ چکا تھا۔ سندرلال نے لاجو کی سورن مورتی کو اپنے دل میں استھاپت کرلیا تھا اور خود دروازے پر بیٹھا اس کی حفاظت کرنے لگا تھا۔ لاجو جو پہلے خوف سے سہمی رہتی تھی سندرلال

کے غیر متوقع نرم سلوک کو دیکھ کر آہستہ آہستہ کھلنے لگی۔

سندرلال لاجونتی کو اب لاجو کے نام سے نہیں پکارتا تھا' وہ اسے کہتا تھا ''دیوی!'' اور لاجو ایک انجانی خوشی سے پاگل ہوجاتی تھی۔ وہ کتنا چاہتی تھی کہ سندرلال کو اپنی واردات کہہ سنائے اور سناتے سناتے اس قدر روئے کہ اس کے سب گناہ دھل جائیں' لیکن سندرلال لاجو کی وہ باتیں سننے سے گریز کرتا تھا اور لاجو اپنے کھل جانے میں بھی ایک طرح سے سمٹی رہتی۔ البتہ جب سندرلال سو جاتا تو اسے دیکھا کرتی اور اپنی اس چوری میں پکڑی جاتی۔ جب سندرلال اس کی وجہ پوچھتا تو وہ ''نہیں''، ''یونہیں''، ''اونہوں'' کے سوا اور کچھ نہ کہتی اور سارے دن کا تھکا ہارا سندرلال پھر اونگھ جاتا ......البتہ شروع شروع میں ایک دفعہ سندرلال نے لاجونتی کے 'سیاہ دنوں' کے بارے میں صرف اتنا سا پوچھا تھا۔

''کون تھا وہ؟''

لاجونتی نے نگاہیں نیچی کرتے ہوئے کہا— ''جماں''— پھر وہ اپنی نگاہیں سندرلال کے چہرے پر جمائے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن سندرلال ایک عجیب سی نظروں سے لاجونتی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے بالوں کو سہلا رہا تھا۔ لاجونتی نے پھر آنکھیں نیچی کرلیں اور سندرلال نے پوچھا۔

''اچھا سلوک کرتا تھا وہ؟''

''ہاں۔''

''مارتا تو نہیں تھا؟''

لاجونتی نے اپنا سر سندرلال کی چھاتی پر سرکاتے ہوئے کہا— ''نہیں......'' اور پھر بولی۔ ''وہ مارتا نہیں تھا۔ پر مجھے اس سے زیادہ ڈر آتا تھا۔ تم مجھے مارتے بھی تھے پر میں تم سے ڈرتی نہیں تھی......اب تو نہ مارو گے؟''

سندرلال کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے اور اس نے بڑی ندامت اور بڑے تاسف سے کہا— ''نہیں دیوی! اب نہیں......نہیں ماروں گا......''

''دیوی!'' لاجونتی نے سوچا اور وہ بھی آنسو بہانے لگی۔

اور اس کے بعد لاجونتی سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی لیکن سندرلال نے کہا— ''جانے دو بیتی باتیں! اس میں تمہارا کیا قصور ہے۔ اس میں قصور ہے ہمارے سماج کا جو تجھ ایسی دیویوں کو اپنے ہاں عزت کی جگہ نہیں دیتا۔ وہ تمہاری ہانی نہیں کرتا اپنی کرتا ہے۔''

اور لاجونتی کی من کی بات من ہی میں رہی۔ وہ کہہ نہ سکی ساری بات اور چپکی دبکی پڑی رہی اور اپنے بدن کی طرف دیکھتی رہی جو کہ بٹوارے کے بعد 'دیوی' کا بدن ہو چکا تھا۔ لاجونتی کا نہ

تھا۔ وہ خوش تھی بہت خوش' لیکن ایک ایسی خوشی میں سرشار جس میں ایک شک تھا اور و
لیٹی اچانک بیٹھ جاتی جیسے انتہائی خوشی کے لمحوں میں کوئی آہٹ پا کر ایکا ایکی اس کی طر
ہو جائے......

جب بہت سے دن بیت گئے تو خوشی کی جگہ پورے شک نے لے لی۔ اس لیے نہیں کہ سندرلال بابو نے پھر وہی پرانی بدسلوکی شروع کر دی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ لاجو سے بہت ہی اچھا سلوک کرنے لگا تھا۔ ایسا سلوک جس کی لاجو متوقع نہ تھی......وہ سندرلال کی وہی پرانی لاجو ہونا چاہتی تھی جو گاجر سے لڑ پڑتی اور مولی سے مان جاتی۔ لیکن اب لڑائی کا سوال ہی نہ تھا۔ سندرلال نے اسے یہ محسوس کرا دیا جیسے وہ ــــ لاجونتی کوئی کانچ کی چیز ہے جو چھوتے ہی ٹوٹ جائے گی اور لاجو آئینے میں اپنے سراپا کی طرف دیکھتی اور آخر اس نتیجے پر پہنچتی کہ وہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے پر لاجو نہیں ہو سکتی۔ وہ بس گئی' پر اجڑ گئی......سندرلال کے پاس اس کے آنسو دیکھنے کے لیے آنکھیں تھیں اور نہ آہیں سننے کے لیے کان!...... پربھات پھیریاں نکلتی رہیں اور محلہ ملا شکور کا سدھارک رسالو اور نیکی رام کے ساتھ مل کر اسی آواز میں گاتا رہا۔

''ہتھ لائیاں کملاں نی لاجونتی دے بوٹے......''

❁ ❁ ❁

دو ہاتھ

رام اوتار لام پر سے واپس آ رہا تھا۔ بوڑھی مہترانی ابا میاں سے چٹھی پڑھوانے آئی تھی۔ رام اوتار کو چھٹی مل گئی۔ جنگ ختم ہو گئی تھی نا! اس لیے رام اوتار تین سال بعد واپس آ رہا تھا۔ بوڑھی مہترانی کی چیپڑ بھری آنکھوں میں آنسو ٹمٹا رہے تھے، مارے شکر گزاری کے وہ دوڑ دوڑ کر سب کے پاؤں چھو رہی تھی۔ جیسے ان پیروں کے مالکوں نے ہی اس کا اکلوتا پوت لام سے زندہ سلامت منگوا لیا۔

بڑھیا پچاس برس کی ہوگی، پر ستر کی معلوم ہوتی تھی۔ دس بارہ کچے پکے بچے جنے۔ ان میں سے بس رام اوتر وا بڑی منتوں، مرادوں سے جیا تھا۔ ابھی اس کی شادی رچائے سال بھر بھی نہیں بیتا تھا کہ رام اوتار کی پکار آ گئی۔ مہترانی نے بہت واویلا مچائی۔ مگر کچھ نہ چلی اور جب رام اوتار وردی پہن کر آخری بار اس کے پیر چھونے آیا تو اس کی شان وشوکت سے بے انتہا مرعوب ہوئی۔ جیسے وہ کرنل ہی تو ہو گیا تھا۔

شاگرد پیشے میں نوکر مسکرا رہے تھے۔ رام اوتار کے آنے کے بعد جو ڈرامہ ہونے کی امید تھی سب اسی پر آس لگائے بیٹھے تھے حالانکہ رام اوتار لام پر توپ، بندوق چھوڑنے نہیں گیا تھا۔ پھر بھی سپاہیوں کا میلا اٹھاتے اٹھاتے اس میں کچھ سپاہیانہ آن بان اور اکڑ پیدا ہو گئی ہوگی۔ بھوری وردی ڈانٹ کر وہ پرانا رام اوتر وا واقعی نہ رہا ہوگا۔ ناممکن ہے وہ گوری کے کرتوت سنے اور اس کا جوان خون ہتک سے کھول نہ اٹھے۔

بیاہ کر آئی ہے تو کیا مسی سی تھی گوری۔ جب تک رام اوتار رہا اس کا گھونگھٹ فٹ بھر لمبا رہا اور کسی نے اس کے رخ پرنور کا جلوہ نہ دیکھا۔ جب خصم گیا تو کیا بلک بلک کر روئی تھی۔ جیسے اس کی مانگ کا سیندور ہمیشہ کے لیے اڑ رہا ہو ــــ تھوڑے دن اداس اداس روئی روئی آنکھیں لیے۔ سر جھکائے میلے کی ٹوکری ڈھوتی پھری۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے گھونگھٹ کی لمبائی کم ہونے لگی۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے یہ سارا بسنت رت کا کیا دھرا ہے۔ کچھ صاف گو کہتے تھے۔ گوری تھی ہی چھنال۔ رام اوتار کے جاتے ہی قیامت ہو گئی۔ کمبخت ہر وقت ہی ہی، ہر وقت اٹھلانا۔ کمر پر

میلے کی ٹوکری لے کر کانسے کے کڑے چھنکاتی جدھر سے نکل جاتی' لوگ بدحواس ہو جاتے۔ دھوبی کے ہاتھ سے صابن کی بٹی پھسل کر حوض میں گر جاتی۔ باورچی کی نظر توے پر سلگتی ہوئی روٹی سے اچٹ جاتی۔ بہشتی کا ڈول کنویں میں ڈوبتا ہی چلا جاتا۔ چپڑاسیوں تک کی بلا لگی پگڑیاں ڈھیلی ہو کر گردن میں جھولنے لگتیں۔ اور جب یہ سراپا قیامت گھونگھٹ میں سے بان پھینکتی گزر جاتی تو پورا شاگرد پیشہ ایک بے جان لاش کی طرح سکتہ میں رہ جاتا۔ پھر ایکدم چونک کر وہ ایک دوسرے کی درگت پر طعنہ زنی کرنے لگتے۔ دھوبن مارے غصے کے کلف کی کونڈی لوٹ دیتی۔ چپڑاسن چھاتی سے چمٹے لونڈے کے بے بات دھموکے جڑنے لگتی اور باورچی کی تیسری بیوی پر ہسٹیریا کا دورہ پڑ جاتا۔

نام کی گوری تھی۔ پر کمبخت سیاہ بہت تھی۔ جیسے الٹے توے پر کسی پھوہڑیا نے پراٹھے تل کر چمکتا ہوا چھوڑ دیا ہو۔ چوڑی پھکنا سی ناک' پھیلا ہوا دہانہ' دانت مانجھنے کا اس کی سات پشت نے فیشن ہی چھوڑ دیا تھا۔ آنکھوں میں پلیوں کا جل تھوپنے کے بعد بھی دائیں آنکھ کا بھینگا پن اوجھل نہ ہو سکا۔ پھر بھی ٹیڑھی آنکھ سے نہ جانے کیسے زہر میں بجھے تیر پھینکتی تھی کہ نشانہ پر بیٹھ ہی جاتے تھے۔ کمر بھی لچک دار نہ تھی۔ خاصی کٹھلا سی تھی۔ جھوٹن کھا کھا کر دنبہ ہو رہی تھی۔ چوڑے بھینس کے سے کھر۔ جدھر سے نکل جاتی کڑوے تیل کی سڑانڈ چھوڑ جاتی۔ ہاں آواز میں بلا کی کوک تھی۔ تیج تیوہار پر لہک کر کجریاں گاتی تو اس کی آواز سب سے اونچی لہراتی چڑھتی چلی جاتی۔

بڑھیا مہترانی' یعنی اس کی ساس کے بیٹے کے جاتے ہی اس سے بے طرح بدگمان ہو گئی بیٹھے بٹھائے احتیاطاً گالیاں دے دیتی۔ اس پر نظر رکھنے کے لیے پیچھے پیچھے پھرتی۔ مگر بڑھیا اب ٹوٹ چکی تھی' چالیس برس میلا ڈھونے اُس کی کمر مستقل طور پر ایک طرف لچک کر وہیں تھم گئی تھی۔ ہماری پرانی مہترانی تھی۔ ہم لوگوں کے آنول نال اُسی نے گاڑے تھے۔ جوں ہی اناں کے درد لگتے۔ مہترانی دہلیز پر آ کر بیٹھ جاتی اور بعض وقت لیڈی ڈاکٹر تک کو نہایت مفید ہدایتیں دیتی۔ بلائیات کو دفع کرنے کے لیے کچھ منتر تعویذ بھی لا کر پٹی سے باندھ دیتی۔ مہترانی کی گھر میں خاصی بزرگانہ حیثیت تھی۔

اتنی لاڈلی مہترانی کی بہو یکایک لوگوں کی آنکھوں میں کانٹا بن گئی۔ چپراسن اور باورچن کی تو بات اور تھی۔ ہماری اچھی بھلی بھاوجوں کا ماتھا اُسے اٹھلاتے دیکھ کر ٹھنک جاتا۔ اگر وہ اس کمرے میں جھاڑو دینے جاتی جس میں اس کے میاں ہوتے تو وہ ہڑبڑا کر دودھ پیتے بچے کے منہ سے چھاتی چھین کر بھاگتیں کہ کہیں وہ ڈائن اُن کے شوہروں پر ٹونا ٹوٹکا نہ کر رہی ہو۔

گوری کیا تھی بس ایک مرکھنا لمبے لمبے سینگوں والا بجار تھا کہ چھوٹا پھرتا تھا۔ لوگ اپنے کانچ کے برتن بھانڈے دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر کلیجے سے لگاتے اور جب حالات نے نازک صورت پکڑ لی تو شاگرد پیشے کی مہیلاؤں کا ایک باقاعدہ وفد اماں کے دربار میں حاضر ہوا۔ بڑے زور

شور سے خطرہ اور اس کے خوفناک نتائج پر بحث ہوئی۔ پتی رکھشا کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جس میں سب بھاوجوں نے شدومد سے ووٹ دیئے اور اماں کو صدر اعزازی کا عہدہ سونپا گیا' ساری خواتین حسب مراتب زمین' پیڑھیوں اور پلنگ کی ادوائن پر بیٹھیں۔ پان کے ٹکڑے تقسیم ہوئے اور بڑھیا کو بلایا گیا۔ نہایت اطمینان سے بچوں کے منہ میں دودھ دے کر سبھا میں خاموشی قائم کی گئی۔ اور مقدمہ پیش ہوا۔

''کیوں ری چڑیل' تو نے بہو قطامہ کو چھوٹ دے رکھی ہے کہ ہمارں چھاتیوں پہ کودوں دے۔ ارادہ کیا ہے تیرا کیا منہ کالا کرائے گی؟''

مہترانی تو بھری ہی بیٹھی تھی پھوٹ پڑی— ''کیا کروں بیگم صاحب حرام کھور کو چار چوٹ کی مار بھی دیئی ہے تو۔ روٹی بھی کھانے کو نا دیئی۔ پر رانڈ میرے تو بس کی نہیں۔''

''ارے روٹی کی کیا کمی ہے اُسے''— باورچی نے اینٹا پھینکا۔ سہار نپور کی خاندانی باورچن اور پھر تیسری بیوی— کیا تیہا تھا کہ اللہ کی پناہ! پھر چپراسن ٹالن اور دھوبن نے مقدمہ کو اور سنگین بنا دیا۔ بیچاری مہترانی بیٹھی سب کی لتاڑ سنتی اور اپنی خارش زدہ پنڈلیاں کھجلاتی رہی۔

بیگم صاحب آپ جیسی بتاؤ دیسے کرنے سے موئے نا تھوڑیئی۔ پر کا کروں کا رانڈ کا ٹینٹوا دبائے دیوں— ''ٹینٹوا دبنے کے حسین خیال سے مہیلاؤں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی اور سب کو بڑھیا سے بے انتہا ہمدردی پیدا ہوگئی۔ اماں نے رائے دی— ''موئی کو میکے پھنکوا دے۔''

''اے بیگم صاحب' کہیں ایسا ہو سکے ہے؟'' مہترانی نے بتایا کہ بہو مفت ہاتھ نہیں آئی ہے۔ ساری عمر کی کمائی پورے دو سو جھونکے ہیں تب مسٹنڈی ہاتھ آئی ہے۔ اتنے پیسوں میں تو دو گائیں آ جاتیں۔ مزے سے بھر کلسی دودھ دیتیں۔ پر یہ رانڈ تو دولتیاں ہی دیتی ہے۔ اگر اسے میکے بھیج دیا گیا تو اس کا باپ اسے فوراً دوسرے مہتر کے ہاتھ بیچ دے گا۔ بہو صرف بیٹے کے بستر کی زینت ہی تو نہیں' دو ہاتھوں والی ہے پر چار آدمیوں کا کام نپٹاتی ہے۔ رام اوتار کے جانے کے بعد بڑھیا سے اتنا کام کہاں سنبھلتا۔ یہ بڑھاپا تو اب بہو کے دو ہاتھوں کے صدقے میں بیت رہا ہے۔

مہیلائیں کوئی نا سمجھ نہ تھیں۔ معاملہ اخلاقیات سے ہٹ کر اقتصادیات پر آ گیا تھا۔ واقعی بہو کا وجود بڑھیا کے لیے لازمی تھا۔ دو سو روپے کا مال کس کا دل ہے کہ پھینک دے۔ ان دو سو کے علاوہ بیاہ پر جو بنئے سے لے کر خرچ کیا تھا' ججمان کھلائے تھے۔ برادری کو راضی کیا تھا۔ یہ سارا خرچہ کہاں سے آئے گا۔ رام اوتار کی جو تنخواہ ملتی تھی۔ وہ ساری اُدھار میں ڈوب جاتی تھی۔ ایسی موٹی تازی بہو اب تو چار سو سے کم میں نہ ملے گی' پوری کوٹھی کی صفائی کے بعد اور آس پاس کی چار کوٹھیاں نمٹاتی ہے۔ رانڈ کام میں چوکس ہے ویسے۔

پھر بھی اماں نے الٹی میٹم دے دیا کہ ''اگر اس لچی کا جلد از جلد کوئی انتظام نہ کیا گیا تو

کوٹھی کے احاطہ میں نہیں رہنے دیا جائے گا۔"

بڑھیا نے بہت واویلا مچایا اور جا کر بہو کو منہ بھر بھر کر گالیاں دیں۔ جھونٹے پکڑ کر مارا پیٹا بھی۔ بہو اس کی زر خرید تھی۔ پیٹتی رہی، بڑبڑاتی رہی اور دوسرے دن انتقاماً سارے عملے کی دھجیاں بکھیر دیں۔ باورچی، بہشتی، دھوبی اور چپراسیوں نے تو اپنی بیویوں کی مرمت کی۔ یہاں تک کہ بہو کے معاملہ پر میری مہذب بھابیوں اور شریف بھائیوں میں بھی کھٹ پٹ ہو گئی۔ اور بھابیوں کے میکے تار جانے لگے۔ غرض بہو ہرے بھرے خاندان کے لیے سُئی کا کانٹا بن گئی۔

مگر دو چار دن کے بعد بوڑھی مہترانی کے دیور کا لڑکا رتی رام اپنی تائی سے ملنے آیا۔ اور پھر وہیں رہ پڑا۔ دو چار کوٹھیوں میں کام بڑھ گیا تھا سو وہ بھی اُس نے سنبھال لیا۔ اپنے گاؤں میں آوارہ ہی تو گھومتا تھا۔ اس کی بہو ابھی نابالغ تھی۔ اس لیے گونا نہیں ہوا تھا۔

رتی رام کے آتے ہی موسم ایک دم لوٹ پوٹ کر بالکل ہی بدل گیا۔ جیسے گھنگھور گھٹائیں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ تتر بتر ہو گئیں۔ بہو کے قہقہے خاموش ہو گئے۔ کانسے کے کڑے گونگے ہو گئے۔ اور جیسے غبارے سے ہوا نکل جائے تو وہ چپ چاپ جھولنے لگتا ہے۔ ایسے بہو کا گھونگھٹ جھولتے جھولتے نیچے کی طرف بڑھنے لگا۔ اب وہ بجائے بے نتھے بیل کی نہایت شرمیلی بہو بن گئی۔ جملہ مہیلاؤں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسٹاف کے مردوے اسے چھیڑتے بھی تو وہ چھوئی موئی کی طرح لجا جاتی اور زیادہ آنکھ دکھاتے تو وہ گھونگھٹ میں سے بھینگی آنکھ کو اور ترچھا کر کے رتی رام کی طرف دیکھتی جو فوراً بازو کھجلاتا سامنے آ کر ڈٹ جاتا۔ بڑھیا پرسکون انداز میں دہلیز پر بیٹھی ادھ کھلی آنکھوں سے یہ طربیہ ڈرامہ دیکھتی اور گڑگڑی پیا کرتی۔ چاروں طرف ٹھنڈا ٹھنڈا سکون چھا گیا جیسے پھوڑے کا مواد نکل گیا ہو۔

مگر اب کے بہو کے خلاف ایک نیا محاذ قائم ہو گیا اور وہ عملے کی مرد جاتی پر مشتمل تھا۔ بات بے بات باورچی جو اُسے پراٹھے تل کر دیا کرتا تھا کونڈی صاف نہ کرنے پر گالیاں دینے لگا۔ دھوبی کو شکایت تھی کہ وہ کلف لگا کر کپڑے رسی پر ڈالتا ہے۔ یہ حرامزادی خاک اُڑانے آ جاتی ہے۔ چپراسی مردانے میں دس دس مرتبہ جھاڑو دلواتے پھر بھی وہاں کی غلاظت کا رونا روتے رہتے۔ بہشتی جو اس کے ہاتھ دھلانے کے لیے کئی مشکیں لیے تیار رہتا تھا، اب گھنٹوں صحن میں چھڑکاؤ کرنے کو کہتی۔ مگر ٹالتا رہتا تاکہ وہ سوکھی زمین پر جھاڑو دے تو چپراسی گرد اڑانے کے جرم میں اسے گالیاں دے سکے۔

مگر بہو سر جھکائے سب کی ڈانٹ پھٹکار ایک کان سنتی دوسرے کان اُڑا دیتی۔ نہ جانے ساس سے کیا جا کر کہہ دیتی کہ وہ کائیں کائیں کر کے سب کا بھیجا چاٹنے لگتی۔ اب اس کی نظر میں بہو نہایت پارسا اور نیک ہو چکی تھی۔ پھر ایک دن داڑھی والے داروغہ جو تمام نوکروں کے سردار تھے اور ابا کے خاص مشیر سمجھے جاتے تھے۔ ابا کے حضور میں دست بستہ حاضر ہوئے۔ اور اس بھیانک بدمعاشی

اور غلاظت کا رونا رونے لگے جو بہو اور رتی رام کے ناجائز تعلقات سے سارے شاگرد پیشے کو گندہ کر رہی تھی۔ ابا نے معاملہ سیشن کے سپرد کر دیا۔ یعنی اماں کو پکڑا دیا۔ مہیلاؤں کی سبھا پھر سے چھڑی اور بڑھیا کو بلا کر اُس کے لتے لیے گئے۔

''اری نگوڑی خبر بھی ہے یہ تیری بہو قطامہ کیا گل کھلا رہی ہے؟''

مہترانی نے ایسے چندھرا کر دیکھا جیسے کچھ نہیں سمجھتی غریب کہ کس کا ذکر ہو رہا ہے' اور جب اسے صاف صاف بتایا گیا کہ چشم دید گواہوں کا کہنا ہے کہ بہو اور رتی رام کے تعلقات نازیبا حد تک خراب ہو چکے ہیں۔ دونوں بہت ہی قابلِ اعتراض حالتوں میں پکڑے گئے ہیں تو اس پر بڑھیا بجائے اپنی بہتری چاہنے والوں کا شکریہ ادا کرنے کے بہت چراغ پا ہوئی۔ بڑی واویلا مچانے لگی کہ رام اوتر وا ہوتا تو ان لوگوں کی خبر لیتا جو اس کی معصوم بہو پر تہمت لگاتے ہیں۔ بہو نگوڑی تو اب چپ چاپ رام اوتار کی یاد میں آنسو بہایا کرتی ہے۔ کام کاج بھی جان توڑ کرتی ہے۔ کسی کو شکایت نہیں ہوتی۔ ٹھٹول بھی نہیں کرتی ہے۔ لوگ اس کے ناحق دشمن ہو گئے ہیں۔ بہت سمجھایا مگر وہ ماتم کرنے لگی کہ ساری دنیا اُس کی جان کی لاگو ہو گئی ہے۔ آخر بڑھیا اور اُس معصوم بہو نے لوگوں کا کیا بگاڑا ہے۔ وہ تو کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ وہ تو سب کی راز دار ہے۔ آج تک اُس نے کسی کا بھانڈا نہیں پھوڑا۔ اُسے کیا ضرورت جو کسی کے پھٹے میں پیر اڑاتی پھرے۔ کوٹھیوں کے پچھواڑے کیا نہیں ہوتا؟ مہترانی سے کسی کا میلا نہیں چھپتا۔ ان بوڑھے ہاتھوں نے بڑے لوگوں کے گناہ دفن کیے ہیں۔ یہ دو ہاتھ چاہیں تو رانیوں کے تخت اُلٹ دیں۔ پر نہیں اُسے کسی سے بغض نہیں۔ اگر اس کے گلے پر چھری دبائی گئی تو شاید غلطی ہو جائے ویسے وہ کسی کے راز اپنے بوڑھے کلیجے سے باہر نہیں نکلنے دے گی۔

اس تیہا دیکھ کر فوراً چھری دبانے والوں کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے۔ ساری مہیلائیں اُس کی پچ کرنے لگیں۔ بہو کچھ بھی کرتی تھی اُن کے اپنے قلعے تو محفوظ تھے۔ تو پھر شکایت کیسی؟ پھر کچھ دن کے لیے بہو کے عشق کا چرچا کم ہونے لگا۔ لوگ کچھ بھولنے لگے۔ مگر تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ بہو کا بھاری بھرکم جسم بھی دال کے کالے کو زیادہ دن نہ چھپا سکا۔ اور لوگ شدومد سے بڑھیا کو سمجھانے لگے۔ مگر اس نئے موضوع پر بڑھیا بالکل اڑن گھائیاں بتانے لگی۔ بالکل ایسی بن جاتی جیسے ایک دم اونچا سننے لگی ہے۔ اب وہ زیادہ تر کھاٹ پر لیٹی بہو اور رتی رام پر حکم چلایا کرتی۔ کبھی کھانستی چھینکتی باہر دھوپ میں آ بیٹھتی تو وہ دونوں اُس کی ایسی دیکھ ریکھ کرتے جیسے وہ کوئی پٹ رانی ہو۔

بھلی بیویوں نے اُسے بہت سمجھایا۔ رتی رام کا منہ کالا کر۔ اور اس سے پہلے کہ رام اوتار لوٹ کر آئے بہو کا علاج کروا ڈال۔ وہ خود اس فن میں ماہر تھی۔ دو دن میں صفائی ہو سکتی ہے۔ مگر بڑھیا نے کچھ سمجھ کر ہی نہ دیا۔ بالکل ادھر ادھر کی شکایتیں کرنے لگی کہ اُس کے گھٹنوں میں پہلے سے

زیادہ اینٹھن ہوتی ہے۔ نیز کوٹھیوں میں لوگ بہت ہی زیادہ بادی چیزیں کھانے لگے ہیں۔ کسی نہ کسی کوٹھی میں دست لگے ہی رہتے ہیں۔ اس کی ٹال مٹول پر ناصحین جل کر مرنڈ ہو گئے۔ مانا کہ بہو عورت ذات ہے' نادان ہے' بھولی — بڑی بڑی شریف زادیوں سے خطا ہو جاتی ہے۔ لیکن اُن کی اعلیٰ خاندان کی معزز ساسیں یوں کان میں تیل ڈال کر نہیں بیٹھ جاتیں۔ پر نہ جانے یہ بڑھیا کیوں سٹھیا گئی تھی۔ جس بلا کو وہ بڑی آسانی سے کوٹھی کے کواڑے کی تہہ میں دفن کر سکتی تھی اُسے آنکھیں میچے پلنے دے رہی تھی۔

رام اوتر وا کے آنے کا انتظار تھا۔ ہر وقت دھمکیاں تو دیتی رہتی تھی۔ ''آن دے رام' اوتر وا کو۔ کہاں گئی توری ہڈی پسلی ایک کر دیہیئے — '' اور اب رام اوتر وا لام سے زندہ واپس آ رہا تھا۔ فضا نے سانس روک لی تھی۔ لوگ ایک مہیب ہنگامے کے منتظر تھے۔

مگر لوگوں کو سخت کوفت ہوئی جب بہو نے لونڈا جنا' بجائے اُسے زہر دینے کے بڑھیا کی مارے خوشی کے باچھیں کھل گئیں۔ رام اوتار کے جانے کے دو سال بعد پوتا ہونے پر قطعی متعجب نہ تھی۔ گھر گھر پھٹے پرانے کپڑے اور بدھائی سیمنٹی پھری۔ اس کا بھلا چاہنے والوں نے اُسے حساب لگا کر بہت سمجھایا۔ کہ یہ لونڈا اوتار کا ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر بڑھیا نے قطعی سمجھ کر نہ دیا۔ اس کا کہنا تھا' اساڑھ میں رام اوتار لام پہ گیا۔ جب بڑھیا پیلی کوٹھی کے نئے انگریزی وضع کے سنڈاس میں گر پڑی تھی اب چیت لگ رہا ہے اور جیٹھ کے مہینے میں بڑھیا کو لُو لگی تھی مگر بال بال بچ گئی تھی۔ جبھی سے اس کے گھٹنوں کا درد بڑھ گیا — ''ویدجی پورے حرامی ہیں۔ دوا میں کھریا ملا کر دیتے ہیں''۔ اس کے بعد وہ بالکل اصل سوال سے ہٹ کر خیلاؤں کی طرح اول فول بکنے لگتی۔ کس کے دماغ میں اتنا بوتا تھا کہ وہ اس کائیاں بڑھیا کو سمجھاتا جسے نہ سمجھنے کا وہ فیصلہ کر چکی تھی۔

لونڈا پیدا ہوا تو اُس نے رام اوتار کو چھٹی لکھوائی۔ ''رام اوتار کو بعد چما پیار کے معلوم ہو کہ یہاں سب کشل ہیں اور تمہاری کشلتا بھگوان سے نیک چاہتے ہیں اور تمہارے گھر میں پوت پیدا ہوا ہے۔ سوئم اس خط کو تار سمجھو اور جلدی سے آ جاؤ۔''

لوگ سمجھتے تھے کہ رام اوتار ضرور چراغ پا ہوگا۔ مگر سب کی امیدوں پر اوس پڑ گئی جب رام اوتار کا مسرت سے لبریز خط آیا کہ وہ لونڈے کے لیے موزے اور بنیائن لا رہا ہے۔ جنگ ختم ہو گئی اور اب بس وہ آنے ہی والا تھا۔ بڑھیا پوتے کو گھٹنے پر لٹائے کھاٹ پر بیٹھی راج کیا کرتی۔ بھلا اس سے زیادہ حسین بڑھاپا کیا ہوگا کہ ساری کوٹھیوں کا کام ٹُرت پھرت ہو رہا ہو۔ مہاجن کا سود پابندی سے چک رہا ہو اور گھٹنے پر پوتا سو رہا ہو۔

خیر لوگوں نے سوچا' رام اوتار آئے گا' اصلیت معلوم ہو گی تب دیکھ لیا جائے گا۔ اور اب رام اوتار جنگ جیت کر آ رہا تھا۔ آخر کو سپاہی ہے' کیوں نہ خون کھولے گا۔ لوگوں کے دل دھڑک

رہے تھے۔ شاگرد پیشے کی فضا جو بہو کو تو تا چشمی کی وجہ سے سوگئی تھی' دو چار خون ہونے اور ناکیں کٹنے کی آس میں جاگ اٹھی۔

لونڈا سال بھر کا ہوگا جب رام اوتار لوٹا۔ شاگرد پیشے میں کھلبلی مچ گئی۔ باورچی نے ہانڈی میں ڈھیر سا پانی جھونک دیا تاکہ اطمینان سے مچیٹے کا لطف اٹھائے۔ دھوبی نے کلف کا برتن اتار کر منڈیر پر رکھ دیا اور بہشتی نے ڈول کنویں کے پاس پٹک دیا۔

رام اوتار کو دیکھتے ہی بڑھیا اُس کی کمر سے لپٹ کر چنگھاڑنے لگی۔ مگر دوسرے لمحے کھیسیں کاڑھے لونڈے کو رام اوتار کی گود میں دے کر ایسے ہنسنے لگی جیسے کبھی روئی ہی نہ ہو۔

رام اوتار لونڈے کو دیکھ کر ایسے شرمانے لگا جیسے وہی اس کا باپ ہو۔ جھٹ پٹ اُس نے صندوق کھول کر سامان نکالنا شروع کیا۔ لوگ سمجھے کھکری یا چاقو نکال رہا ہے۔ مگر جب اس نے اس میں سے لال بنیائن اور پیلے موزے نکالے تو سارے عملے کی قوت مردانہ پر ضرب کاری لگی۔ ہت تری کی' سالا سپاہی بنتا ہے ہیجڑا زمانے بھر کا۔

اور بہو! سمٹی سمٹائی جیسے نئی نویلی دلہن' کانسی کی تھالی میں پانی بھر کر رام اوتار کے بدبودار فوجی بوٹ اتارے اور چرن دھو کر پیئے۔

لوگوں نے رام اوتار کو سمجھایا۔ پھبتیاں کسیں' اُسے گاوَدی کہا۔ مگر وہ گاوَدی کی طرح کھیسیں کاڑھے ہنستا رہا۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو' رتی رام کو گونا ہونے والا تھا' سو وہ چلا گیا۔

رام اوتار کی اس حرکت پر تعجب سے زیادہ لوگوں کو غصہ آیا۔ ہمارے ابا جو عام طور پر نوکروں کی باتوں میں دلچسپی نہیں لیا کرتے تھے وہ بھی جزبز ہو گئے۔ اپنی ساری قانون دانی کا داوٗ لگا کر رام اوتار کو قائل کرنے پر تُل گئے۔

''کیوں بے' تو تین سال بعد لوٹا ہے نا؟''

''معلوم نہیں حجور' تھوڑا کم جیادہ...... اتنا ہی رہا ہوگا۔''

''اور تیرا لونڈا سال بھر کا ہے۔''

''اِتنا ہی لگے ہے سرکار' پر بڑا بدماس ہے سسرا''۔ رام اوتار شرمائے۔

''ابے تو حساب لگا لے۔''

''حساب؟...... کیا لگاوٗں سرکار''۔ رام اوتار نے مرگھلی آواز میں کہا۔

''اُلو کے پٹھے یہ کیسے ہوا۔''

''اب ہم جانوں سرکار...... بھگوان کی دین ہے۔''

''بھگوان کی دین! تیرا سر...... یہ لونڈا تیرا نہیں ہوسکتا۔''

ابا نے اُسے چاروں اُور سے گھیر کر قائل کرنا چاہا کہ لونڈا حرامی ہے۔ تو وہ کچھ کچھ قائل سا

ہو گیا۔ پھر مری ہوئی آواز میں احمقوں کی طرح بولا۔

''تو اب کیا کروں سرکار...... حرامجادی کو میں نے بڑی ماردی''۔ وہ غصے سے بپھر کر بولا۔

''ابے نرا اُلو کا پٹھا ہے تو...... نکال باہر کیوں نہیں کرتا کمبخت کو۔''

''نہیں سرکار' کہیں ایسا ہوئے سکے ہے۔ رام اوتار گھگھیانے لگا۔''

''کیوں بے؟''

''حجور' ڈھائی تین سو پھر دوسری سگائی کے لیے کاں سے لاؤں گا اور برادری جمانے میں سو دو سو الگ کھرچ ہو جائیں گے۔''

''کیوں بے' تجھے برادری کیوں کھلانی پڑے گی؟ بہو کی بدمعاشی کا تاوان تجھے کیوں بھگتنا پڑے گا؟''

''جے میں نہ جانوں سرکار' ہمارے میں ایسا ہی ہووے ہے۔''

''مگر لونڈا تیرا نہیں رام اوتار...... اس حرامی رتی رام کا ہے''۔ ابا نے عاجز آ کر سمجھایا۔

''تو کا ہوا سرکار...... میرا بھائی ہوتا ہے رتی رام۔ کوئی گیر نہیں' اپنا ہی کھون ہے۔''

''نرا اُلو کا پٹھا ہے'' ابا پھنا اٹھے۔

''سرکار' لونڈا بڑا ہو جاوے گا' اپنا کام سمیٹے گا''۔ رام اوتار نے گڑگڑا کر سمجھایا۔ ''وہ دو ہاتھ لگائے گا' سو اپنا بڑھاپا تیر ہو جائے گا''۔ ندامت سے رام اوتار کا سر جھک گیا۔

اور نہ جانے کیوں' ایک دم رام اوتار کے ساتھ ابا کا سر بھی جھک گیا۔ جیسے ان کے ذہن پر لاکھوں کروڑوں ہاتھ چھا گئے...... یہ ہاتھ حرامی ہیں نہ حلالی۔ یہ تو بس جیتے جاگتے ہاتھ ہیں جو دنیا کے چہرے سے غلاظت دھو رہے ہیں۔ اس کے بڑھاپے کا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔

یہ ننھے منے مٹی میں لتھڑے ہوئے سیاہ ہاتھ دھرتی کی مانگ میں سیندور سجا رہے ہیں۔

❀ ❀ ❀

دیوندر ستیارتھی

اَنّ دیوتا

''تب اَنّ دیوٗ برہما کے پاس رہتا تھا۔ ایک دن برہما نے کہا۔ اور بھلے دیوتا! دھرتی پر کیوں نہیں چلا جاتا؟''۔

ان الفاظ کے ساتھ چنتو نے اپنی دل پسند کہانی شروع کی۔ گونڈوں کو ایسی بیسیوں کہانیاں یاد ہیں۔ وہ جنگل کے آدمی ہیں اور ٹھیک جنگل کے درختوں کی طرح ان کی جڑیں دھرتی میں گہری چلی گئی ہیں۔ مگر وہ غریب ہیں' بھوک کے پیدائشی عادی' چنتو کو دیکھ کر مجھے یہ گمان ہوا کہ وہ بھی ایک دیوتا ہے جو دھرتی کے باسیوں کو اَنّ دیو کی کہانی سنانے کے لیے آنکلا ہے۔ گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ الاؤ کی روشنی میں بغل کی پگڈنڈی کسی جوان گونڈن کی مانگ معلوم ہوتی تھی۔ گھوم پھر کر میری نگاہ چنتو کے جھریوں والے چہرے پر جم جاتی۔

کہانی جاری رہی ــــ

دیوتا دھرتی پر کھڑا تھا۔ پر وہ بہت اونچا تھا۔ بارہ آدمی ایک دوسرے کے کندھوں پر کھڑے ہوتے' تب جا کر وہ اُس کے سر کو چھو سکتے۔

ایک دن برہما نے سندیس بھیجا۔ یہ تو بہت کٹھن ہے' بھلے دیوتا! تجھے چھوٹا ہونا ہوگا۔ آدمی کا آرام تو دیکھنا ہوگا۔

''دیوتا آدھا رہ گیا۔ پر برہما کی تسلی نہ ہوئی۔ آدمی کی مشکل اب بھی پوری طرح حل نہ ہوئی تھی۔ اُس نے پھر سندیس بھیجا اور دیوتا ایک چوتھائی رہ گیا۔ اب صرف تین آدمی ایک دوسرے کے کندھوں پر کھڑے ہو کر اس کے سر کو چھو سکتے تھے۔

پھر آدمی خود بولا۔ ''تم اب بھی اونچے ہو' میرے دیوتا!''

''اَنّ دیو اور بھی چھوٹا ہو گیا۔ اب وہ آدمی کے سینے تک آنے لگا۔ پھر جب وہ کمر تک رہ گیا تو آدمی بہت خوش ہوا۔

اُس کے جسم سے بالیں پھوٹ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ سونے کا پیڑ کھڑا ہے۔

''آدمی نے اُسے جھنجھوڑا اور بالیں دھرتی پر آگریں۔''

میں نے سوچا اور سب دیوتاؤں کے مندر ہیں۔ مگر اَنّ دیوٗ وہ کھیتوں کا قدیمی سر پرست کھلے کھیتوں میں رہتا ہے' جہاں ہر سال دھان اُگتا ہے نئے دانوں میں دودھ پیدا ہوتا ہے۔ ماں ہونے والی چھوکری کی چھاتیوں کی طرح۔

ہلدی بولی۔''اب تو دیوتا دھرتی کے بیچوں بیچ کہیں پاتال کی طرف چلا گیا ہے۔''

چنتو نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ ایسا بھیانک کال اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔ دھرتی اس طرح بنجر ہوگئی تھی' جیسے عورت بانجھ ہو جائے یا کسی ننھے کی ماں کی چھاتی سوکھ جائے۔

ہلدی پھر بولی۔''اور دیوتاؤں کی طرح اَنّ دیو بھی بہرہ ہو گیا ہے۔''

چنتو نے پوچھا۔''پر اَنّ دیو کیوں بہرہ ہو گیا؟''

''یہ میں مورکھ کیا جانوں؟ پر بہرہ تو وہ ہو ہی گیا ہے۔''

سال کے سال ہلدی اَنّ دیو کی منت مانتی تھی۔ ایک ہلدی پر ہی بس نہیں' ہر ایک گونڈ عورت یہ منت ماننا ضروری سمجھتی ہے۔ مگر اس سال دیوتا نے ایک نہ سنی۔ کس بات نے دیوتا کو ناراض کر دیا؟ غصہ تو اور دیوتاؤں کو بھی آتا ہے مگر اَنّ دیو کو تو غصہ نہیں کرنا چاہیے۔

ہلدی کی گود میں تین ماہ کا بچہ تھا۔ میں نے اُسے اپنی گود میں لے لیا۔ اس کا رنگ اپنے باپ سے کم سانولا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے تازہ پہاڑی شہد کا رنگ یاد آ رہا تھا۔

ہلدی بولی''ہائے! اَنّ دیو نے میری کوکھ ہری کی اور وہ بھی بھوک میں اور لاچاری میں۔''

بچہ مسکراتا تو ہلدی کو یہ خیال آتا کہ دیوتا اُس کی آنکھوں میں اپنی مسکراہٹ ڈال رہا ہے۔ پر اس کا مطلب؟ دیوتا مذاق تو نہیں کرتا؟ پھر اُس کے دل میں غصہ بھڑک اٹھتا۔ دیوتا آدمی کو بھوکوں بھی مارتا ہے اور مذاق اڑا کر اس کا دل بھی جلاتا ہے۔

چنتو بولا:''سچ جانو تو اب مجھے اَنّ دیو پر وشواس ہی نہیں رہا۔ اور اس کی کہانی جو میں آج کی طرح سَو سَو بار سنا چکا ہوں' اب مجھے نری گپ معلوم ہوتی ہے۔''

ہلدی یہ نہ جانتی تھی کہ چنتو کا طنز بہت حد تک سطحی ہے۔ یہ تو وہ خود بھی سمجھنے لگی تھی۔ کہ دیوتا روز روز کے پاپ ناٹک سے ناراض ہو گیا ہے۔

''ان دیو کو نہیں مانتے پر بھگوان کو تو مانو گے۔''

میرا دل تو تیرے بھگوان کو بھی نہ مانے۔ مردود بھگوان' کہاں ہیں اس کے میگھ راج؟ اور کہاں سو رہا ہے وہ خود؟ ایک بوند بھی تو نہیں برستی!''

''دیوتا سے ڈرنا چاہیے اور بھگوان سے بھی۔''

چنتو نے سنبھل کر جواب دیا''ضرور ڈرنا چاہیے۔ ہاہا ہی ہی...... اور اب تک ہم

ڈرتے ہی رہے ہیں!''

''اب آئے نا سیدھے رستے پر۔ جب میں چھوٹی تھی ماں نے کہا تھا دیوتا کے غصہ سے سدا بچیو!''

اری کہا تو میری ماں نے بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ پر کب تلک لگا رہے گا یہ ڈر ہلدی؟''

دیوتا پھر خوش ہوگا اور پھر لہرائے گا وہی پیارا پیارا دھان؟

کال میں پیدا ہوئے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے میں سوچنے لگا۔''اتنا بڑا پاپ کیا ہوگا کہ اتنا بڑا دیوتا بھی آدمی کو چھماں نہیں کر سکتا!''

کال نے ہلدی کی ساری سندرتا چھین لی تھی۔ چنتو بھی اب اپنی بہار کو بھول رہا تھا...... درخت اب بھی کھڑا تھا مگر ٹہنیاں پرانی ہوگئی تھیں اور نئی کونپلیں نظر نہیں آتی تھیں۔

ہلدی نے مجھے بتایا کہ اُس کی چلبلاہٹ اور اس کے ہنس ہنس کر باتیں کرنے کے انداز نے چنتو کو اس کی طرف متوجہ کیا تھا۔ تب وہ جوان تھی' ایک مست ہرنی' اس کی ناک موٹی اور نتھنے بھی کم چوڑے نہ تھے۔ پر جب وہ اچھلتی کودتی ایک کھیت سے دوسرے کھیت میں نکل گئی' اور چنتو نے اسے دیکھا تو اُس کے دل میں بھی ایک ہرن جاگ اٹھا۔ وہ بھی دوڑنے لگا۔ ایک روز وہ اس کے پیچھے بھاگ نکلا تو وہ پیپل کے پیڑ تلے کھڑی ہوگئی۔ کھیتوں میں دھان لہلہا رہا تھا۔ پیار کی طرح جو دل میں اُگتا ہے۔ پہلے وہ کچھ کچھ ڈری۔ پھر وہ مسکرانے لگی۔ جب چنتو نے اپنی انگلیوں سے اُس کے بال سلجھانے شروع کیے اور بیاہ کی بات چھیڑی تو ہلدی نے سہمی ہوئی آواز سے کہا تھا'' اَنّ دیو ہمیں دیکھ رہا ہے۔ پہلے اس کا دھیان کر لو۔ پھر بیاہ کا نام لینا''۔ ہلدی کا خیال تھا کہ دیوتا دھان کے پودوں میں چھپا بیٹھا ہے' اور ان کا پیار اس نے دیکھ لیا ہے۔ جب چنتو نے ریشم کے کیڑوں کا گیت گایا تھا تو ہلدی نے یہ محسوس کیا تھا کہ چنتو بھی ایسا ہی ایک کیڑا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کیڑے بیاہ نہیں کرتے' صرف پیار کرتے ہیں۔ ہلدی کے اَنّ دیو کی سوگند کھا کر اپنی سچائی کا یقین دلایا تھا اور چنتو نے کہا تھا۔''تم ضرور بول کر سچی رہو گی' ہلدی! ہلدی اَنّ دیو کی سوگند بہت بڑی سوگند ہوتی ہے۔''

ہلدی کا بچہ میری گود میں رونے لگا۔ اُسے لیتے ہوئے اُس نے سہمی ہوئی نگاہ سے اپنے خاوند کی طرف دیکھا۔ بولی''یہ کل کب جائے گا؟''

جب ہم مر جائیں گے اور نہ جانے یہ تب بھی نہ جائے۔''

''یہ کتکی اور کودوں دھان کی طرح پانی نہیں مانگتے۔ یہ بھی نہ اگے ہوتے تو ہم کبھی کے بھوک سے مر گئے ہوتے......انہوں نے ہماری لاج رکھ لی...... ہماری بھی ہمارے دیوتا کی بھی۔''

دیوتا کا بس چلتا تو انہیں بھی اگنے سے روک دیتا...... پاپی دیوتا!''

''ایسا بول نہ بولو۔ پاپ ہوگا۔''

''نہ نہ' پاپ سے ڈرو' اور دیوتا کے غصہ سے بھی۔''

میں نے بیچ بچاؤ کرتے ہوئے کہا ''دوش تو سب آدمی کا ہے۔ دیوتا تو سدا نردوش ہوتا ہے۔''

رات غمزدہ عورت کی طرح پڑی تھی۔ دور سے کسی خونی درندے کی دھاڑ گونجی۔ چنتو بولا: ''ان بھوکے شیروں اور ریچھوں کو اَن دیو مل جائے تو وہ اسے کچا ہی کھا جائیں۔''

بیساکھوں کے گھر روپے آئے تو ہلدی اسے بدھائی دینے آئی۔ ''بتپا میں پچیس بھی پانچ سو ہیں راموسدا سکھی رہے۔''

''اَنّ دیو سے راموہی اچھا نکلا'' بیساکھوں نے فرمائشی قہقہہ لگا کر کہا۔

چنتو بولا: ''ارے یار چھوڑ اس اَنّ دیو کی بات...... اَنّ دیو' َن دیو۔''

ہلدی نے اپنے خاوند کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس طنز سے اسے چڑ تھی۔ دیوتا کتنا بھی برا کیوں نہ ہو جائے۔ آدمی کو تو اپنا دل ٹھیک رکھنا چاہیے' اپنا بول سنبھالنا چاہیے۔''

غصے میں جلی بھنی ہلدی اپنی جھونپڑی کی طرف چل دی۔ بیساکھو نے پھر قہقہہ لگایا۔ واہ بھئی واہ۔ رانڈ اب بھی اَنّ دیو کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔''

چنتو بولا: ''جپنے دو اسے اَنّ دیو کی مالا ہم تو کبھی نہ مانیں ایسے پاپی دیوتا کو۔''

''تو سچ کہتا ہے چنتو' دیو پاپی ہو گیا ہے۔''

رامو بمبئی میں تھا۔ چنتو سوچنے لگا۔ کاش اس کا بھی کوئی بھائی وہاں ہوتا اور پچیس روپے نہیں تو پانچ ہی بھیج دیتا۔

بیساکھو نے پوسٹ مین کو ایک دونی دے دی تھی۔ مگر اسے اس بات کا افسوس ہی رہا۔ بار بار وہ اپنی نقدی گنتا اور ہر بار دیکھتا کہ اس کے پاس چوبیس روپے چودہ آنے ہیں' پچیس روپے نہیں۔

جھونپڑی میں واپس آیا تو چنتو نے ہلدی کی بیہوش پایا۔ اس نے اسے جھنجھوڑا۔ رسوئی کی بھی فکر ہے۔ اب سو نہیں' ہلدی۔ دوپہر تو ڈھل گئی......''

اُس وقت اگر خود اَنّ دیو بھی اسے جھنجھوڑتا تو ہوش میں آنے کے لیے اسے کچھ دیر ضرور لگتی۔

تھوڑی دیر بعد ہلدی نے اپنے سرہانے بیٹھے خاوند کی طرف گھور کر دیکھا۔ چنتو بولا: ''آگ جلاؤ' ہلدی!...... دیکھتی نہیں ہو بھوک سے جان نکلی جا رہی ہے۔''

''پکاؤ اپنا سر؟''

چنتو نے ڈرتے ڈرتے سات آنے ہلدی کی ہتھیلی پر رکھ دیئے اور اس کے چہرے کی

طرف دیکھ کر بولا: ''یہ بیسا کھو نے دیئے ہیں، ہلدی، اور میں سچ کہتا ہوں میں نے اس سے مانگے نہ تھے۔''

ہلدی شک بھری نگاہوں سے چنتو کی طرف دیکھنے لگی۔ کیا آدمی غریبی میں اتنا ہی گر جاتا ہے؟ مگر چنتو — چہرے سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس نے مانگنے کی ذلیل حرکت نہیں کی تھی اور پھر جب ایک ایک کر کے سب کے سب پیسے گنے تو اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں ...... چار روز دال بھات کا خرچ اور چل جائے گا۔

''شکر ہے۔ اَنّ دیو کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔''

''اَنّ دیو کا یا بیسا کھو کا؟''

اَنّ دیو کا جس نے بیسا کھو بھائی کے دل میں یہ پریم بھاؤ پیدا کیا۔''

چنتو کا چہرہ دیکھ کر ہلدی کو سوکھے پتے کا دھیان آیا جو ٹہنی سے لگا رہنا چاہتا ہو۔ دور ایک بدلی کی طرف دیکھتی ہوئی بولی؟ ''کاش! بوندا باندی ہی ہو جائے۔ اناتھ چھوکری کے آنسوؤں کی طرح — '' مگر تیز ہوا بدلی کو اڑا لے گئی۔ اور دھرتی بارش کے لیے برابر ترستی رہی۔

کال نے زندگی کا سب لطف برباد کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا دھرتی رو دے گی۔ مگر آنسوؤں سے تو سوکھے دھانوں کو پانی نہیں ملتا۔ اَنّ دیو کو یہ شرارت کیسے سوجھی؟ مان لیا کہ وہ خود کسی وجہ سے کسانوں پر ناراض ہو گیا ہے مگر بادلوں کا تو کسانوں نے کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ وہ کیوں نہیں گھر آتے؟ کیوں نہیں برستے؟ کاش وہ دیوتا کی طرف داری کرنے سے انکار کر دیں۔

چار ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔

اُس روز یہاں دو تین سو گونڈ جمع ہوئے۔ بھڈے صاحب اور منشی جی دھان بانٹ رہے تھے۔ اپنے حصے کا دھان پا کر ہر کوئی دیوتا کی جے مناتا — اَنّ دیو کی جے ہو۔

چنتو گاؤں کی پنچایت کا دایاں بازو تھا۔ دھان بانٹنے میں وہ مدد دے رہا تھا لوگ اس کی طرف احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھتے اور وہ محسوس کرتا کہ وہ بھی ایک ضروری آدمی ہے۔ مگر لوگ دیوتا کی جے جے کار کیوں مناتے ہیں؟ کہاں ہے وہ مردود اَنّ دیو؟ ...... وہ خود بھی شاید دیوتا ہے...... اور شاید اَنّ دیو سے کہیں......''

ہلدی نے سوچا کہ یہ دھان شاید اَنّ دیو نے بھیجا ہے۔ اسے دکھیارے گونڈوں کا خیال تو ضرور ہے۔ مگر جب اس نے بھڈے صاحب اور منشی جی کو حلوا اڑاتے دیکھا تو وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ حلوے کا خیال اب آگے نہ بڑھے۔ پر یہ خیال بادل کی طرح اس کے ذہن پر پھیلتا چلا گیا۔

قحط سبھا سے ملا ہوا دھان کتنے دن چلتا؟

چنتو کے چہرے پر موت کی دھندلی پرچھائیاں نظر آتی تھیں‘ مگر وہ دیوتا سے نہ ڈرتا تھا کبھی کبھی گھنٹوں غیر شعوری طور پر دیوتا کو گالیاں دیا کرتا۔ میں نے سمجھا کہ وہ پاگل ہو چلا ہے۔ دو چار بار میں نے اسے روکا بھی۔ مگر یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ وہ دیوتا کو اپنے دل سے نکال دینا چاہتا تھا‘ مگر دیوتا کی جڑیں اس کے جذبوں میں گہری چلی گئی تھیں۔

چنتو کی گالیاں سن کر لوگوں کو ایک خاص طرح کی خوشی ہوتی۔ وہ محسوس کرتے کہ ان کا ہے جو بہت ضروری ہے۔ انّ دیوا اگر کچھ بھی دم رکھتا ہے تو چنتو کو مار دے گا یا پھر پہلی طرح ٹھیک ہو کر ان کا دوست بن جائے گا۔ گونڈوں کو اتنی دیوتا کی ضرورت نہیں جتنی‘ ایک دوست کی —— وہ دیوتا کیا جو گھر کا آدمی نہ بن جائے!

ایک دن چنتو بہت سویرے اٹھ بیٹھا اور بولا: ”دیوتا اب دھنوانوں کا ہو گیا ہے...... مردود...... پاپی دیوتا! اری میں تو نہ مانوں ایسے نیچ دیوتا کو۔“

”پر نہیں‘ میرے پتی دیوتا تو سب کا ہے۔“

”سب کا ہے —— اری پگلی‘ یہ سب گیان جھوٹا ہے۔“

”پر دیوتا تو جھوٹا نہیں۔“

”تو کیا وہ بہت سچا ہے؟ سچا ہے تو برکھا کیوں نہیں ہوتی؟“

”دیوتا کو برا کہنے سے دوس ہوتا ہے۔“

”ہزار بار ہو...... دھورت دیوتا! لے سن لیا؟ وہ اب ہمارے کھیتوں میں کیوں آئے گا؟ وہ دھنوانوں کی پوری کچوری کھانے لگا ہے۔ نردھن گونڈوں کی اب اسے کیا پروا ہے؟“

چنتو کی نکتہ چینی ہلدی کے من میں غم گھول رہی تھی۔ اس نے جھونپڑی کی دیوار سے ٹیک لگائی اور دھیرے دھیرے اچھے وقتوں کو یاد کرنے لگی‘ جب بھوک کا بھیانک منہ کبھی اتنا کھلا تھا۔ وہ خوشی پھر لوٹے گی‘ دیوتا پھر کھیتوں میں آئے گا۔ اس کی مسکراہٹ پھر نئے دانوں میں دودھ بھر دے گی۔ اس کے من میں عجب کشمکش جاری تھی۔ دیوتا!...... پاپی۔“ ......نہیں تو...... نیچ؟ نہیں تو وہ باہر چلا گیا تو کیا ہوا۔ کبھی تو اسے دیا آئے گی ہی۔

ہلدی سنبھل کر بولی: ”سچ مانو میرے پتی‘ دیوتا پھر آئے گا یہاں......“

چنتو کا بول اور بھی تیکھا ہو گیا۔ ”اری اب بس بھی کر‘ میری رانڈ‘ تیرا دیوتا کوئی سانپ تھوڑی ہے کہ تیری بین سن کر بھاگا چلا آئے گا؟“

اس دن رامو بمبئی سے لوٹ آیا۔ اسے دیکھ کر ہلدی کی آنکھوں کو ایک ہی زبان مل گئی بولی: ”سناؤ‘ رامو بھائی‘ بمبئی میں دیوتا کو تو تم نے دیکھا ہوگا۔“

رامو خاموش رہا۔

میرا خیال تھا کہ رامو نے بمبئی میں مزدور سبھا کی تقریریں سن رکھی ہوں گی اور وہ صاف صاف کہہ دے گا کہ دیوتا دیوتا کچھ نہیں ہوتا۔ اَن آدمی آپ اُپجاتا ہے اپنے لہو سے' اپنے پسینے سے۔ اگر آدمی' آدمی کا لہو چوسنا چھوڑ دے تو آج ہی سنسار کی کایا پلٹ جائے۔ کال تو پہلے سے پڑتے آئے ہیں۔ بڑے بڑے بھیانک کال۔ مگر اب سرمایہ دار روز روز کسانوں اور مزدوروں کا لہو چوستے ہیں اور غریبوں کے لیے اب سدا ہی کال پڑا رہتا ہے۔ اور یہ کال دیوتا کے چھومنتر سے نہیں جانے کا۔ اس کے لیے تو سارے سماج کو جھنجھوڑنے کی ضرورت ہے۔

ہلدی پھر بولی: ''رامو بھائی! چپ کیوں سادھ لی تم نے؟ ...... ہمیں کچھ بتا دو گے تو تمہاری ودّیا تو نہ گھٹ جائے گی۔ بمبئی میں تو بہت برکھا ہوتی ہوگی۔ پانی سے بھری کالی اودی بدلیاں گھر آتی ہوں گی ...... اور بجلی چمکتی ہوگی ان بدلیوں میں رامو! ...... اور وہاں بمبئی میں دیوتا کو رتی بھر کشٹ نہ ہوگا......''

رامو کے چہرے پر مسکراہٹ پیدا ہونے کے فوراً بعد کسی قدر سنجیدگی میں بدل گئی۔ وہ بولا: ''ہاں' ہلدی! اَن دیو اب بمبئی کے محلوں میں رہتا ہے ...... روپوں میں کھیلتا ہے ...... بمبئی میں' ہلدی کچھ نہ بولی۔ شاید وہ ان دنوں کے متعلق سوچنے لگی جب ریل ادھر آ نکلی تھی اور اَن دیو پہلی گاڑی سے بمبئی چلا گیا تھا۔

آنسو کی ایک بوند' جو ہلدی کی آنکھ میں اٹکی ہوئی تھی' اس کے گال پر ٹپک پڑی۔ پرے آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔ میں نے کہا: ''آج ضرور دھرتی پر پانی برسے گا۔''

ہلدی خاموشی سے اپنے بچے کو تھپکنے لگی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ کیا ہوا اگر دیوتا کو وہاں سندر رانڈیں مل جاتیں ہیں۔ کبھی تو اسے گھر کی یاد ستائے گی ہی اور پھر وہ آپ ہی آپ ادھر چلا آئے گا۔

❁ ❁ ❁

بلونت سنگھ

کٹھن ڈگریا

رکھی چند دکان سے واپس آ رہا تھا۔ صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس وقت کوئی مزے دار بات سوچ رہا ہے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ چلتے چلتے جب اسے سگریٹ جلانے کی خواہش محسوس ہوئی تو اسے خیال آیا کہ ماچس تو دکان ہی پر رہ گئی ہے۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ اب وہ گھر کے قریب پہنچ چکا ہے۔ وہ اپنی دھن میں اس قدر مگن تھا کہ اسے سگریٹ منہ سے نکالنے کا خیال تک نہ آیا۔ کسی راہ گیر کی نظر اس کے ڈھیلے ڈھالے۔ ہونٹوں میں پھنسے ہوئے سگریٹ پر جا پڑتی تو وہ بے اختیار مسکرا دیتا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ خود بخود مسکرائے جا رہا تھا۔ کبھی سر کو حرکت دینے لگتا۔ کبھی زیرلب کچھ کہنے لگتا۔ وہ بالکل پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا تھا۔ لیکن وہ پاگل نہیں تھا۔ چونتیس پینتیس برس کے قریب عمر، صورت بھی بری نہیں تھی۔ صحت بھی کافی اچھی تھی۔ تین بچوں کا باپ تھا۔ اعلیٰ پیمانے پر ریڈیو کی دکان چلا رہا تھا۔ گیارہ بجے دکان پر جاتا۔ اس کا معاون پہلے ہی سے موجود ہوتا تھا۔ ایک سے دو بجے تک لنچ کے لیے دکان بند کر دی جاتی۔ شام کے پانچ بجے کے قریب وہ گھر چلا آتا۔ البتہ دکان سات بجے تک کھلی رہتی۔ آج کاروبار کے سلسلے میں ایک شخص کو ملنے کے لیے اسے دہلی جانا تھا۔ اس نے اپنی بیوی شانتا کو سامان تیار کرنے کے لیے بھی کہہ دیا تھا۔ لیکن اچانک دکان پر اسے تار ملا کہ کل وہ شخص خود لاہور پہنچ رہا ہے۔ چلو سفر کی مصیبت سے جان چھوٹی۔ لیکن آج شام کا پروگرام کیا ہو؟ یہ سوال خواہ مخواہ اس کے ذہن پر ابھر آیا اور وہ چند لمحوں تک بے سبب اس فکر میں غلطاں رہا اور پھر دل کی پکار خود بخود واضح ہوگئی کہ یہ شام اپنے دوست بیج ناتھ کے ہاں گزاری جائے بلکہ رات کا کھانا بھی وہیں کھایا جائے۔

کچھ روز سے بیج ناتھ کی بیوی کامنی اس کے لیے خاص کشش کا باعث بنی ہوئی تھی۔ یہ بات اخلاق سے گری ہوئی ضرور تھی لیکن وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ جوانی کے زمانے میں وہ حد سے زیادہ شرمیلا بنا رہا۔ زندگی کا سنہرا زمانہ کسی سے محبت کی پینگیں بڑھائے بغیر گزر گیا۔ جب شادی ہوئی تو چند سال تک وہ بیوی کا دیوانہ سا رہا۔ مگر رفتہ رفتہ بیوی میں کوئی کشش باقی نہ رہی۔ جب کبھی بیوی آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی تو بس ہاتھ بڑھانے کی دیر تھی۔ وہاں انکار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ رفتہ

رفتہ اپنی بیوی بے رس معلوم ہونے لگی۔ اس نے بازار کا رخ کیا۔ وہاں دلال یہی کہتا کہ بس صاحب ہفتے بھر ہی سے بازار میں بیٹھنے لگی ہے۔ پہلے پہل تو یہ خیال ہی کچھ کم لذت انگیز نہیں تھا لیکن جب دلالوں کے ہتھکنڈوں کا علم ہوا تو طبیعت بجھ گئی۔ دنیا کا دھندا تو چلتا رہا لیکن محبت کی پیاس کے مارے دل میں ہر دم کانٹا سا کھٹکنے لگا۔

گزشتہ دنوں اتوار کے روز وہ اپنے مکان کے سامنے چبوترے پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا کہ اس نے بیج ناتھ کو کامنی کے ہمراہ اپنے قریب آتے دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہونے پر بیج ناتھ نے کہا۔ ''ہم اجنبی ہیں۔ مکان کی تلاش کر رہے ہیں۔ کیا آپ ہماری مدد کرسکیں گے؟

یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ اس نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اُسے مکان دلوا دیا۔ اگرچہ ان کے مکانوں کے درمیان میں کم فاصلہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود دونوں گھرانوں کے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ ایک دوسرے کے ہاں جانا تقریبات میں شرکت کرنا کبھی کبھار تفریح کی غرض سے شہر سے باہر چلے جانا اُن کے معمول میں داخل ہو گیا تھا۔

ایسے موقعوں پر کامنی اس کی طرف نگاہِ غلط انداز سے دیکھ لیتی۔ پہلی مرتبہ تو اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سمجھا کہ اُس کی نگاہوں نے دھوکا کھایا ہے۔ لیکن جب دبی دبی مسکراہٹوں کا تبادلہ بھی ہونے لگا تو اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ ایک دوسرے سے محبت بھی کرسکیں گے۔ کبھی کبھی اس کا دل لعن طعن بھی کرتا لیکن پھر وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر ڈھارس دے لیتا کہ کامنی کی ہی طرف سے تو آغاز ہوا ہے۔ کبھی سوچتا' معمولی دل لگی ہی تو ہے' ذرا کی ذرا چہل ہو جاتی ہے۔ دل بہلا رہتا ہے اس میں قباحت کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ لیکن یہ سب ظاہر داریاں تھیں کیوں کہ دل کی گہرائیوں میں وہ اچھی طرح محسوس کرنے لگا تھا کہ اسے کامنی سے محبت ہو گئی ہے۔

راستہ چلتے چلتے وہ کامنی کی بابت سوچ رہا تھا۔ ابھی تک اس نے اسے چھوا تک نہیں۔ شاید آج کوئی اہم واقعہ پیش آئے۔ ممکن ہے کہ وہ اس پہلی محبوبہ کے بہت قریب پہنچ جائے۔ اب وہ اپنی گلی میں پہنچ چکا تھا۔ جیا پنواڑی کی دکان اس کے مکان کے قریب ہی تھی۔ دکان کے قریب سے ہو کر گزرتے وقت سلگتی رسی دیکھ کر اسے سگریٹ سلگانے کا خیال آیا۔ اگر کوئی دوست اسے ملنے کے لیے آتا تو گھر والوں کو خبر ہو یا نہ ہو لیکن جیا ضرور اس بات کا خیال رکھتا تھا چنانچہ سگریٹ سلگا کر اس نے جیا سے پوچھا ''کیوں بے جیے! مجھے کوئی شخص ملنے کے لیے تو نہیں آیا تھا؟''

اس وقت جیا نسوار سونگھ رہا تھا۔ چھینک آنے ہی کو تھی۔ اس لیے منہ سے جواب نہ دے سکا۔ کبھی اثبات میں سر ہلاتا کبھی نفی میں آخر معلوم ہوا کہ کوئی شخص نہیں آیا تھا۔ رکھی نے سگریٹ کا کش کھینچا اور گھر کی طرف بڑھا۔ دروازے کے آگے جو تین سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں' ان کی دو اینٹیں اکھڑ گئی تھیں' ہر دم اُن پر سے پھسلنے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا۔ اسے کئی مرتبہ خیال آیا کہ ان کی مرمت

کروادی جائے لیکن لاپروائی میں یہ کام پورا نہ ہو سکا۔

گھر کے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ شانتا بڑے آئینے کے سامنے بیٹھی بال بنا رہی ہے۔ معلوم ہوتا تھا' ابھی ابھی نہا کر آئی ہے اس وقت خاصی پیاری دکھائی دے رہی تھی اس کے دوست کہا کرتے ''یار تمہاری عورت تو بہت حسین ہے۔ پھر بازاروں میں اِدھر اُدھر دھکے کھانے کیوں پھرتے ہو؟''

شانتا نے بال ایک ہاتھ سے گھما کر آگے لائے اور ان پر کنگھی کرتے ہوئے کہا: ''جی میں نے آپ کا سامان تیار کر دیا ہے۔''

''بھئی آج تو میں نہیں جاؤں گا۔''

''کیوں؟'' شانتا نے تعجب سے آنکھیں پھیلا کر پوچھا

''جس شخص سے ملنا تھا وہ خود کل یہاں آرہا ہے۔ نل بند تو نہیں ہوا؟ ذرا نہالوں۔''

وہ غسل خانے میں چلا گیا اور وہاں ''کا کروں بُو سے الفت ہوگئی...... ہوگئی'' گاتا رہا جب کپڑے پہن چکا تو بیوی نے پوچھا۔ آپ کھانا کھا کر ہی باہر جایئے گا؟''

''نہیں بھئی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ایک شخص سے ملنا ہے۔ کھانا باہر ہی کھاؤں گا۔ انتظار میں مت بیٹھی رہنا۔

حالانکہ اس کی بیوی کو اس پر کسی قسم کا شک نہیں تھا لیکن اس نے بیج ناتھ کے گھر کا نام جان بوجھ کر نہیں لیا آخر کیا فائدہ؟ عورتیں وہمی تو ہوتی ہی ہیں۔ آئینے کے سامنے کھڑے کھڑے اس نے اپنی عورت کا جائزہ لیا اور اس نے خود ہی فیصلہ لیا کہ اس کی صورت بیج ناتھ سے کہیں بہتر ہے اور اگر کامنی اسے اپنے شوہر پر ترجیح دیتی ہے تو اسے اس کی خوش ذوقی کا ثبوت سمجھنا چاہیے۔

خوب بن سنور کر اس نے اپنے آپ پر آخری نگاہ ڈالی۔ کوٹ کی اوپر والی جیب میں رنگین رومال ٹھکانے سے رکھا رخساروں پر ہاتھ پھیر کر ان کی ہمواری کا جائزہ لیا۔ ٹائی کی گرہ درست کی۔ پتلون کی کریز پہلو بدل بدل کر دیکھی۔ ہیٹ پر جمی ہوئی گرد کی باریک تہہ چٹکی بجا بجا کر صاف کی۔ چاندی کا سگریٹ کیس جیب میں ڈالتے ہوئے اس نے ایک نظر بیوی کی طرف دیکھا۔ آج وہ واقعی حسین دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں لڑکے نانا کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں بیوی کو پیار کرنے میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ لیکن وہ جلدی میں تھا اس لیے چھڑی گھماتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا کہ اگر وہ سگریٹ کیس میں عبداللہ کے سگریٹ رکھ لیتا تو بہتر ہوتا۔ وہ ''عبداللہ'' سگریٹوں کا بڑا مداح تھا اور انہیں خصوصاً اس وقت پیتا تھا جب وہ خوش ہو۔ اب سگریٹ لینے کے لیے واپس جانے میں اس نے بدشگونی سمجھی۔ اس لیے کوے یار ہی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

اس کا دل مسرور تھا۔ قدم بڑے بانکپن سے اُٹھ رہے تھے۔ اِردگرد کی چیزیں اُجلی اور نئی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ جیسے ہر چیز نے نیا جنم لیا ہو۔ اس میں چمک تھی اور حرکات سے چلبلا پن عیاں تھا۔ اپنی بیوی اور گھر سے دور وہ اپنے آپ کو آزاد پرندے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کرر ہا تھا۔ وہ کالج کے اس چھوکرے کے مانند دکھائی دے رہا تھا جو گھر سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہو اور اب والدین کے روپے سے عشق لڑا رہا ہو۔ محض عورت کی حیثیت اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی وہ تو محبت کا بھوکا تھا' دردِ عشق کا خواہاں تھا۔ اصل چیز تو وہ جذبہ ٔ یگانگی تھا جو وہ کمو کے لیے محسوس کررہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کامنی کو پیار سے کمو کہا کرتا تھا۔ اس کی یہی ایک تمنا تھی کہ اگر ان کی محبت پروان چڑھے اور دونوں کے دھڑکتے ہوئے سینے کسی روز مل جائیں تو وہ اسے پیاری کمو کہہ کر بلائے کبھی کبھی جب وتصورات کے طلسم سے نکلتا تو سوچتا کیا معلوم اس کے نصیب میں حسین کامنی کی محض مسکراہٹ ہی لکھی ہو؟''

آخر شام کے دُھندلکے میں جب بیج ناتھ کا بلا پلستر کی اینٹوں کا بنا ہوا مکان نظر آنے لگا تو اُس کے قدم ڈگمگانے لگے۔ یہاں تک وہ ایک مبہم لیکن مسحور کن جذبے کے ماتحت چلا آیا تھا۔ لیکن اب وہ سوچنے لگا کہ اسے ان کے گھر میں کس انداز سے داخل ہونا چاہیے؟ اس مسئلے کے کئی پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ان معاملات پر زیادہ تجویزیں سوچنے کی ضرورت نہیں۔ ہر حرکت بے تکلفانہ ہونی چاہیے۔ چنانچہ وہ بڑی بے تکلفی سے ان کے گھر کے اندر داخل ہوگیا۔

بڑے کمرے سے میاں بیوی کے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رکھی دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ بیج ناتھ پاؤں پھیلائے کرسی کے بازو پر بیٹھا تھا۔ اس نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شاید وہ باہر جانے کی تیاری کررہا تھا۔ کامنی اس کی قمیص میں بٹن ٹانک رہی تھی اور وہ گا رہا تھا۔ بیوی بگڑ رہی تھی: ''اب ذرا گانا بند کردیجئے نا۔ سوئی چھاتی میں اتر جائے گی تو پھر نہ کہیئے گا۔

شوہر مسخرے پن سے بولا: ''تم سے نہیں کہیں گے تو کس سے کہیں گے مائی ڈارلنگ! اور ہمارا کون ہے۔'' اور پھر وہ نہایت بھونڈے انداز میں نتھنے پھلا پھلا کر شکستہ بانس کی سی آواز میں ایک فرسودہ سا گانا گانے لگا۔

''تیرا کون ہے۔''
کسے کرتا تو پیار پیار پیار۔
''تیرا کون ہے...... تیرا کون ہے...... ہاں تیرا کون ہے۔''

اُدھر میاں بیوی میں یہ چہلیں ہو رہی تھیں۔ اِدھر چھ ماں کا بچہ پالنے میں پڑا رو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بیج ناتھ اس وقت بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ جوں جوں بیوی اس کی حرکات سے چڑتی توں توں وہ اسے اور زیادہ پریشان کیے جاتا۔ وہ جھنجھلا کر کہتی: ''اب مٹکنا بند کیجئے' منا رو رہا ہے۔''

رکھی رام دو قدم آگے بڑھا اور اس نے کھانس کر انہیں اپنی آمد سے مطلع کر دیا۔ بیج ناتھ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ پہلے تو حیران رہ گیا پھر چلایا: ''ہلو ہلو! یار! میرا خیال تھا' اب تک تم گاڑی میں بیٹھے ہو گے۔''

رکھی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے جواب دیا: ''نہیں بھئی' دہلی جانے کا پروگرام منسوخ ہو گیا ہے۔ کرپا رام سے ملنا تھا اس کا تار آیا ہے کہ کل وہ خود لاہور پہنچ رہا ہے۔''

اتنے میں کامنی نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کر دی: ''جی نمستے!''

اس نے بڑی معصومیت اور اخلاق سے جواب دیا۔

منا رو رہا تھا۔ کامنی اسے پیار سے پالنے میں سے اٹھا کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی:

''منا کیوں رو رہا ہے؟ ہمارا منا کیوں رو رہا ہے؟ نا' نا...... کیوں جی آپ کی منی بھی رو رہی تھی؟''

''جی نہیں''۔ رکھی نے جواب دیا: ''ہماری منی تو سوئی پڑی تھی۔ آج کل ہمارے گھر میں بچوں کا شور بہت کم ہوتا ہے۔ گوشی اور جیو دونوں نانا کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ بچے ہیں نا نئی جگہ کا دل بھی بہلا ہوا ہے۔ گھر میں بچاری منی ہے' سو چپ چاپ پڑی رہتی ہے۔''

''نا جی نا ہمارا منا بھی تو نہیں روتا''۔ کامنی نے بچے کو پچکارتے ہوئے کہا۔ ''آج تو اس کے بابو جی نے اسے رلا رلا کر ہلکان کر دیا ہے۔ میں ان کے بٹن ٹانک رہی تھی اور یہ ہل ہل کر گائے جاتے تھے۔ منا جاگ اٹھا اور رونے لگا۔

جب وہ باتیں کر رہی تھی تو رکھی اس کے لچکیلے جسم اور تیزی سے ہلتے ہوئے ہونٹوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اس وقت سج دھج کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا لیکن معمولی گھریلو لباس میں بھی وہ کس قدر حسین دکھائی دے رہی تھی۔ اور پھر دفعتاً جو اسے کچھ خیال آیا تو بیج ناتھ سے مخاطب ہو کر بولا: ''یار معلوم ہوتا ہے کہ تم باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں تو یوں ہی ادھر چلا آیا۔ اگر تم کسی کام سے جا رہے تھے تو چلو۔''

''نہیں یار بیٹھو' باتیں کریں۔''

نہیں بھئی' مجھ سے یہ نہ ہو گا۔''

کامنی نے بچے کو گود میں جھلاتے ہوئے کہا: ''آج ان کی دعوت ہے کہیں۔''

''واقعی' بھئی واہ۔ اب تو میں تمہارا راستہ نہیں روکنا چاہتا۔ ضرور جاؤ' تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

''نہیں' اب میں نہیں جاؤں گا۔ تم اتنی دور سے آئے ہو' اب تو مل کر باتیں کریں گے۔ اور ہاں' جیلانی کے ہاں برج کھیلنے کیوں نہ چلیں؟''

لیکن رکھی کو اپنی حرکت بہت نامناسب معلوم ہو رہی تھی۔ ''بیج ناتھ اپنا پروگرام خراب

مت کرو۔ میں تو یونہی چلا آیا تھا۔ بس اب سیر کرتے ہوئے گھر چلا جاؤں گا۔ یہ ذرا بدتمیزی کی بات ہے کہ میری وجہ سے تمہارا میزبان پریشان ہو اور پھر ہم دونوں میں تکلف بھی تو نہ ہونا چاہیے۔''

بیج ناتھ چند لمحوں تک چپ رہا پھر بولا: ''اتنی دور سے آئے ہم دونوں کا وقت خوب کٹ سکتا ہے۔ ہاں یار' ایک اور بات سوجھی ہے مجھے' یہیں بیٹھو اور میں ذرا کھانا کھا کر زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کے اندر واپس آ جاؤں گا۔ میری واپسی تک تم کھانا بھی یہیں کھا لو گے اور پھر ہم جیلانی کے ہاں چلیں گے۔ بڑا مزے کا شخص ہے' گپ بھی اڑے گی اور برج بھی کھیلے گی۔''

رکھی کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ رہا۔ ایک گھنٹے کے لیے وہ اور کامنی تنہا رہ جائیں گے۔ گودی کا منا تو سو ہی جائے گا اس سے بڑا چار سالہ لڑکا بھی سلایا جا سکے گا۔ اس نے تیزی سے اچٹتی ہوئی نگاہ کامنی پر ڈالی۔ گونا گوں جذبات کے ہجوم میں وہ کچھ نہ بول سکا۔ بیج ناتھ کہتا چلا گیا: ''کہو یار کیسی رہی؟ بھئی کہیں جانا نہیں۔ تمہیں میرے سر کی قسم! میں بہت دور نہیں جا رہا ہوں یہی اپنے ڈاکٹر شرما کے ہاں تو دعوت ہے۔ تم شاید نہیں جانتے انہیں۔ تمہارے راستے ہی میں تو مکان پڑتا ہے۔ اچھا تو وعدہ کرو' تم نہیں جاؤ گے۔ یہ نہ ہو کہ میں بھاگم بھاگ واپس پہنچوں اور تم غائب ہو جاؤ۔ بس آج شاندار پروگرام رہے گا۔''

رکھی چپ کھڑا رہا۔ بھلا وہ کہاں جا سکتا تھا؟ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ تقدیر بھی اس قدر' اچھی ہو سکتی ہے۔ وہ ایک موہوم سے امید پر یہاں آیا تھا۔ ادھر بھگوان نے بھگت کی پرارتھنا قبول کر کے خود اپنے ہاتھ سے اس کے راستے کا کانٹا صاف کر دیا تھا۔

''لو یہ رہے سگریٹ اور رہا ویکلی۔ کمو! انہیں روٹی کھلا دینا۔ ذرا خیال رکھنا' بھاگ نہ جائیں کہیں۔ میں چٹکی بجاتے میں آیا۔''

یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی پتلون کے بٹن لگانے لگا۔ برش سے بال ہموار کیے' ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر کے اگلا پلو نیچے اوپر کیا۔ پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر والے دروازے کی طرف بڑھا۔ کامنی پکار کر بولی: ''ہائے کیسے بھاگے جا رہے ہیں۔ گھر سے باہر جانا ہو تو پاؤں زمین پر لگتے ہی نہیں' اب جلدی لوٹ آیئے گا۔''

''ہاں بھئی' لوٹ آؤں گا۔ لوگ ہمارا ایندھن اٹھا اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس کی فکر کیا کرو۔ ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر لو۔ اچھا یار میں چلا۔''

ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے کامنی بیٹھک کی کھڑکی کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر شوہر سے آنکھیں چار ہوئیں شوہر نے ہوا میں ہاتھ بلند کر کے ہلا دیا۔ وہ وہاں چپ کھڑی اسے گلی کی نکڑ سے غائب ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس اثنا میں رکھی بھی چپکے سے دیوار سے لگ کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا تھا۔ کچھ دیر تک کامنی سنسان گلی کی جانب دیکھتی رہی۔ پھر اس کا ہاتھ اوپر اٹھ کر بجلی

کے بٹن کی طرف بڑھا اور دوسرے لمحے میں بجلی کا بلب بجھ گیا۔ اور فرش پر بچھی ہوئی دری پر کھڑکی میں آتی ہوئی چاندنی پھیل گئی۔

رکھی نے بازو بڑھایا جو کامنی کے پیٹ سے ہوتا ہوا اس کے گوشت سے بھرپور کولہے پر جا کر ٹک گیا۔ کامنی کی کمر ذرا سی لرزش کے بعد ساکن ہو گئی۔ وہ اور قریب ہو کر اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ ان دونوں کی آنکھیں چار نہیں ہوئیں۔ لیکن کامنی کی کمر نے ہلکی سی لرزش کے بعد سکون اختیار کر کے گویا اس کے سوال کا جواب اثبات میں دے دیا تھا۔

وہ خاموش کھڑی تھی۔ دو ایک مرتبہ رکھی کے لبوں سے نکلتی ہوئی دردِ محبت میں ڈوبی ہوئی نہایت مدہم سے آواز سنائی دی: ''کمو کمو''

''بی بی جی! بی' بی' جی!'' بڑے لڑکے کی پکار سنائی دی۔

وہ بلند آواز میں بولی: ''آئی بیٹا! آئی' بیٹھے رہو وہیں''۔ رکھی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ ذرا پرے سرک گئی۔ ''سنو کمو سنو'' اس کی آواز بری سرح لرز رہی تھی۔

کامنی دو قدم پرے دیوار سے پیٹھ لگائے دونوں ہتھیلیاں دیوار پر ٹکائے سر نیہوڑائے کھڑی تھی۔ کمرے کی فضا خواب ناک تھی' ہر طرف سرمئی غبار سا چھایا ہوا تھا۔ کامنی کی مدہم شبیہہ حسین مجسمے کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ صرف اس کی چھاتیوں کے زیروزبر سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بے جان مورت نہیں ہے۔ ''کمو! سنو میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

''میں تم سے محبت کرتا ہوں! کیسے فرسودہ الفاظ تھے؟ جنہیں اس نے بیسیوں مرتبہ کتابوں میں پڑھا تھا' فلم کے پردے پر سنا تھا لیکن آج وہ فقرہ اس طرح ادا کر رہا تھا جیسے یہ اسی کی اختراع ہو۔

جواب میں کامنی نے پلکیں اوپر اٹھائیں اور ایک مرتبہ بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر سپردگی کے انداز میں پلکیں جھکا کر رہ گئی۔ وہ بجلی کے کوندے کی طرح آگے بڑھا۔ اس کی کمر بازوؤں میں لے کر اسے اپنی طرف کھینچا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے پھولوں کی نازک ڈالی پکڑ کے جھنجھنا دی ہو۔ اس کا جسم سر سے پاؤں تک کامنی کے نرم اور لچکیلے جسم کے لمس سے محظوظ ہونے لگا۔ ایک اور شدید اور فوری جذبے کے تحت اس نے نہ معلوم کس کس طرح اسے بھینچا' چوما اور پھر لڑکے کی پکار کی آوازیں ہتھوڑوں کے دھمکوں کی طرح سنائی دینے لگیں اور پھر کامنی اڑتی ہوئی خوشبو کی طرح اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

وہ کمرے میں تن تنہا کھڑا رہ گیا۔ کھڑکیوں میں داخل ہونے والی چاند کی روشنی میں کرسیاں' تپائیاں' تصویریں' پردے اور کتابیں' غرض ہر شے خواب ناک اور ساکن دکھائی دے رہی تھی۔ صرف اس کی ٹانگیں اور بازو لرزاں تھے۔ سانس تیزی سے چل رہی تھی غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے چند غیر مبہم سی آوازیں نکل گئیں۔ کچھ دیر تک وہ خلا میں گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ ایک مرتبہ احساسِ گناہ کی

شدت سے کانپ بھی اٹھا لیکن صرف ایک لمحے کے لیے' پھر اس نے رومال سے منہ اور پیشانی صاف کی' کپڑوں کی سلوٹیں اور کوٹ کی جھول کھائی ہوئی آستینیں کھینچ کر ہموار کیں۔ پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا صحن میں باورچی خانے کی جانب بڑھا۔ کامنی چولہے کے قریب بیٹھی دیگچی میں چمچ چلا رہی تھی اس کا بڑا لڑکا اس کے گھٹنے کے ساتھ لگا ہوا اونگھ رہا تھا۔ وہ چولہے میں لپلپاتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں کامنی کے دمکتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ باہمی کشمکش میں کامنی کے بال پریشان ہو گئے تھے' گال سرخ ہو گئے تھے' قمیض دو تین مقامات سے مسک گئی تھی۔ یہ سب اسی کی دست درازیوں کے نتائج تھے۔ اس خیال سے سے وہ ایک نئی لذت کے احساس میں گم ہو گیا۔

بظاہر کامنی اس کی آمد سے بے خبر دکھائی دیتی تھی۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہی۔ بچے کو اونگھتا ہوا دیکھ کر اس نے کہا: ''چلو تمہیں سُلا دوں''۔ اور اسے سلانے کے لیے اندر چلی گئی۔

رکھی چولہے کے قریب ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وہ دل ہی دل میں حالات کا جائزہ لینے لگا۔ کامنی پھر چولہے کے قریب آ بیٹھی۔ اس کی حرکات سے کسی غیر معمولی واقعے کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ دیگچی چولہے سے اتار کر اس نے توا رکھ دیا۔ اور آٹا توڑ کر پیڑا بنانے لگی اور اس سے آنکھیں ملائے بغیر بولی: ''آپ کو سردی لگ رہی ہوگی۔ چولہے کے قریب آ جائیے نا۔''

''واقعی سردی بہت سخت پڑ رہی ہے''۔ یہ کہہ کر اس نے اسٹول کھسکایا اور چولہے کے قریب آ گیا۔

رکھی کی نظریں اس کے رخساروں' آنکھوں اور تیزی سے جنبش کرتے ہوئے ہونٹوں اور ہاتھوں کی حرکات پر جمی ہوئی تھیں۔ رکھی دل میں بے چین تشنگی بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا جو پیاسے ہونٹوں سے شربت کا گلاس پرے ہٹ جانے سے محسوس ہونے لگتی ہے۔ کامنی نے روٹی الٹتے ہوئے کہا: ''آپ کو بھوک تو لگ رہی ہوگی۔''

اُس نے اٹھ کر کامنی کے رخسار پر ہونٹ رکھ دیئے۔ ''نہیں کمو! مجھے بھوک نہیں لگی رہی''۔ یہ کہہ کر وہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ کامنی نے اپنے آپ کو اس کی مرضی پر چھوڑتے ہوئے کہا: ''مجھے روٹی تو پکا لینے دیجئے۔''

''نہیں جان سے پیاری کمو! روٹیاں پھر پکا لینا''۔ یہ کہہ کر اس نے ہاتھ مار کر توا چولہے سے گرا دیا۔

وہ خوش تھا اور سرتاپا نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اب وہ بیٹھک میں دری پر لیٹا ہوا تھا۔ ٹانگیں اٹھا کر قریب بچھی ہوئی کرسی پر پاؤں ٹکا رکھے تھے اور بجلی کی جگمگاتی ہوئی روشنی میں ویکلی کا پرچہ پیٹ پر دھرے اس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

ایک مرتبہ پھر کامنی چولہے کے آگے بیٹھی اس کے لیے پراٹھے پکا رہی تھی۔ اس روز سے

پہلے زندگی کے جو دن گزر چکے تھے، وہ بالکل بے کیف نظر آنے لگے تھے۔ یہ مسرت یہ لذت اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ دل مطمئن تھا، جسم ہلکا پھلکا اور چست محسوس ہو رہا تھا۔ روح پر ناقابل بیان کیف طاری تھا آج کامنی اور وہ ایک ہو گئے تھے۔

کھانا تیار ہو گیا تو انہوں نے ایک ساتھ مل کر کھایا۔ ایک دوسرے کے منہ سے منہ ملا کر نوالے چھینتے رہے۔ ہنسی مذاق اور چہل میں وقت گزر گیا اور آخر دروازے پر دستک سنائی دی۔

کامنی نے دروازہ کھولا۔ بیج ناتھ کا معصوم چہرہ دیکھ کر رکھی کے دل میں فتور پیدا ہو گیا لیکن کامنی آڑے آئی: ''آپ کے دوست تو اٹھ اٹھ کر بھاگ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے بٹھائے رکھا میں نے۔''

بیج ناتھ نے بے تکلفانہ اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا: ''یار کمال کرتے ہو۔ آخر گھبرانے کی کیا بات تھی؟'' دوست کی سادگی اور اخلاص دیکھ کر رکھی کو شرم سی محسوس ہونے لگی اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

''کہو، کھانا کھا لیا؟''

''ہاں!''

''آؤ تو چلو جیلانی کے ہاں۔''

راستے میں بیج ناتھ دعوت کی باتیں کرتا رہا۔ کہنے لگا: ''ڈاکٹر شرما میرے بہت گہرے دوستوں میں سے ہیں۔ بڑے پریم سے کھانا کھلایا۔ واپس نہیں آنے دیتے تھے، ہزار حیلوں سے جان چھڑا کر آیا ہوں۔''

جب وہ جیلانی کے ہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کے ہاں کوئی فوجی رشتے دار باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ برج نہ کھیل سکیں گے۔ ان کا پروگرام درہم برہم ہو گیا۔ خیر وہ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر ٹہلتے رہے۔ پھر بیج ناتھ نے کہا: ''آؤ گھر بیٹھیں۔ سردی بہت زیادہ ہے۔''

''بھئی اب اجازت دو۔ اب میں گھر واپس جاتا ہوں پھر ملاقات ہو گی۔ چنانچہ مصافحہ کر کے وہ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

آج کے مسرت انگیز واقعے سے اس کا دل اگرچہ مسرور تھا لیکن دوست سے اس پاجی پن کے باعث ضمیر ملامت بھی کرتا تھا۔ اور جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اپنی نیک اور معصوم بیوی کے تصور سے اس کا دل اور بوجھل ہو گیا۔ بیچاری سردی میں ٹھٹھری ہوئی آگ کے قریب بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہو گی۔

جب وہ جیا کی دکان کے قریب پہنچا تو حسب معمول اُس سے پوچھا: ''کیوں بے جیے! کوئی آیا تو نہیں تھا ہمیں ملنے کے لیے؟''

جیا نے سر اوپر اٹھایا: ''اجی بابو بیج ناتھ آئے تھے۔ سیدھے بھیتر چلے گئے مجھ سے کچھ بولے نہیں۔ جب آپ نہیں آئے تو بیچارے انتظار کر کے چلے گئے۔''

''بیج ناتھ!'' اس کے حلق سے ہلکی سے چیخ نکل گئی اور وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

''ہاں جی! بیج ناتھ بابو۔''

دکان سے مکان تک چند قدم کا فاصلہ اس نے بہت آہستہ آہستہ طے کیا۔ جب وہ سیڑھیوں پر قدم رکھنے لگا تو اس نے دیکھا کہ اکھڑی ہوئی دو اینٹیں پھر اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہیں۔ اس نے احتیاط سے انہیں ٹکا کر رکھ دیا اور پھر ایک لمحے بھر کے سکوت کے بعد اس کے منہ سے مدہم سی ہنسی نکل گئی اور جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہاں ہر چیز جانی پہچانی تھی' ماحول پر سکون اور آرام دہ محسوس ہو رہا تھا۔

اس کی بیوی اندر والے دروازے میں کھڑی دکھائی دی۔ وہ اس وقت نوشگفتہ' پھول کی مانند تر و تازہ اور اجلی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پھول جس کا منہ شبنم نے بڑی احتیاط سے دھو ڈالا ہو۔ جس پر جمی ہوئی گرد کی نامعلوم تہ کسی نے چوم لی ہو۔

بڑے کوچ پر بیٹھ گیا۔ شانتا شاخِ گل کی طرح لچکتی ہوئی نزدیک آئی اور اس کے قریب کوچ میں دھنس گئی۔ اس نے سر سے پاؤں تک بیوی کا جائزہ لیا اور مسکرا کر بولا: ''سنو! آج تم بہت خوش دکھائی دیتی ہو۔''

اپنے مخصوص انداز میں بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ لجا کر مسکرا دی۔ اس کی تر و تازہ ہونٹوں سے سپید سپید دانت کسی حد تک نمایاں ہوئے اور اس نے بلا کچھ کہے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے کندھے پر رخسار ٹکا دیا۔

شنو کی نیند کی لہاتی پلکیں بوجھل ہو کر جھکنے لگیں۔ وہ چند لمحوں تک شنو کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کی پیٹھ پر ہلکی سے تھپکی دے کر بولا: ''میں بھی بہت خوش ہوں شنو! ادھر لاؤ تو عبداللہ سگریٹوں کا ڈبا۔''

❁ ❁ ❁

امرتا پریتم

شاہ کی کنجری

اب اُسے نیلم کہہ کر کوئی نہیں بلاتا تھا۔ سب شاہ کی کنجری کہتے تھے۔

نیلم پر لاہور ہیرامنڈی کے ایک چوبارے میں جوانی آئی تھی' اور وہیں ایک ریاست کے سردار نے پورے پانچ ہزار روپے دے کر اس کی نتھ اُتاری تھی۔ اور وہیں پر اُس کے حسن نے آگ بن کر سارے شہر کو جلا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن پھر ایک دن وہ ہیرامنڈی کے سستے چوبارے کو خیر باد کہہ کر شہر کے سب سے مہنگے ہوٹل فلیٹی میں آ گئی تھی۔ وہی شہر تھا۔ لیکن سارے شہر کو جیسے رات بھر میں ہی اس کا نام بھول گیا ہو۔ سب کے منہ سے ایک ہی بات سننے کو ملتی تھی۔ شاہ کی کنجری۔

غضب کا گاتی تھی وہ۔ کوئی بھی گانے والی اس کی طرح ''مرزے کی سد'' کے بول نہیں اُٹھا سکتی تھی۔ اس لیے لوگ چاہے اس کا نام بھول گئے تھے۔ لیکن اس کی آواز کو نہیں بھولے تھے۔ شہر میں جس کے پاس بھی ''توے والا باجہ'' تھا۔ وہ اس کے بھرے ہوئے ریکارڈ ضرور خریدتا تھا۔ سب گھروں میں ریکارڈ کی فرمائش کے وقت ہر کوئی یہی کہتا تھا: ''آج شاہ کی کنجری والا ریکارڈ ضرور سننا ہے۔''

کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ شاہ کے گھر والوں کو بھی پتہ تھا۔ صرف پتہ ہی نہیں تھا۔ اُن کے لیے یہ بات بھی پرانی ہو گئی تھی۔ شاہ کا بڑا لڑکا جو اَب شادی کے قابل تھا' تب گود میں تھا۔ تب سیٹھانی نے زہر کھا کر مرنے کی دھمکی دی تھی۔ لیکن شاہ نے اُس کے گلے میں موتیوں کا ہار ڈال کر کہا تھا: ''شاہنیئے! وہ تیرے گھر کی برکت ہے۔ میری آنکھ جواہری کی آنکھ ہے۔ تم نے یہ سنا نہیں ہوا کہ نیلم ایسی چیز ہے جو لکھ پتی کو کنگال بنا دیتا ہے اور کنگال کو لکھ پتی۔ جس کو اُلٹا پڑ جائے اُس لکھ پتی کو کنگال کر دیتا ہے' لیکن جسے سیدھا پڑ جائے' موافق آ جائے۔ اس کنگال کو لکھ پتی بنا دیتا ہے۔''

''وہ بھی نیلم ہے۔ ہماری راشی سے مل گئی ہے۔ جس دن سے اس کا ساتھ ہوا ہے۔ میں مٹی کو ہاتھ ڈالوں تو سونا ہو جاتی ہے۔''

''لیکن وہی ایک دن گھر اُجاڑ کر رکھ دے گی۔ لکھ پتی کو تنکے سا ہلکا کر دے گی۔'' شاہنی نے سینے کے درد کو سہتے ہوئے اسی پیرائے میں دلیل دی تھی' جہاں سے شاہ نے بات چلائی تھی۔

''میں تو بلکہ کہتا ہوں! کہ ان کنجریوں کا کیا بھروسہ۔کل کو کسی اور کے سبز باغ دکھانے پر یہ اگر کسی اور کے ہاتھ پڑ گئی تو لاکھ کا راکھ نہ ہو جائے۔'' شاہ نے پھر اپنی دلیل دی تھی۔

اب شاہنی کے پاس کوئی اور دلیل نہیں رہ گئی تھی۔ دلیل اگر تھی تو صرف ''وقت'' کے پاس اور وقت خاموش تھا۔کئی برسوں سے چپ تھا۔شاہ سچ مچ جتنے پیسے نیلم پر گنواتا تھا۔اُس سے کئی گنا زیادہ پتہ نہیں کہاں سے بہتے ہوئے اس کے گھر آ جاتے تھے۔ پہلے اس کی چھوٹی سی دکان' شہر کے چھوٹے سے بازار میں ہوا کرتی تھی۔لیکن اب سب سے بڑے بازار میں لوہے کے پھاٹک والی سب سے بڑی دکان تھی اُس کی۔گھر کے بجائے اب پورا محلہ ہی اس کا تھا۔جس میں بڑے کھاتے پیتے کرایہ دار تھے۔اپنے گھر کے تہہ خانے کی طرف سے اس کی شاہنی ایک دن کے لیے بھی لاپروائی نہیں برتتی تھی۔

بڑے برس ہوئے۔شاہنی نے ایک دن موہروں والے ٹرنک کو تالا لگاتے ہوئے شاہ جی سے کہا تھا:

''اس کو چاہے ہوٹل میں رکھ اور چاہے تو اس کو تاج محل بنوا دے' لیکن باہر کی بلا' باہر ہی رکھنا' اسے میرے گھر میں نہ لانا۔ میں اس کے ماتھے نہیں لگوں گی۔'' اور سچ مچ شاہنی نے آج تک اُس کا منہ نہیں دیکھا تھا۔ جب اُس نے یہ بات کہی تھی' تب اس کا بڑا لڑکا اسکول میں پڑھتا تھا۔اور اب تو وہ شادی کے قابل ہوگیا تھا۔لیکن شاہنی نے اُس کے گانے والے ریکارڈ نہ گھر میں آنے دیئے تھے اور نہ ہی گھر میں کسی کو اُس کا نام لینے دیا تھا۔یوں اُس کے بیٹوں نے دکانوں پر بجتے اس کے گانے سنے ہوئے تھے' اور ہر ایرے غیرے سے سنا ہوا تھا۔شاہ کی کنجری۔

بڑے بیٹے کی شادی تھی۔گھر میں چار مہینوں سے درزی بیٹھے ہوئے تھے۔کوئی سوٹوں پر سلمے کا کام کررہا تھا' کوئی تلّا' کوئی کناری اور کوئی دوپٹوں پر ستارے ٹانک رہا تھا۔شاہنی کے ہاتھ ہر وقت بھرے رہتے۔روپیوں کی تھیلی نکالتی کھولتی' اور پھر اور تھیلی بھرنے کے لیے تہہ خانے میں چلی جاتی۔

شاہ کے دوستوں نے دوستی کا واسطہ ڈالا کہ لڑکے کے بیاہ میں کنجری ضرور گانے کے لیے آئے۔ ویسے انہوں نے بات بڑے طریقے سے کی تھی' تاکہ شاہ کہیں غصہ ہی نہ کر جائے۔

''ویسے تو شاہ جی بہت ہیں گانے والیاں۔جس کو دل کرے بلا لو۔لیکن وہاں ملکہ' ترنم ضرور آئے۔چاہے مرزے کی صرف ایک ہی ''سد'' الاپ دے۔''

فلیٹی ہوٹل عام ہوٹلوں جیسا نہیں تھا۔وہاں زیادہ تر انگریز لوگ ہی آتے اور ٹھہرتے تھے وہاں ایک کے لیے ایک کمرہ بھی تھا اور بڑے تین کمروں کے سیٹ بھی۔ایسے ہی ایک سیٹ میں نیلم رہتی تھی۔اسی لیے شاہ نے سوچا کہ یار دوستوں کا دل رکھنے کے لیے ایک دن نیلم والے سیٹ میں ایک رات کی محفل کا اہتمام کردیں گے۔

''یہ تو چوبارے پر جانے والی بات ہوئی۔'' ایک دوست نے اعتراض کیا تو سب بول پڑے:
''نہیں شاہ جی۔ وہ تو صرف آپ کا ہی حق بنتا ہے۔ پہلے کبھی اتنے برس تک ہم نے کچھ کہا۔ اس جگہ کا نام بھی نہیں لیا۔ وہ جگہ تو آپ کی امانت ہے۔ ہم نے بھتیجے کے بیاہ کی خوشی کرنی ہے۔ اُسے خاندانی گھروں کی طرح اپنے گھر میں بلاؤ۔ ہماری بھابی کے گھر۔

بات شاہ جی کی بھی من مرضی کی تھی۔ اس لیے بھی کہ وہ دوست احباب کو نیلم کے گھر کا راستہ نہیں دکھانا چاہتے تھے۔ بیشک اس کے کانوں میں بھنک پڑتی رہتی تھی کہ اس کی غیر حاضری میں اب کوئی کوئی امیر زادہ نیلم کے پاس آنے لگا تھا اور دوسرے اس وجہ سے بھی کہ وہ چاہتا تھا کہ نیلم ایک بار اُس کے گھر آ کر اس کے گھر کی تڑک بھڑک دیکھ جائے۔ لیکن وہ شاہنی سے ڈرتا تھا۔ اس لیے دوستوں سے حامی نہ بھر سکا۔

دوستوں یاروں میں سے ہی دو نے راستہ نکالا اور شاہنی کے پاس جا کر کہنے لگے:
''شاہنی! تم لڑکے کے بیاہ میں عورتوں کو گانے پر نہیں بٹھاؤ گی؟ ہم نے سب خوشیاں کرنی ہیں۔ شاہ نے صلاح بنائی ہے کہ ایک رات یاروں کی محفل نیلم کے گھر میں ہو جائے۔ بات تو ٹھیک ہے۔ لیکن ہزاروں کا خرچ ہو جائے گا۔ آخر گھر تو تیرا ہے۔ پہلے اس کنجری کو کم کھلا دیا ہے؟ تم سیانی بنو۔ اسے گانے بجانے کے لیے یہاں بلا لو ایک دن۔ لڑکے کے بیاہ کی خوشی بھی ہو جائے گی اور روپیہ برباد ہونے سے بھی بچ جائے گا۔''

شاہنی پہلے تو غصے میں بھر کر بولی: ''میں اس کنجری کو ماتھے نہیں لگاؤں گی۔'' لیکن جب اُن لوگوں نے ٹھنڈے دل سے کہا: ''یہاں تو بھابی تیرا راج ہے۔ وہ باندی بن کر آئے گی۔ حکم کی بندھی۔ تیرے بیٹے کی خوشی میں شریک ہونے کے لیے۔ بے عزتی تو اُس کی ہے۔ تیری کاہے کی ہے؟ جیسے اور نچلے کمین لوگ آئیں گے ڈوم، مراثی، تیسی وہ۔''

بات شاہنی کے من کو بچ گئی۔ ویسے بھی کبھی سوتے جاگتے اُس کے دل میں خیال آیا کرتا تھا کہ ایک بار دیکھوں تو سہی وہ کیسی ہے؟ اُس نے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ ہاں اُس کے بارے میں اندازے ضرور لگائے تھے۔ چاہے ڈر کر، یا سہم کر، یا پھر نفرت سے، اور شہر میں نکلتے گزرتے اگر کسی کنجری کو تانگے میں بیٹھی دیکھتی، تو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سوچتی۔ کیا پتہ یہ وہی ہو؟
''چلو میں بھی ایک بار دیکھ لوں۔'' وہ من میں پگھل سی گئی۔ ''جو اُس نے میرا بگاڑنا تھا وہ تو بگاڑ لیا، اب وہ اور کیا کرے گی۔ ایک بار چندری کو دیکھ تو لوں۔''

اور شاہنی نے حامی بھر دی۔ لیکن ایک شرط پر: ''یہاں نہ شراب اُڑے گی نہ کباب۔ بھلے شریف گھروں میں جیسے گانے بجانے پر بیٹھے ہیں۔ اُسی طرح گانے کے لیے بٹھاؤں گی۔ تم مرد لوگ بھی بیٹھ جانا۔ وہ آئے اور سیدھی طرح گا کے چلی جائے ــــ میں وہی چار بتاشے جو گھوڑیاں گانے

والی لڑکیوں بالیوں کو دوں گی' اُس کی جھولی میں بھی ڈال دوں گی۔"

"یہی تو بھابی ہم کہہ رہے ہیں۔" شاہ کے دوستوں نے اس کی بات کو پھول چڑھائے۔

"تمہاری سیانپ سے ہی تو یہ گھر بنا ہوا ہے۔ نہیں تو پتہ نہیں کیا قیامت ڈھے جاتی۔"

وہ آئی۔ شاہنی نے خود اپنی بگھی بھیجی تھی۔ گھر شادی میں آنے والے مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ بڑے کمرے میں سفید چادریں بچھا کر بیچ میں ڈھولکی رکھی ہوئی تھی۔ گھر کی عورتوں نے گھوڑیاں گانی شروع کر دی تھیں......

بگھی دروازے پر آ کر کھڑی ہوئی تو مہمان عورتوں میں جن کو اُسے دیکھنے کی جلدی تھی بھاگ کر کھڑکی کے پاس گئیں اور کچھ سیڑھیوں کی طرف......

"نی بدشگنی کیوں کرتی ہو۔ گھوڑی کا گیت بیچ میں ہی چھوڑ دیا ہے۔" شاہنی نے ذرا غصیلی آواز میں کہا۔ لیکن اُسے خود ہی اپنی آواز کچھ ڈھیلی سی لگی۔ جیسے اُس کے دل میں کوئی چوٹ سی پڑی ہو......

وہ سیڑھیاں چڑھ کر دروازے تک آ گئی تھی۔ شاہنی نے گلابی ساڑھی کے پلّو کو ٹھیک کیا۔ جیسے سامنے دیکھنے کے لیے وہ گلابی رنگ کی شگنوں والی ساڑھی کی آڑ لے رہی ہو۔

سامنے — اُس نے ہرے رنگ کا لہردار غرارہ پہنا ہوا تھا۔ گلے میں سوہے لال رنگ کی قمیض تھی۔ اور سر سے پاؤں تک ڈھلکتی ہرے رنگ کی چنری۔ ایک جھلمل سی ہوئی۔ شاہنی کو ایک پل کے لیے تو ایسے ہی لگا جیسے ہرا رنگ سارے دروازے میں بھر گیا ہو' بکھر گیا ہو......

پھر کچ کی چوڑیوں کی چھن چھن ہوئی۔ تو شاہنی نے دیکھا۔ ایک گورا گورا ہاتھ اُٹھے ہوئے ماتھے سے چھو کر اُسے سلام دعا سا کچھ کہہ رہا تھا۔ اور ساتھ ہی ایک کھنکتی آواز۔ "بڑی مبارکباں شاہنی...... بہت مبارکاں......"

وہ بڑی پتلی چھمک سی تھی — شاہ بھی تھا' اس کے دوست بھی تھے۔ رشتہ داروں میں سے کچھ مرد بھی تھے۔ اس چھمک چھبیلی عورت نے اُس کونے کی طرف دیکھتے ہوئے بھی ایک بار سلام کیا اور پھر دوسری طرف گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے ٹھمکتی ہوئی بیٹھ گئی۔ بیٹھتے وقت اُس کی کانچ کی چوڑیاں پھر کھنک اٹھیں۔ شاہنی نے ایک بار اُس کے بازوؤں کی طرف دیکھا۔ اُس کی ہری کانچ کی چوڑیوں کی طرف بھی۔ اور پھر وہ سہج سبھاؤ سے اپنے بازوؤں میں پڑے سونے کے چوڑے کی طرف دیکھنے لگی......

کمرے میں ایک چکاچوندسی چھا گئی۔ ہر ایک کی نگاہیں صرف ایک طرف کو ہی جھک گئیں۔ شاہنی کی آنکھیں بھی' لیکن صرف اپنی آنکھوں کو چھوڑ کر باقی سب کی آنکھوں پر اُسے غصہ سا آ گیا۔ وہ ایک بار پھر کہنا چاہتی تھی — "نی بدشگنی کیوں کرتی ہو؟ گھوڑی کے گیت گاؤ نا۔" لیکن اُس

کی آواز اس کے گلے میں رُک گئی۔ کمرے میں ایک چپ سی چھا گئی۔ وہ کمرے کے بیچوں بیچ پڑی ڈھولکی کی طرف دیکھنے لگی۔ اور اُس کا دل کیا کہ وہ بڑے زور سے ڈھولک بجائے۔

خاموشی اُسی نے توڑی۔ جس کی وجہ سے خاموشی چھائی تھی۔ کہنے لگی: ''میں تو سب سے پہلے گھوڑی گاؤں گی۔ لڑکے کا شگن کروں گی' کیوں شاہنی؟'' اور شاہنی کی طرف دیکھتے اور ہنستے ہوئے گھوڑی کا گیت شروع کر دیا۔

چھوٹی چھوٹی بوندیں

بیٹا مینہ رے برسے

تیری ماں رے سہاگن

تیرے شگن کرے......

شاہنی کو اچانک کلیجے میں ٹھنڈ سی پڑ گئی۔ شاید اس لیے کہ گیت میں آنے والی ''ماں'' وہی ہے اور اُس کا مرد بھی صرف اُسی کا مرد ہے۔ تبھی تو ماں سہاگن ہے......

شاہنی ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ ٹھیک اُس کے سامنے جا کر بیٹھ گئی۔ جو اس وقت گیت گاتی ہوئی اُس کے بیٹے کا شگن کر رہی تھی۔

گھوڑی کا گیت ختم ہوا تو کمرے میں بات چیت شروع ہو گئی۔ پھر جیسے یہ معمول سا ہو گیا۔ عورتوں کی طرف سے فرمائش آتی: ''ڈھولک بجاتے ہوئے وہ جو اوپر سے پتھر سے ڈھولک پیٹی جاتی ہے' وہ والا گیت۔'' مردوں کی طرف سے فرمائش آئی: ''مرزے کی سد''۔

گانے والی نے مردوں کی طرف سے آنے والی فرمائش کو سنی اَن سنی کر دیا۔ اور ڈھولک کو اپنی طرف کھینچ کر اُس نے ڈھولک سے اپنا گھٹنا جوڑ لیا۔ شاہنی کا جی خوش ہو گیا۔ شاید اس لیے کہ گانے والی مردوں کی فرمائش پوری کرنے کے بجائے عورتوں کی فرمائش پوری کرنے لگی تھی......

مہمان آئی عورتوں میں سے شاید سب کو پتہ نہیں تھا۔ وہ ایک دوسری سے پوچھ رہی تھیں اور دوسری ان کے کان کے نزدیک جا کر کہہ رہی تھیں:— ''یہ وہی ہے: شاہ کی کنجری''۔ کہنے والیوں نے بیشک بہت آہستہ سے کہا تھا۔ کانا پھوسی سا۔ لیکن شاہنی کے کانوں میں آواز پڑ رہی تھی۔ کانوں پر چوٹ کر رہی تھی: ''شاہ کی کنجری۔ شاہ کی کنجری'' اور شاہنی کے منہ کا رنگ پھر پیلا پڑ گیا۔

اتنے میں ڈھولک کی آواز پھر اونچی ہو گئی۔ اور ساتھ ہی گانے والی کی آواز بھی: ''سوہی وے پگڑی والیا میں کہتی ہوں۔'' اور شاہنی کے کلیجے کو پھر سہارا مل گیا: ''یہ سوہے لال چہرے والا میرا ہی بیٹا ہے۔ سکھ سے گھوڑی پر چڑھنے والا میرا پتر......''

فرمائش کہیں ختم ہونے پر نہیں آرہی تھی۔ ایک گیت ختم ہوتا تو دوسرا شروع ہو جاتا۔ گانے والی کبھی عورتوں کی طرف فرمائش پوری کرتی' کبھی مردوں کی طرف کی۔ بیچ بیچ میں کہہ دیتی: ''کوئی

اور بھی گاؤ نا۔ مجھے سانس لینے دو۔لیکن کس کی ہمت تھی اُس کے سامنے گانے کی۔اُس کی گھنٹی کی طرح کھنکتی آواز' میٹھی ہوک سی آواز۔وہ بھی شاید یونہی کہنے کو کہہ رہی تھی۔ ویسے ایک کے بعد دوسرا گیت شروع کردیتی تھی۔

گیتوں کی بات اور تھی' لیکن جب اُس نے مرزے کی سد کا الاپ کیا: ''اُٹھ نی صاحباں ستیے' اُٹھ کردے دیدار......'' ہوا کا کلیجہ ہل گیا۔کمرے میں بیٹھے ہوئے مرد بت بن گئے۔شاہنی کو پھر ایک گھبراہٹ سی ہوئی۔اُس نے گہری نظر سے شاہ جی کی طرف دیکھا۔شاہ بھی دوسرے مردوں کی طرح بت بنا ہوا تھا۔لیکن شاہنی کو لگا......وہ پتھر کا ہو گیا ہے......

شاہنی کے کلیجے سے ایک ہوک سی اُٹھی اور اس نے محسوس کیا کہ اگر یہ پل بھی ہاتھ سے پھسل گیا تو وہ خود بھی ہمیشہ کے لیے بت بن جائے گی۔اسے کچھ کرنا چاہیے' کچھ کرنا چاہیے۔وہ کچھ بھی کرے لیکن مٹی کا بت نہ بنے......

شام کافی ڈھل گئی۔محفل ختم ہونے پر آئی۔

شاہنی نے کہا تھا کہ وہ آج اسی طرح صرف بتاشے بانٹے گی۔جس طرح لوگ ایسے دن کو بانٹتے ہیں۔ جب عورتوں کو گانے پر بٹھایا جاتا ہے۔لیکن جب گانے ختم ہوئے تو کمرے میں چائے اور کئی قسم کی مٹھائی آ گئی......اور شاہنی نے مٹھی میں لپٹا ہوا سو کا نوٹ نکال کر اپنے بیٹے کے سر پر نچھاور کیا اور پھر اُسے تھما دیا جسے لوگ شاہ کی کنجری کہتے تھے۔

''رہنے دو شاہنی ۔ پہلے بھی تمہارا ہی کھاتی ہوں۔'' اُس نے جواب دیا اور ہنس پڑی۔ اُس کی ہنسی اُس کے حسن کی طرح جھلمل کر رہی تھی۔

شاہنی کے منہ کا رنگ ہلکا پڑ گیا۔اُسے لگا جیسے شاہ کی کنجری نے آج بھری محل میں شاہ کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ کر اُس کی بے عزتی کردی ہو۔شاہنی نے اپنے آپ پر قابو پایا اور بڑا حوصلہ پیدا کیا کہ آج وہ اس سے ہار نہیں مانے گی۔اور وہ زور سے ہنس پڑی۔نوٹ پکڑاتی ہوئی کہنے لگی:

''شاہ سے تو تم ہمیشہ ہی لیتی ہو' لیکن مجھ سے تم پھر کب لوگی؟ چلو۔آج لے لو۔''

اور شاہ کی کنجری سو کے نوٹ کو پکڑتی یک بارگی چھوٹی سی ہوگی......

کمرے میں شاہنی کی ساڑھی کا شگنوں والا گلابی رنگ پھیل گیا......

❁ ❁ ❁

سہیل عظیم آبادی

بھابی جان

جب رقیہ بھابی یاد آتی ہیں تو میرا سر خود بخود احترام سے جھک جاتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ذات سراپا روشنی ہے۔ ان کی یاد کے ساتھ مجھے وہ شمع یاد آجاتی ہے' جو کلیسا کی اونچی قربان گاہ پر جلتی اور پگھلتی رہتی ہے اور جب پادری عبادت ختم کر کے قربان گاہ سے اتر جاتا ہے تو وہ بھی خاموش زبان سے خداوند یسوع مسیح کا پیغام سناتی رہتی ہے جو دوسروں کے گناہ بخشوانے کے لیے صلیب پر چڑھایا گیا۔ مگر جو اب تک زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گا اور سب کو نجات دلائے گا۔

رقیہ بھابی کی ذات مجھے ایسی ہی شمع نظر آتی ہے جو جلتی اور پگھلتی رہتی ہے' لیکن شمع روشنی پھیلاتی اور زبان سے کچھ کہے بغیر ہر وقت ایک پیغام سناتی رہتی ہے۔ ایسا پیغام جو امر ہے اور جو ساری دنیا کو روشن کرنے والا ہے۔

بھابی جان نے سویرے آواز دی۔

''خیر تو ہے شہزادے گھوڑے بیچ کر سوئے ہو چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

آواز سن کر میں اٹھ بیٹھا' وہ مسکرا دی اور بولیں:

''یعنی بات یہ ہے کہ ٹھنڈی چائے مجھ سے نہیں پی جاتی اور بچوں کو اسکول بھیجنا بھی ہے۔''

''بھابی یہی تو مصیبت ہے آپ کے ساتھ' صبح ہوئی اور اٹھا کر بٹھا دیا۔ ہم لوگوں کو بھی آپ طالب علم ہی سمجھتی ہیں۔''

بھابی بولیں:

''تو آج تم کون سے بوڑھے ہو چکے ہو۔ بھئی اٹھو جلدی کرو۔''

بھابی نے زور سے ہاتھ پکڑ کر بستر سے کھینچ لیا۔ میں زمین پر کھڑا ہو گیا۔ وہ ہنسنے لگیں۔ میں بولا:

''شکر ہے میں آپ کا اسٹوڈنٹ نہیں رہا۔''

''باتیں نہ بناؤ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے بچے بیٹھے ہیں۔''

''لیکن مجھے نیند آ رہی ہے رات بھر نہیں سو سکا۔''

میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''چائے پینے کے بعد دوسری قسط سو لینا۔''

بھابی جان بولیں۔ میں قسط کا لفظ سن کر ہنس پڑا وہ بولیں۔

شاعر ہو کر داد نہیں دیتے۔ کیا لفظ میں نے استعمال کیا ہے اگر نوابان اودھ باقی ہوتے تو اسی ایک لفظ کے استعمال پر ایک جاگیر تو بخش دیتے۔ چلو بھئی تم ذرا جلدی کرو۔ اتنا ہی سہی۔''

اور بھابی جان کھانے کے کمرے میں چلی گئیں اور جب تھوڑی دیر بعد میں پہنچا تو بچے چائے ختم کر رہے تھے۔ ننھی ریحانہ بولی ''چچا جان ہم لوگ چائے ختم کر چکے ہیں۔ اب ہماری جھوٹی چائے پیجئے؟''

اسکول کی بس نے ہارن بجایا' بچیاں تالی بجاتی باہر چل دیں۔ بھابی جان نے چائے پیالی میں انڈیل کر میری طرف بڑھائی اور بولیں ''اگر تم نوجوان اتنی دیر تک سوتے رہو گے تو کیا کرو گے؟''

''شعر کہوں گا اور کیا کروں گا۔''

بھابی جان معنی خیز انداز میں مسکرائیں۔ میں جھینپ گیا۔ ان کی مسکراہٹ میں بڑی نرمی اور مٹھاس اور بہت دور تک اشارہ۔ وہ آتے ہوئے بولیں۔

''تمہارے بھائی جان ٹھیک چار بجے اٹھ بیٹھتے تھے اور چائے پی کر کام شروع کر دیتے تھے۔ شروع میں تو مجھے بھی بڑا جبر ہوتا تھا لیکن آج صبح اٹھنے کی عادت کام آ رہی ہے۔''

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بھابی جان کی میز پر ننھے بھائی کی خوبصورت سی رنگین تصویر رکھی ہوئی تھی۔ وہ مسکرا رہے تھے اس تصویر کے پاس بھابی جان اور بچوں کی تصویریں تھیں۔ اب سنگار میز نا کافی تھا اس پر بچوں کی کتابوں کا ڈھیر تھا اور شاید ایک کنگھی کے علاوہ سنگار کی کوئی دوسری چیز نہ تھی۔ بھابی جان اداس ہو گئیں اور بولیں۔

''نہ جانے تمہارے بھائی جان کس حال میں ہیں۔ دیکھو ان کے مقدمہ کا کیا ہوتا ہے ہزار میل کی دوری پر ان کے کوئی کام بھی نہیں آ سکتی۔ چند ہی دنوں میں ان کے مقدمے کا فیصلہ ہونے والا ہے۔''

بھابی جان جو ہمیشہ پھول کی طرح کھلی رہنے اور بلبل کی طرح چہکتے رہنے کی عادی تھیں' بالکل اداس ہو گئیں۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ ذرا دیر میں کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ پھر آواز آئی۔

''میں آ سکتی ہوں۔''

''آ جاؤ......''

بھابی جان نے کہا اور ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔ بھابی جان نے دیکھتے ہی کہا:

''آؤ شمی چائے پیو۔ میں آج شام کو تمہارے گھر جانے والی تھی۔ بن دیا تم نے سوئٹر؟''

''وہی لے کر آئی ہوں۔ اون بچ گیا تھا تو میں نے ٹوپی اور موزے بھی بن دیئے۔''

''بہت اچھا کیا تم نے لو چائے پیو۔''

اور چائے کی پیالی شمی کے آگے بڑھا دی۔ شمی میری موجودگی میں کچھ شرما رہی تھی بولی:

''میں چائے پی چکی ہوں۔''

''پھر بھی پی لو۔ شرماتی کیوں ہو یہ ہیں مشہور شاعر اختر۔ تمہارے بڑے بڑے بھائی ہیں۔''

میں ناشتہ ختم کر چکا تھا اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں بھی ذرا شہر سے ہو آؤں۔''

''جاؤ میں بھی ذرا ہسپتال سے ہو آؤں۔ چلو شمی تم بھی ساتھ۔''

میں نے کمرے کی کھڑکی سے بھابی جان کو بنگلے کے احاطے سے باہر جاتے دیکھا۔ ان کے ہاتھ میں دودھ کی بوتل تھی جو دیر سے میز پر رکھی تھی۔ یہ تو مجھے دو دن بعد معلوم ہوا کہ بھابی جان کے ایک پرانے ملازم کی بیٹی ہسپتال میں ہے۔ دو مہینے پہلے اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کے بچہ پیدا ہوا ہے اور کوئی دیکھنے والا نہیں۔ بھابی جان خود ہی دو فرلانگ دونوں وقت پیدل جاتیں اور دودھ پہنچاتی ہیں اور سوئٹر اور موزے اسی بچے کے لیے بنوائے تھے کیونکہ سردی کا موسم شروع ہونے والا تھا۔ اور شمی ان کے کالج کی غریب طالب علم تھی جو صرف ان کی مدد کے سہارے پڑھ رہی تھی۔

بھابی جان سے میری دوسری ملاقات تھی۔ البتہ خط و کتابت تھی۔ لیکن تین دن ساتھ رہ کر معلوم ہوا کہ وہ آدمی نہیں مشین تھیں۔ صبح اٹھ کر کام شروع کر دیتی تھیں۔ ان کا زمانہ بدل چکا تھا۔ کبھی چار پانچ نوکر اور مامائیں ہوتی تھیں۔ اب ان کے پاس صرف ایک نوکر تھا۔ جو بازار سے سودا لاتا اور کھانا بھی پکاتا تھا۔ رپوں کی تنگی تھی۔ پہلے ہزار روپیہ اپنے شوق پر خرچ کر دیا کرتی تھیں۔ اب چار سو روپیہ ماہوار پر لڑکیوں کے ایک کالج میں لیکچرار تھیں اور پچاس روپیہ ماہوار ایک لڑکی کو پڑھانے کے ملتے تھے۔ لے دے کر یہی ان کی آمدنی تھی اور خرچ اپنی جگہ پر تھا بلکہ زیادہ اپنا اور بچوں کا خرچ ہوتا تو کسی طرح پورا ہو جاتا لیکن خرچ بڑھ گیا تھا۔ بچوں اور اپنی ضرورتوں کے علاوہ ایک مستقل رقم انہیں ہر مہینہ مزدوروں اور طالب علموں کی انجمنوں کو دینی پڑتی تھی۔ کانفرنسوں اور جلسوں میں شرکت کے

لیے سفر میں ریل کا کرایہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ دو غریب لڑکیاں صرف ان کی مدد سے پڑھ رہی تھیں۔

بھائی جان کی شادی جب رقیہ بھابی سے ہوئی تھی تو ہم لوگوں کا خیال تھا کہ شادی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ایک طرف ننھے بھائی تھے جن کو ایسی سیاست کا شوق تھا جو بار بار انہیں جیل بھجوایا کرتی تھی۔ دوسری طرف بھابی جان تھیں جو نازوں کی پالی تھیں اور ایسے ماحول میں بڑھ کر جوان ہوئیں تھیں جس میں اپنی ہی ذات سب کچھ ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ بھائی جان بھی سیاست کے چکر سے نکل کر بیرسٹری کریں گے۔ اپنی عالی شان سی کوٹھی میں شان کی زندگی گزاریں گے۔ یا پھر آرام کرسی والی سیاست چلے گی اور کتابوں کی باتیں دہرائی جائے گی۔ لیکن سب کا خیال غلط نکلا۔ بھائی جان نے جلد ہی رقیہ بھابی کو اپنے رنگ میں رنگ لیا اور وہ قدم بہ قدم ان کے ساتھ چلنے لگیں۔ شادی کے تین مہینے کے بعد ہی ننھے بھائی گرفتار ہوگئے اور انہیں دو سال کی سزا ہوگئی۔ بھابی جان نے اپنے لیے راہ تلاش کرلی۔ بی۔اے۔ وہ پہلے ہی کرچکی تھیں۔ جلد ہی تیاری کرکے ایم۔اے کرلیا اور ایک کالج میں لکچرار ہوگئیں اور اکلوتی بچی کی دیکھ بھال میں لگ گئیں۔

دو سال بعد جب ننھے بھائی جیل سے چھوٹ کر آئے تو پھر اپنی سرگرمیوں میں لگ گئے اور بھابی جان کام کرتی رہیں۔ دو بچے ہوئے انہیں پالتی رہیں۔ اب ننھے بھائی تین سال سے بند تھے اور ان پر مقدمہ چل رہا تھا تو بھابی جان پر بے شمار ذمہ داریوں اور غم کا بوجھ اٹھائے پھرتی تھیں۔ لیکن ان کا چہرہ کبھی میلا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے غم کو مسرت سمجھنے لگیں ہیں اور غم میں خوشی کا پہلو نکال لیتی ہیں۔

وہ صبح سویرے اٹھتیں، بچوں کو نہلاتیں، ان کے کپڑے بدلتیں، خود نہا دھوکر تیار ہوجاتیں۔ بچوں کو کھلا پلا کر سات بجے اسکول بھیج دیتیں۔ پھر ملنے والوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا۔ طرح طرح کے لوگ ان سے ملنے آتے اور طرح طرح کی فرمائشیں کرتے۔ کوئی ان سے ملازمت کے لیے سفارش کرنے کو کہتا کوئی کسی کام کے لیے۔ سب آدمی انہیں بڑے آدمی کی بیوی اور بہو سمجھتے تھے۔ کوئی یہ نہیں سمجھتا تھا کہ ان کا تعلق اب بڑے لوگوں سے صرف چھوٹے لوگوں کی وجہ سے رہ گیا ہے۔ وہ بڑے لوگوں کے پاس اب صرف سفارشیں لے کر جاتی ہیں۔ ورنہ اب ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہ گیا ہے۔ بھابی جان کالج جاتیں اور وہاں ہر لڑکی کے معاملات میں دلچسپی لیا کرتیں۔ کالج سے واپس آ کر کئی خط ہر روز لکھتیں اور انہیں ڈاک میں ڈلواتیں۔ عام طور پر یہ خطوط نئے لکھنے والوں کے نام ہوتے جو انہیں خط لکھا کرتے تھے۔ بھابی جان نے محض دل بہلانے اور وقت کاٹنے کے لیے لکھنا شروع کیا مگر وہ بہت اچھا لکھنے لگیں۔ نئے لکھنے والے ان سے مشورہ طلب کرتے اور وہ بڑی محبت کے ساتھ ان کے خطوط کے جواب دیا کرتیں۔ اس طرح کہ نئے لکھنے والے نہ تو غلط فہمیوں کا شکار ہوکر بہک سکیں اور نہ ان کی دل شکنی ہو۔ پھر شام کو ایک جگہ پڑھانے چلی جایا کرتی تھیں۔

یعنی صبح جاگنے کے بعد سے سوتے وقت تک کام۔ آدمی کاہے کو مشین معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے خط لکھنے کے شوق سے تنگ آ کر میں نے کہا۔

''بھابی جان آپ نے کیا علت پال رکھی ہے۔ کالج میں تو سر کھپاتی ہی ہیں گھر پر بھی ایک کالج بنا رکھا ہے۔'' بھابی جان بڑے باوقار انداز میں مسکرائیں اور بولیں۔

''اختر' ان نئے لکھنے والوں کو کیسے بھول سکتی ہوں یہ تو ہمارے مستقبل کی امید ہیں۔ اگر میں ان پودوں پر روز چھڑکاؤ نہیں کرسکتی' ان کی خدمت نہیں کرسکتی کہ ان میں پھول لگیں اور سارا باغ مہک اٹھے تو کم سے کم جو کچھ کرسکتی ہوں وہ تو کرنا ہی چاہیے۔''

اس جواب کے بعد کچھ اور بولنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ میں چپ ہو رہا۔

دوسرے دن شام کے وقت وہی لڑکی شمی ان کے پاس آئی۔ وہ بہت اداس تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کچھ بول نہیں رہی تھی۔ بار بار اس کے ہونٹ کانپ کر رہ جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ رو دے گی۔ بھابی نے اسے بٹھایا اور باتیں کیں۔ پھر آنے کی وجہ پوچھی تو وہ کچھ نہ بولی۔ بھابی جان جتنے اصرار کے ساتھ اس سے پوچھتیں معلوم ہوتا کہ اس کے ہونٹ اتنی ہی شدت کے ساتھ آپس میں چپکتے جاتے تھے۔ آخر وہ کچھ نہ بولی۔ بھابی جان نے اسے اٹھایا اور سونے کے کمرے میں لے گئیں۔ دروازہ اندر سے بند کیا اور پوچھا کیا بات ہے۔

لیکن شمی کچھ بتانے کے بدلے رونے لگی۔ بھابی جان کے چپ کرانے پر بھی روتی گئی اور بڑی دیر کے بعد بھابی جان کے ڈانٹنے پر اس نے بتایا کہ دوسرے ہی دن اس کے بھائی کو ایم۔اے کی فیس داخل کرنی ہے اور روپیہ کا کوئی انتظام نہیں ہوسکا ہے۔ وہ اس بات پر شرمندہ ہے کہ بھابی جان اس کے کالج کا خرچ دیتی ہیں اور اب وہ بھائی کے امتحان کی فیس مانگے۔ لیکن دوسرا کوئی ایسا ہمدرد بھی نہیں تھا جس کے سامنے جا کر وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرتی۔ وہ صرف اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے ان کے پاس آئی تھی۔

بھابی جان نے بڑی محبت سے اس کے گال پر ایک چپت لگائی اور بولیں۔

''پگلی اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ شرمانے کی کیا بات ہے۔ ہم لوگ اسی طرح تو ایک دوسرے سے کہہ کر اپنا دکھ درد ہلکا کرتے ہیں۔''

اتنا کہہ کر انہوں نے الماری کھولی اور سونے کی دو چھوٹی چھوٹی چوڑیاں شمی کے ہاتھ میں دے کر بولیں۔

''۔۔۔ جاؤ اسے بیچ کر فیس جمع کردو۔''

شمی شاید گر جاتی۔ لیکن بھابی نے اسے سنبھال لیا اور اس کی پیشانی چوم کر بولیں۔

''سدا ہی ایسا زمانہ نہیں رہے گا' دن بدلیں گے' جاؤ سویرے چلی جاؤ' پھر اندھیرا ہوجائے گا۔''

شمی چوڑیاں لے کر چلی گئی۔ یہ چوڑیاں وہ تھیں جو دو دن پہلے بھابی جان نے ننھی ریحانہ کے لیے بڑی مشکل سے پیسے بچا کر بنوائی تھیں اور ریحانہ نے انہیں صرف ایک بار پہنا تھا۔

چوڑیاں دے کر بھابی جان خوش تھیں جیسے ان کے دل پر سے پہاڑ جیسا کوئی بوجھ اتر گیا تھا۔

میں چار دنوں سے ان کے پاس تھا۔ ایک ضروری معاملے میں ان سے مشورہ کرنے گیا تھا لیکن ان کی مصروفیتیں اور الجھنیں دیکھ کر باتیں کرنے کا موقع نہ ملا اور نہ ہمت ہوسکی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ان سے بغیر مشورہ کیے اور مدد مانگے چلاؤں گا حالانکہ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ صرف وہی ایسی آدمی تھیں جو اس سلسلے میں میری مدد کرسکتی تھیں لیکن میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ان سے اس مسئلے پر کوئی بات نہیں کروں گا۔

بھابی جان نے خود ہی کہا۔

''تم چار دنوں سے آئے ہوئے لیکن کوئی بات نہیں کی۔''

میں نے کہا۔

''میں صرف سیر اور آپ سے ملنے کے لیے آ گیا تھا۔''

وہ بولیں: ''شادی کا کیا ہوا سنا ہے تم میں اور تمہارے گھر والوں میں شادی کے مسئلے پر سخت اختلاف ہوگیا ہے۔''

جی ہاں — شادی کا مطلب ہے کہ یا تو میں امی کی پسند کے مطابق ایک احمق لڑکی سے شادی کرلوں یا پھر چپ بیٹھا رہوں۔''

''اور وہ جمیلہ — تم جمیلہ سے شادی کرنا چاہتے تھے نا؟''

بھابی جان بولیں — میں نے کہا۔

''اب بھی چاہتا ہوں لیکن امی نے کہہ دیا کہ جمیلہ اس گھر میں بہو بن کر داخل نہیں ہوسکتی۔''

''یہ تو بڑی زیادتی ہے۔''

بھابی جان بولیں — میں نے کہا۔

''ہے تو — لیکن کیا کیا جائے بہت سے ظلم برداشت کرنے پڑتے ہیں۔''

''پھر کیا سوچا —''

بھابی جان نے پوچھا۔ میں نے اپنے لفظوں پر زور دے کر کہا۔

''شادی تو جمیلہ ہی سے کروں گا اور گھر چھوڑ دوں گا۔''

''تو بسم اللہ۔ بیاہ کرکے آ جاؤ۔ یہاں میرے ساتھ رہے گی۔ میں بھی اکیلی ہوں۔''

''اُف'' بھابی کی یہ بات سن کر مرا سر چکرا گیا۔ یہ عورت ہے یا عزم و ہمت کا ستون۔

اپنے لیے ہر روز ایک نیا بوجھ بڑھائے جاتی ہے۔ خود اپنی ضرورتیں اور ذمہ داریاں کیا کم ہیں مگر ہمت ہے اور ہمت کے سہارے شوہر کی دوری اور نظر بندی کا غم ہنس ہنس کر بھلائے جاتی ہے۔ میں نے ذرا سوچ کر جواب دیا۔ ''میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ لیکن ابھی دیر ہوگی۔ جمیلہ ابھی بیمار ہے۔''

جمیلہ بیمار نہیں تھی بالکل اچھی تھی مگر میں یہ نہیں کہتا تو وہ ضد پر اتر آتیں۔ حالانکہ میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ بھابی جان سے مشورہ کرنے کے بعد شادی کروں گا اور اسے ان کے پاس چھوڑ کر نوکری کی تلاش میں نکلوں گا۔ بھابی جان جمیلہ کی بیماری کی خبر سن کر افسوس کرنے لگیں اور بولیں۔

''سچ مچ جمیلہ بڑی پیاری لڑکی ہے۔''

میں باہر چلا گیا اور طے کرلیا کہ رات کی گاڑی سے واپس چلا جاؤں۔

چار بجے واپس آیا تو دیکھا بھابی جان بہت اداس بیٹھی ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ٹیلی گرام تھا جس کو ہاتھ میں لیے بس دیکھتی جارہی تھیں۔ ان کے چہرے کا گورا رنگ سنولا گیا تھا۔ میں چپ ان کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

''ٹیلی گرام کیسا ہے بھابی جان۔''

''اختر۔''

جیسے وہ چیخ پڑیں۔ تار میرے ہاتھ میں دے دیا اور میز پر سر رکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں' ننھے بھائی کو چار سال کی سزا ہوگئی تھی۔ میں نے کچھ دیر کے بعد بمشکل کہا۔

''بھابی جان صبر کیجئے۔ ابھی تو امتحانوں کی منزل سے اور بھی گزرنا ہوگا۔''

اور بھابی جان کو جیسے سکون آ گیا۔

''ٹھیک کہتے ہو اگر میں پریشان ہوئی تو بچے اور پریشان ہوں گے۔''

وہ اٹھیں اور منہ ہاتھ دھونے چلی گئیں۔ جب واپس آئیں تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک لہر تھی جو آئی اور گزر گئی...... لیکن ہم لوگ جتنی دیر تک چائے پیتے رہے بھابی جان کی نظر بار بار سنگار میز پر رکھی بھائی جان کی تصویر کا طواف کرتی رہی۔ اسی وقت انہوں نے بتایا کہ ان کے پاسپورٹ کی درخواست نامنظور ہوگئی ہے اور اسی رات ان کا دہلی جانا ضروری ہوگیا ہے۔

اسی رات بھابی جان دہلی چلی گئیں اور میں واپس ہوگیا۔ رات کے سناٹے میں ریل گزرتی جاتی تھی اور مجھے ایسا معلوم ہورہا تھا کہ اندھیری رات میں بھابی جان مجھے روشنی دکھا رہی ہیں۔ میرے دل میں نئے ارادے' نئے حوصلے پیدا ہورہے تھے۔ نئی امیدیں' اور نئی امنگیں جاگ رہی تھیں۔

❀ ❀ ❀

رتن سنگھ

ہزاروں سال لمبی رات

سننے والے اس کی بات بڑے انہماک سے سن رہے تھے حالانکہ سنانے والا جوان سب کے بیچ لیٹا ہوا تھا' بالکل اوٹ پٹانگ باتیں کر رہا تھا۔ ان میں کہیں کوئی تسلسل نہیں تھا۔ بات کرتا کرتا وہ خود بہک جاتا جیسے راہ چلتا مسافر اپنی راہ سے بھٹک کر کسی غلط راستے پر چلنے لگے۔ ایک بات ادھوری ہی چھوڑ کر وہ کسی دوسری بات کا سرا پکڑ لیتا۔ اس طرح رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔

وہ سب کے سب ریلوے اسٹیشن کی طرف جانے والے بازار کی ایک دکان کے برآمدے میں آ کر رات کاٹنے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب ان میں سے سب سے بوڑھے آدمی نے گلا صاف کرتے ہوئے کسی راجہ کی بات شروع کی تو اس برآمدے میں لیٹے ہوئے سب کے سب آدمی ہنکاری بھرنے لگے۔ ''ہوں' پھر کیا ہوا بابا۔''

بس پھر کیا تھا بات چل نکلی ---

ایک بادشاہ تھا اس کی سات رانیاں تھیں۔

ساتوں رانیوں کے لیے بادشاہ نے الگ الگ محل بنوائے۔ ایک لکڑی کا' دوسرا اینٹ گارے کا' تیسرے سنگِ مرمر کا' چوتھا تانبے کا' پانچواں چاندی کا' چھٹا سونے کا اور ساتویں میں ہیرے جواہرات جڑے تھے۔

''بالکل ٹھیک۔'' کسی نے ہنکاری بھری۔

اتنی دولت ہونے پر بھی بادشاہ کے یہاں اولاد نہیں تھی۔ اس لیے وہ بہت دکھی تھا۔ بادشاہ کو آخر کسی نے رائے دی کہ فلاں جنگل میں ایک پیڑ ہے اس پر سات پھل لگے ہیں۔ اگر بادشاہ پھلوں کو توڑ کر اپنی رانیوں کو کھلائے تو سب کے اولاد ہو جائے گی۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس پیڑ تک پہنچنا بڑا مشکل تھا۔ راستے میں سات دریا پڑتے تھے اور سات دیوؤں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور پیڑ کے گرد سات سانپوں کا زبردست پہرہ تھا۔ لیکن بادشاہ بھی اپنی دھن کا پکا تھا وہ اپنا لاؤ لشکر لے کر چل پڑا۔ بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ بوڑھے کو کھانسی کا دورہ پڑا۔ جب اس کی سانس درست ہوئی تو بوڑھا بہک گیا۔ اس نے ایک دوسری بات چلا دی۔

بڑی پرانی بات ہے۔ایک کاریگر نے ایک ایسا ڈنڈا بنایا جس کے اندر ایک آدمی بیٹھ سکتا تھا۔اس طرح وہ ڈنڈا آدمیوں کی طرح ہی بولتا تھا' چلتا تھا اور کھاتا پیتا تھا۔

''ٹھیک ٹھیک۔'' قریب قریب سب نے مل کر ہنکارا بھرا۔

پھر اچانک یہ ہوا کہ رکشوں اور تانگوں کا ریلہ شور مچاتا ہوا سڑک پر سے گزرنے لگا۔شاید اسٹیشن پر کوئی مسافر گاڑی رکی تھی۔ اس لیے بوڑھا تھوڑی دیر رکا۔ پھر اس نے ایک مچھلی کی بات شروع کر دی جو اتنی بڑی تھی کہ اس کی پیٹھ پر باقاعدہ ایک شہر بسا ہوا تھا۔جس پر نہ معلوم کتنے ہی مکان بنے ہوئے تھے کتنے ہی کھیت تھے۔سمندر میں جس طرف یہ مچھلی جاتی اس طرف یہ بسا بسایا شہر چلا جاتا۔

''بالکل ٹھیک۔'' سب نے ہنکاری بھری۔

اس طرح رات نہایت آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی بوڑھا باتیں کیے جا رہا تھا اور وہ سب کے سب بڑے غور سے سن رہے تھے۔ پھر کسی بات کو ادھوری ہی چھوڑ کر بوڑھے نے ایک نئی بات شروع کی۔

ہزاروں سال پہلے کی بات ہے ایک بادشاہ نے آدھی دنیا فتح کر لی۔

''پھر''

پھر اس خوشی میں بادشاہ نے ایک بہت بڑی دعوت دی۔

''پھر۔'' ''پھر۔''

پھر کیا اتنا کھانا بنایا گیا کہ بادشاہ کے شہر کے سارے کے سارے مکانوں میں کھانا بنا بنا کر رکھا گیا۔

''پھر۔ پھر۔ پھر'' سبھی آدمی ایک ساتھ ہنکاری بھر رہے تھے۔

بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔

''سب سے پہلے بادشاہ اور اس کے رشتہ داروں نے کھانا کھایا۔

''ٹھیک۔''

پھر بادشاہ کے سینکڑوں امیروں وزیروں نے کھانا کھایا۔

''ٹھیک۔''

پھر بادشاہ کے ہزاروں فوجیوں اور چنے ہوئے شہریوں نے کھانا کھایا۔

''ٹھیک۔''

اتنے لوگوں کے کھانا کھاتے کھاتے رات ہو گئی۔

''ٹھیک۔''

اور سب کے بعد رات کے وقت لاکھوں غریب غرباء اور فقیروں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔

''بالکل جھوٹ۔ بالکل جھوٹ۔'' اس برآمدے میں لیٹے ہوئے سبھی آدمی احتجاجاً اٹھ کھڑے ہوئے اور ان میں ایک آدمی بولا: ''بوڑھے تجھے جھوٹی باتیں کرتے شرم نہیں آتی۔ اگر ہم نے رات کو پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہوتا تو اس وقت چین کی نیند نہ سوئے ہوتے۔ رات بھر تمہاری یہ بکواس کون سنتا۔''

''ارے بھائی ناراض کیوں ہوتے ہو۔'' بوڑھے نے کچھ سہمی ہوئی آواز میں کہا: ''میں بھی تمہاری طرح بھوکا ہوں۔ اگر مجھے نیند آرہی ہوتی تو یہ باتیں کرنے کے لیے جاگتا ہوتا۔ میں بھی ـــ تو سو جاتا۔''

❀ ❀ ❀

قاضی عبدالستار

مالکن

1950ء میں جو سیلاب آیا تھا' اس نے سیتاپور سے لے کر لکھیم پور کھیری تک کے سارے ''گانجر'' کے علاقے کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ لیکن گھاگھرا نے تو کمال ہی کر دیا۔ صدیوں کا بنا بنایا راستہ چھوڑ کر سات میل پیدل چل کر آئی اور سڑک کو کاٹنے والے انجن کی طرح چھوٹے موٹے دیہاتوں کو زمین کے برابر کرتی ہوئی رونق پور میں داخل ہو گئی۔ رونق پور پہلے ہی سے خالی ڈھالی کی طرح ننگا پڑا تھا۔ سارے گاؤں میں بس حویلی کھڑی تھی۔ حویلی کی کھڑکیوں سے اکا دکا بدحواس آدمیوں کے چہرے نظر آجاتے تھے۔ جیسے شہد کی مکھیوں کے بڑے چھتے لٹک رہے ہوں۔ حویلی کچی تھی' لیکن کوئی سو برس سے برساتوں کے خلاف سینہ تانے کھڑی تھی۔ اس کی دیواروں کی چوڑان پر جہازی پلنگ بچھائے جا سکتے تھے۔ مشہور تھا کہ ایک نوسکھیا چور رونق پور کے نجیب الطرفین کا مہمان ہوا۔ رال ٹپکاتی نظروں سے حویلی کو دیکھ کر ہتھیلیاں کھجلانے لگا اور کنکھیوں سے ہاتھ کی صفائی دکھلانے کی اجازت طلب کرنے لگا۔ میزبان کو دل لگی سوجھی۔ اس نے کچھ اتا پتا بتا کر آدھی رات کو رخصت کر دیا۔ مہمان ایک دیوار پر سایہ لے کر جٹ گیا۔ کھودتا رہا' یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو گئی۔ دیوار اسی طرح کھڑی تھی۔ اسی ٹھاٹ باٹ سے کھڑی تھی۔ وہ بیچارہ نامراد واپس ہوا۔ لیکن بنانے والے نے حویلی بنائی تھی۔ ''جل بھون'' نہیں بنایا تھا۔ اوپر سے ''ہتھیا نکھت' برستا تھا اور نیچے برچھائی ہوئی مست ہتھنی کی طرح گھاگھرا چوٹیں کر رہی تھی۔ پہلے پھاٹک گرا' پھر دیوان خانہ' جب ڈیوڑھی گر گئی اور اندر کے کئی درجے بیٹھ گئے تب چودھری گلاب کی نمک حلالی کو غیرت آئی۔ علاقہ بھر کے نامی کہاروں اور مچھیروں کی چھوٹی سی فوج بنائی اور ان کے بازوؤں کے بجرے پر چڑھ کر تھان گاؤں سے نکلے اور رونق پور کی حویلی میں اتر گئے دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہوئی مالکن کو کانپتی ہوئی آواز میں خطاب کیا۔

''حضور اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ حکم دیجئے تو جان پر کھیل کر پالکی چڑھا لاؤں اگر سرکار کی جوتیاں تک بھیگ جائیں تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا۔ گھاگرا کی پاگل موجوں کی دل ہلا دینے والی بھیانک آواز کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔ چودھری گلاب نے آہستہ سے کہا— تو آواز آئی۔

تم کیسی باتیں کرنے لگے ہو چودھری گلاب۔ خدا نہ کرے میں اپنی زندگی میں حویلی کے باہر قدم نکالوں اور مرنے والے کے نام پر سیاہی لگاؤں۔ کوئی سو برس پہلے یہیں جہاں اب حویلی کھڑی ہے یہاں رونق پور کا قلعہ تھا۔ اسی طرح گھاگھرا کی موجوں کی طرح انگریزوں کی توپیں آئی تھیں۔ ان سے آگ برسی تھی اور قلعہ جل کر خاک ہو گیا تھا۔ تو کیا ہم بھاگ گئے تھے؟...... ہم مٹ گئے تھے۔ سو ہم آج پھر مٹ جائیں گے''۔ چودھری گلاب کھڑے رہے مالکن کے پیچوان کی کڑکڑاہٹ سنتے رہے۔

ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا۔ میر محمد علی بیگ مر چکے تھے۔ میر محمد علی بیگ کی بیوہ رونق پور کی ''مالکن'' پر کسٹوڈین کی مصیبت نازل ہو چکی تھی۔ میر محمد علی بیگ نے نقدی میں چھوڑا ہی کیا تھا؟ اور انہیں کچھ چھوڑنے کی پڑی ہی کیا تھی! نہ آل نہ اولاد' ایک میاں بیوی اور اتنی بڑی جائیداد۔ مالکن نے گہنے پاتے بیچ کر حکومت کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ میر محمد علی بیگ پاکستان نہیں' قبرستان گئے ہیں۔ برسوں کی مسلسل اور لکھ لٹ یقین دہانی کے بعد ایک رات چودھری گلاب الہ آباد سے یہ پروانہ لائے کہ حکومت نے مان لیا کہ واقعی میر محمد علی بیگ پاکستان نہیں قبرستان ہی گئے ہیں وہ رات عجیب رات تھی۔ مالکن ساری رات جانماز پر بیٹھی رہی۔ ساری رات شکرانے کی نمازیں پڑھتی رہیں۔ عورت ساری رات حقے کی چلمیں بھرتی رہیں اور چلمیں سلگ سلگ کر جلتی رہیں اور صبح ہوتے ہی حویلی کے سامنے پنواڑی نے ڈگی پیٹ کر زمین داری کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ پھر تو جیسے لٹس مچ گئی۔ دور دور تک پھیلی ہوئی زمینیں اور باغ درخت سب گھٹیا بتاشے کی طرح بٹ گئے جیسے بندوق کا فائر ہوتے ہی پرندوں کے غول اڑ جائیں۔ مگر مالکن نے ہمت نہ ہاری۔ چودھری گلاب کو ہدایتیں دے دے کر ان گنت مقدمے لڑتی رہیں جیسے حضرت محل نے غدر میں فوجیں لڑائی تھیں۔ شکست تو حضرت محل کی طرح رونق پور کی مالکن کو بھی ہوئی۔ لیکن حضرت محل کی طرح رونق پور کی مالکن نے شکست مانی نہیں مگر کب تک؟ ایک ایک کر کے آدمی بکھرنے لگے عورتیں نکلنے لگیں۔ آخر چودھری گلاب نے بھی آنا جانا کم کر دیا۔ اور پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے تیرے میرے مقدمے لڑنے لگے۔ ہولی' دیوالی پر آتے۔ پاؤ سیر مٹھائی کا دونا نذر میں بھیجتے اور اس طرح وضع داری کو نبھائے جاتے۔

مقدمے جونک کی طرح لگ گئے اور مالکن کا ایک ایک قطرہ چوس لیا اور اندر سے باہر تک سب اجڑ گئے۔ بیل' شامیانے' چھولداریاں' جاجمیں' قالین' دریغ' پتیلے' کرسی' میزیں' پلنگ پیڑھی سب باورچی خانے کو زندہ رکھنے کے لیے مر گئے۔

پھر ایک دن جب وہ نماز پڑھ کر اٹھیں۔ مونج کی پٹاری کے پاندان سے کھجور کی گٹھلیوں کے دو ڈلے اور پتی کی تمباکو کا پھنکا لگایا اور کھنڈر کے اس حصے کی طرف چلیں جو کسی زمانے میں باورچی خانہ کہلاتا تھا۔ بغیر دروازوں کے لمبے چوڑے کمرے کے کونے میں لڑھکی ہوئی مٹی کی ہانڈیوں کے منہ دیکھے

جوان کے پیٹ کی طرح خالی تھے۔ گھٹنوں پر ہتھیلیاں جما کر آہستہ آہستہ جھکتی ہوئی وہیں زمین پر بیٹھ گئیں، جیسے جواری سب کچھ ہار کر بیٹھ رہے۔ ان کی لنگڑاتی ہوئی نگاہیں اس سنسان ویران لق و دق کھنڈر میں رینگتی رہیں، جس کی چھتیں گر چکی تھیں، دھنیاں جل چکی تھیں۔ دروازے بک چکے تھے اور جس کے در و دیوار خدمت گزار انسانوں کی مودب پرچھائیوں کے رت جگوں کو ترستے تھے اور شاید ترستے بھول چکے تھے۔ ان کی بھوکی آنکھوں سے دو میلے میلے آنسو گرے اور پیوند لگے ہوئے موٹی تنزیب کے کسمیلے دوپٹے میں کھو گئے۔ پھر انہوں نے ایک انجانی آہٹ محسوس کی اور کسی نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ کانپنے لگیں لیکن کانوں سے ٹکراتی ہوئی اس مقدس آواز کو سنتی رہیں جس سے ماِمتا کا رس ٹپک رہا تھا۔

زیب النساء بیگم...... تم ان اشراف زادوں کی اولاد ہو جن کی تلوار نے سلطنتوں کی تقدیریں لکھی ہیں اور تخت و تاج کے فیصلے کیے ہیں۔ تم ان درویشوں کی بیٹی ہو جن کے قلم نے قرآن شریف نقل کیے ہیں اور پیٹ بھرا ہے۔ تم تلوار نہیں ہلا سکتیں ...... تم قلم نہیں اٹھا سکتیں...... لیکن تم سوئی تو چلا سکتی ہو۔ تمہارے ہاتھ کے انگرکھے پہن کر میں نے چھ منزل کلب کی میموں کے ساتھ ڈنر اڑائے ہیں اور لنچ کھائے ہیں...... کیا کہا تم نے؟ اب انگرکھے کون پہنتا ہے؟...... اب اگر انگرکھے نہیں پہنتا تو کوئی نہ کوئی کرتے ضرور پہنتا ہوگا...... تم کو یاد ہے؟ میں نے لکھنؤ سے کٹاؤ کے جو کرتے سلوائے تھے ان کی سلائی اس سستے زمانے میں کیا تھی؟...... پانچ روپیہ فی کرتا...... تم ویسا کرتا دو دن میں سی سکتی ہو۔''

جب وہ اٹھیں تو ان کی بے پناہ بے قراری کو قرار آ چکا تھا۔ جیسے ایک بھیانک خواب دیکھ کر جاگ اٹھیں ہوں۔ جیسے سارے دن کی سخت محنت کے بعد ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے خوب دیر تک نہا کر نکلی ہوں۔ وہ بڑے حوصلے سے قدم اٹھا رہی تھیں کہ اس طرف سے آواز آئی، جہاں کبھی دیوڑھی ہوا کرتی تھی۔ انہوں نے دوپٹے کو اس طرح بنا کر اوڑھا کہ تمام پیوند اِدھر اُدھر ہو گئے اور چٹیاں کچے آنگن میں آہستہ آہستہ رکھتی ہوئی اس ویران پکھے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں جو کبھی دیوڑھی کے گرانڈیل منقش دروازے کا سہارا تھا۔

''میں ہوں مالکن...... گلاب لال۔''

''اچھے ہو...... چودھری گلاب؟''

''مالکن کی کرپا ہے......''

''کیسے آ گئے۔''

''ایک سندیسہ آیا ہے۔''

''کیا۔''

''پاکستان سے خان صاحب آئے ہیں ــــ وہ جو بڑی مسجد کے پچھواڑے رہتے تھے۔''

''ہاں ہاں منے خاں...... جن کا بھتیجا ہمارے یہاں سپاہیوں میں تھا۔''

''جی ہاں۔ جی ہاں وہی۔ ان کے تو بڑے رتبے ہیں پاکستان میں۔ سب لڑکے ان کے بڑی بڑی جگہوں پر ہو گئے ہیں۔

''اچھا۔''

''جی ہاں......موٹر پر آئے ہیں وہ لکھنؤ سے۔ کہتے ہیں کہ آپ کے بھائی افضل مرزا صاحب جو آج کل کراچی میں بڑے کمشنر ہیں انہوں نے کہلا بھیجا ہے کہ آپ چلی آویں۔''

''افضل مرزا میرا بھائی تھوڑی ہے موا......میرے ایک رشتے کے چچا کا بیٹا ہے۔''

تو انہوں نے آپ کو بلایا ہے...... بلکہ خاں صاحب تو کہتے تھے کہ ان کو پاسپورٹ بھی انہوں نے اس لیے بڑی دوڑ دھوپ کر کے دلایا ہے کہ وہ آپ کو اپنے ساتھ لے آویں۔''

''مجھ کم بختی کی ماری پر اب ایسے پیمبری وقت پڑ گئے ہیں کہ موئے ایروں غیروں کے ساتھ دوسرے ملک سدھار جاؤں گی۔ اس سے کہنا کہ اپنے ہوتوں سوتوں کو سمیٹ لے جائے اپنے ساتھ پاکستان کو...... مجھے تو اب ایک ہی جگہ جانا لکھا ہے جب تک حکم نہیں آتا تبھی تک بیٹھی ہوں۔''

''وہ کہہ رہے تھے۔''

''گولی مارو چودھری گلاب......کہنا سننا کا ہے کا......''

''جی......بہتر ہے۔''

''ہاں میں تم سے ایک بات کہنے والی تھی۔''

''حکم۔''

''یہاں رونق پور میں یا......کسی اور گاؤں میں کوئی......''

''جی......''

''میں نے کہا سرکار میں سمجھا نہیں۔''

''کوئی کرتے پہنتا ہے۔''

مالکن نے ایسی بھرائی ہوئی — چیخ مارتی ہوئی آواز میں کہا جیسے کوئی ماں اپنے اکلوتے بیٹے کی موت کی خبر سن کر پھٹ پڑی ہو۔ بوڑھا چودھری گلاب اس عجیب وغریب سوال کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔

''کرتے۔''

''ہاں تم سے کیا چھپانا چودھری گلاب......تم تو اس حویلی کے تنکے تنکے سے واقف ہو تم تو حویلی کی رائی گیری کر چکے ہو اور دائی سے کیا پیٹ چرانا۔ آدمی حق سب چلے گئے — عورتیں اِدھر اُدھر ہو گئیں اتنے بڑے گھر میں اکیلی بیٹھی کوے ہنکایا کرتی ہوں۔ رات تو روتے گزر جاتی ہے مگر یہ پہاڑ ایسے دن چھاتی پر سوار رہتے ہیں ٹالے نہیں ٹلتے ہیں۔ کوئی کرتا ارتا ہوتا تو سینے پرونے میں دل اٹک جاتا۔

حویلی کے بوڑھے راز دار کے تخیل کی آنکھیں بھوکی مالکن کو بلکتا ہوا دیکھ رہی تھیں اور اس کے کانوں میں بے آواز سسکیاں زہر کی بوندیں ٹپکا رہی تھیں۔

''تم کھڑے کھڑے تھک گئے ہو گے چودھری گلاب ——''

''نہیں مالکن —— میں شام تک آ جاؤں گا۔''

''مگر دیکھو۔ کسی ایسے ویسے کا کرتا نہ لے آنا میرے پاس۔''

''نہیں مالکن ——''

''میرا نام نہ لینا کسی سے۔''

''یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے مالکن؟ میں کوئی آج حویلی میں نوکر ہوا ہوں۔''

☆☆☆

سڑک کے کنارے املی کے پیڑ کی جڑ سے چودھری گلاب نے اپنا ٹٹو کھولا اور سوار ہو کر بغیر خان صاحب سے ملے ہوئے تھان گاؤں چلے گئے۔ گھر پہنچ کر دیر تک بیٹھک کے تخت پر سلفہ گڑگڑاتے رہے۔ جب سورج سر پر آ گیا تب چودھرائن نے دروازے سے جھانک کر ''چوکے'' کے تیار ہونے کی خبر دی۔ وہ اونگھتے ہوئے اٹھے۔ آنگن میں نیم کے پیڑ کے نیچے بنے ہوئے پکے کنوئیں کی چبوتریا پر کھڑے ہو کر جھوٹ موٹ نہائے اور سر جھکائے چوکے پر بیٹھ گئے۔ چودھرائن روٹی سینک سینک کر رکھتی جا رہی تھیں۔ مگر وہاں پہلا نوالہ ہی ہاتھوں میں جھول رہا تھا۔

''کا تمرا کچھ جی ماندہ ہے۔''

''ہاں۔''

''تو تھوڑا بہت تو کھائے لیو۔''

''تمرے پاس کتنے روپے ہیں۔''

''روپے؟ مورے پاس اپنی ایک چھدام نائیں ہے بڑے بھیا کے کچھ دام دھرے ہیں۔''

''کتنے ہیں بھلا۔''

''ہیں کوئی دس گھاٹ پچاس۔''

''لے آؤ۔''

''ابھیں۔''

''ہاں''

''پہلے روٹی تو کھائے لیو۔''

''پہلے لے آؤ ——''

چودھری گلاب نے مارکین کی تھیلی سے چالیس روپے کا غذ نکال کر گنے اور تھالی چوم کر

کھڑے ہوگئے۔ چودھرائن پہلے آنکھیں پھاڑے دیکھا کیں پھر بکنے جھکنے لگیں۔ لیکن چودھری گلاب نے ان کی بکواس پر کان نہ دھرے۔ الگنی سے اپنا کرتا اتار پہنا۔ دھوتی باندھی ٹوپی سر پر اور انگوچھا کندھے پر رکھ کر چلے آئے۔ گھاس کھاتے ہوئے ٹٹو کے منہ میں لگام چڑھا دی۔ گھسیٹتے ہوئے تھان کے باہر لائے اور سوار ہوگئے۔ بھوکا ٹٹو اپنی چال بھر چل رہا تھا۔ لیکن چودھری گلاب کے ذہن میں آٹا پیسنے والے کئی انجن دھڑ دھڑا رہے تھے۔ چودھری گلاب میر محمد علی بیگ کے زمانے میں منشی تھے۔ لیکن ان کے مرتے ہی جب حویلی اجڑنے لگی اور بڑے چھوٹے مختار شہد کی مکھیوں کی طرح دوسرے باغوں کی تلاش میں حویلی سے اڑ گئے۔ تب مالکن نے اپنے ایک ایک تنکے کی باقاعدہ دیکھ بھال چودھری گلاب کے سپرد کردی تھی۔ چودھری ان لوگوں میں تھے جو حال کی جیب سے آنے والے بُرے دنوں کا منہ بھرنے کے لیے کچھ نہ کچھ کاٹ کر رکھ لیتے تھے۔ لیکن لڑکوں کی پڑھائی لکھائی اور شادی بیاہ کے جھمیلوں میں سب جمع جتھا پر لگا کر اڑ گیا۔ ان کا بڑا لڑکا تحصیل میں اور دوسرا نہر میں چپڑاسی تھا۔ دونوں خود تنگی ترشی سے بسر کرتے تھے۔ دونوں مڈل پاس تھے۔ لیکن چودھری کے لاکھ دوڑ دھوپ کے باوجود نہ کوئی پٹواری ہوسکا اور نہ پترول، مجبوراً انہوں نے چپڑاسیوں میں بھرتی کرا دیا۔ اب وہ آئے دن منہ کھولے ہاتھ پسارے ان کے سامنے کھڑے رہتے۔ لیکن چودھری خود ہی کھکھ بیٹھے تھے ان کا بھرتا کہاں سے بھرتے اس وقت گھر والی کی بات سے وہ چکر میں پڑ گئے۔ برا کوا اتنا گرہست اور سگھڑ کب سے ہوگیا۔ یہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا وہ یہی سب کچھ الابلا سوچتے ہوئے رونق پور کے گنج میں آ گئے۔ بزازے کی دکان پر انہوں نے اپنا ٹٹو روکا اور اتر کر بہت بڑھیا والی تنزیب کے تھان پرکھنے لگے۔ دو کرتوں کا کپڑا بغل میں مار کر وہ سیدھے حویلی پہنچے۔ دل ہی دل میں اپنے باپ منشی چھمن لال کی پڑھائی ہوئی ساری فارسی کا آموختہ پڑھ کر مالکن سے مخاطب ہوئے اور ان کو یقین دلایا کہ پوری رازداری کے ساتھ وہ چیت پور ٹھاکر گھنشام سنگھ سے کرتوں کا کپڑا لے آئے ہیں۔ یہ کہتے کہتے ان کا حلق سوکھ گیا۔ کانٹے سے پڑنے لگے۔ ساری جان پسینے میں نہا گئی۔ ان کی مٹھی میں دبے ہوئے پچیس روپوں کی پڑیا بھیگ گئی۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ کر کیا بہانہ بنا کر یہ پچیس روپے مالکان کے ہاتھ میں پکڑا دیں۔ آخر وہ ہار کر اپنے لکڑی کے پیروں پر اپنے وجود کا منوں بار گھسیٹتے ہوئے رونق پور کے بنئے کی دکان پر آ گئے۔ رام پرشاد گدی پر بیٹھا گاہکوں کو پڑیاں بانٹ رہا تھا۔ سلام دعا کے بعد انہوں نے مالکان کا حساب مانگا تو پتہ چلا کہ وہ سو سے اوپر ہے۔ اسی لیے تو رام پرشاد نے ان کا سودا بند کردیا تھا۔ اسی لیے تو مالکان کا باورچی خانہ ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ وہ رام پرشاد کی دکان کے تختے پر بیٹھے ہوئے اپنے پچیس روپوں کی پڑیا کو نہارتے رہے۔ بیٹھے رہے۔ پھر اٹھ کر اپنے ٹٹو پر سوار ہوگئے جیسے لڑائی میں ہار مان لی ہو۔

مالکن دیر تک کپڑا لیے جھنگا کھٹولے پر پڑی رہیں۔ انہیں پہلی بار عرفان ہوا تھا کہ کرتا سینے کے لیے صرف ہاتھ کے فن اور آنکھوں کی روشنی ہی کی نہیں سوئی اور تاگے کی بھی ضرورت ہوتی

ہے۔ اور جتنے میں سوئی تاگا آتا ہے اتنے میں ایک وقت کے آلو اور دو وقت کے چنے بھی آتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد خدا نے ان کی سن لی اور ان کی نادن ناخن کاٹنے آ گئی۔ وہ ہڑ بڑا کر اپنے خیالوں کی کچی نیند سے چونک پڑیں اور نادن سے ایسے لہجے میں مخاطب ہوئیں جیسے لہجے میں اگر وہ اپنے سنہرے دنوں میں مخاطب ہوتیں تو وہ سارے رونق پور میں اپنی خوش نصیبی کا ڈھنڈھورا پیٹ آتی۔

''ارے اے قادر کی دِھی۔''

''جی، بی بی۔''

''میرا ایک کام کر دو گی اتنے وقت۔''

''بتایئے۔''

''ذرا لپکی ہوئی رام پرشاد کی دکان چلی جاؤ اور ایک مہین سوئی اور چھوٹی پیچک لے آؤ۔ لیکن اس حرام زادے سے میرا نام نہ لینا۔ نہیں تو ٹکا سا جواب دے دے گا۔ کل میں نے دو پیسے کا نمک، خیر چھوڑ......تم ذرا چلی جاؤ......''

وہ اپنی داہنی کنپٹی پر لیکھ ٹٹولتی ہوئی آنگن پار کرنے لگی۔ مالکن بیٹھی سوچتی رہیں معلوم نہیں کیا سوچتی رہیں۔ جب نادن سوئی تاگا لے آئی۔ تو اسی کی قینچی منگوائی اور کرتے بیونتنے بیٹھ گئیں۔ قینچی چلاتے چلاتے انہیں خیال آیا کہ چودھری چیت پور کے ٹھاکر کا ناپ تولائے ہی نہیں کرتا کیسے کاٹا جائے۔ وہ بجھ کر رہ گئیں۔ تھان گاؤں اچھا خاصا تین چار میل دور تھا۔ اب ایسا آدمی اس وقت کہاں جڑتا جو اسی وقت چودھری کو بلا کر کہتا۔ پھر انہوں نے دیوار پر چڑھتی ہوئی دھوپ دیکھی اور یاد کیا کہ آج منگل کو رونق پور کی بازار ہوتی ہے۔ ممکن ہے ٹھاکر آ جائیں بازار کرنے۔ اپنے اس وہم پر ایمان لا کر وہ ایک بار پھر بڑے حوصلے سے اٹھیں وضو کے بدھنے میں گھڑے سے پانی انڈیلا وضو کیا اور نماز کے لیے وہ چٹائی بچھائی جس پر کپڑے کے پیوند لگے تھے جیسے تیسے نماز کا فرض ادا کیا۔ چھوٹا سا وظیفہ پڑھ کر لمبی سی دعا مانگی کہ اے پروردگار عالم اپنی رحمت کے صدقے میں چیت پور کے ٹھاکر گھنشیام سنگھ کے دل میں یہ نیکی ڈال دے کہ وہ آ کر اپنے کرتے کا ناپ دے جائیں اور میری خوشامد کریں کہ میں کل تک ان کا کرتا سی دوں اور مجھے اتنی طاقت دے کہ میں ساری رات لالٹین کی روشنی میں بیٹھ کر کرتا سی سکوں۔ وہ گڑگڑاتے، گڑگڑاتے نڈھال ہو گئیں۔ اسی جانماز پر نڈھال ہو کر پڑ رہیں۔ تھوڑی دیر بعد قدموں کی چاپ ہوئی۔ مہترانی ہمیشہ کی طرح دو وقتی کمانے آئی تھی۔ وہ نئی امید سے تازہ دم ہو کر اٹھ بیٹھیں۔

''بانکے کی بہو۔''

''بی بی۔''

''بانکے ہیں گھر پر؟''

ذرا جلدی سے جا کے بلا لا......کوئی کام نہیں ہے—بس ایک بات۔

''ذرا جلدی جا کر بلا لا......کوئی کام نہیں۔ بس ایک پوچھنا ہے۔''
وہ الٹے پاؤں چلی گئی۔ پھر دروازے پر صدا بلند ہوئی۔
''سرکار کی بڑھتی ہو — راج پاٹ بنا رہے۔''
''بانکے۔''
''سرکار۔''
''چیت پور تمہاری ججمانی میں ہے؟''
''ہاں حجور۔''
''ٹھاکر گھنشیام کو پہچانتے ہو۔''
''ان کا سرکار کون نا ئیں پہچانت ہے......دور دور تک ان کا نام باجت ہے۔''
''بازار تو آتے ہوں گے۔''
''برابر مالک...... برابر۔''
''تو تم ذرا خیال کر کے ان کو میرے پاس بلا لانا مجھے ایک کام ہے ان سے۔''
''بہت نیک مالک۔ ابہیں لیو آپ...... کا کچھ دور تھوڑے ہے۔''

بانکے تو اپنا چہرہ چمرودھا جوتا بجاتا اور رٹی ہوئی دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔ لیکن اپنی زبان کی دراڑ کی پر مالکن پچھتاتی رہیں شرماتی رہیں اور بیٹھی دعائیں مانگتی رہیں کہ خدا کرے ٹھاکر دروازے پر نہ آئیں۔ میں کیا کہوں گی۔ وہ کیا کہیں گے۔ یا اللہ کچھ ایسا کیجو کہ مرنے والے سامنے میری آنکھیں نہ نیچی ہوں۔

☆☆☆

بانکے نے اپنی بکری کے سوپ پیٹھ پر باندھے اور بازار کے ایک نکڑ پر بیٹھ رہا جہاں اڈّھے کھولے جاتے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بیلوں کے گھنگرو بجاتا اور دھول اڑاتا ٹھاکر کا اڈّھا آ گیا۔ وہ اپنے سوپ سنبھال کر اٹھا ہی تھا کہ ایک گاہک پھاند پڑا۔ اس نے پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر پیسے گنتا ہوا وہ ٹھاکر کے پیچھے بھاگا۔ ٹھاکر آدمیوں کو چیرتے ہوئے رام پرشاد کی دکان پر پہنچے۔ رام پرشاد نے جلدی سے کھڑے ہو کر سلام کیا اور دو ایک گاہکوں کو ہٹا کر دوکان کے باہری پڑے دری ڈال دی۔ ٹھاکر نے بیٹھ کر تولیے سے اپنا منہ پونچھا' پھر اسی سے پیروں کی گرد جھاڑی' نگاہ اٹھائی تو سامنے بانکے جھکا ہوا ڈنڈوت کر رہا تھا۔

''کا ہے رہے''
''ایک اُجر (عذر) ہے''
''ہاں''
''مالکن آپ کو بلائن ہیں۔''

''مالکن''

''ہاں ...... یہاں کے سرکار کی مالکن۔''

''اچھا...... کاہے بلائن ہیں...... کچھ اتا پتا ہے بھلا''

''یو سرکار آپ جان سکتا ہو...... ہم کا نیں معلوم''

ٹھاکر چیت پور کے نمبری زمیندار تھے اور میر محمد علی بیگ مرحوم کے ہوا خواہوں میں تھے۔ مرحوم کے ایک ایک فاتحے میں شریک ہوئے تھے۔ اس کے بعد ادھر بھول کر بھی نہ گزرے تھے۔ اب آج اس اچانک پیام سے گھبرا گئے تھے۔ پھر کچھ سوچ کر فوراً ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ تھوڑی دور گئے تھے کہ چودھری گلاب سے مڈبھیڑ ہوئی۔ چودھری گلاب نے کترا کر نکل جانا چاہا۔ لیکن ٹھاکر نے دبوچ لیا۔

''ارے چودھری۔ ای مالکن کاہے بلائن ہیں ہم کو۔''

چودھری کا خون خشک ہوگیا۔ ننگے بازوؤں پر انگوچھا پھیلا کر بولے۔

''وہ ......وہ...... دراصل ٹھاکر صاحب مالکن نے آپ کو اس لیے تکلیف دی تھی کہ ایک کام کے سلسلے میں انہیں میری ضرورت تھی اور آپ کی سواری تو تھان گاؤں سے نکلتی ہی ہے اسی لیے آپ کو۔''

''اچھا...... میں کہوں کہ ایسی کیا بات آ پڑی۔ پھر ٹھیک ہے......تو مطلب یہ کہ اب وہاں جانے کی چنتا تو ہے نہیں۔''

''اب آپ کیوں تکلیف کریں گے...... میں تو آ ہی گیا۔''

ٹھاکر کے ذہن سے بوجھ ہٹ گیا۔

☆☆☆

مالکن چودھری گلاب کا دیا ہوا کرتا دیکھتی رہیں۔ جو سنلائٹ صابن سے پھینچا گیا تھا اور سنلائٹ صابن کی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ شکنیں تک برابر نہیں ہوئی تھیں۔ پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہی کہ جب رونق پور پر یہ بیتی ہے تو چیت پور پر بھی کچھ نہ کچھ تو گزری ہی ہو گی۔ پھر وہ اسی وقت کرتا کاٹنے بیٹھ گئیں۔ جب تک اندھیرا نہ ہو گیا اور ان کو سوئی نظر آتی رہی وہ اسی طرح پرنم آنکھیں جھکائے اپنی تقدیر کا لکھا پورا کرتی رہیں اور روٹی دال کے خواب دیکھتی رہیں۔ مغرب کی نماز کے بعد انھوں نے پیتل کی وہ لالٹین جلائی جس کی چمنی جگہ جگہ سے ٹوٹی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بھبک اٹھتی تھی، جیسے مالکن کے دکھ پر روتے روتے اس کی ہچکیاں بندھ گئیں ہوں۔ دکھتے ہوئے سر پر چیتھڑے کی پٹی باندھے رنجور آنکھوں سے کپڑا بھڑائے وہ سلتی رہیں۔ اپنے دسترخوان کے چاک کو بھرتی رہیں، اپنی تار تار جیب کو رفو کرتی رہیں۔ جھاگ ایسی تنزیب کے ویرانے میں لکڑیاں چنتی رہیں،

ارہر کی دال چنتی رہیں، اور موتی ایسے صاف صاف گیہوں کے اجلے اجلے آٹے کو گوندھنے کا سامان کرتی رہیں پھر سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اور وہ بے سدھ ہو کر بانس کے جنگلے پر دہری ہو گئیں۔

جیسے جیسے چودھری گلاب کے ٹین کے بکس میں مہین سلائی کے پھول ایسے سبک جل کرتوں کی تعداد بڑھتی گئی ویسے ویسے ان کے چہرے پر جھریوں کا جال اور گہرا ہوتا گیا۔ کھچڑی بال ایک دم سے پک گئے جیسے پلاؤ کے چاول دودھ میں ابال کر کر تھال میں ڈال دیئے گئے ہوں گھر پر سوگ سا چھا گیا۔ گھر والی نے پہلے خود چودھری کو سمجھایا پھر لڑکوں کو ان کے حلقوں سے بلا کر اس مورچے پر لگا دیا۔ پھر تینوں نے مل کر ایک دوپہر کو گھر کے آنگن میں مہا بھارت چھیڑ دی۔ جیسے جیسے بات بڑھتی گئی خون گرم ہوتا گیا۔ چھوٹے نے جو تاڑی کی ایک ہی کھچی میں بولا یا تھا کڑک کر کہا۔

''ارے اماں تم کا جانو...... یو بڈھا اس بڑھیا مالکن سے پھنسا ہے۔''

بوڑھے چودھری گلاب نرائن جن کی جوانی ان کے اپنے سر کی طرح بے داغ تھی، اس الزام کو سن کر دیوانے سے ہو گئے۔ وہ جہاں کھڑے ہوئے چوکھی لڑ رہے تھے وہیں زمین پر دھب سے بیٹھ گئے، یا اس طرح گرے کہ بکھر نہ سکے چھوٹا لڑ کا ثبوت دے رہا تھا۔

''جب بہیا (سیلاب) آئی ہے اوئی سال تو یہ جان پر کھیل اوکا بدمعاس کا بچا دے گئے وہیں، ...... گئے رہیں کہ نائیں گئے رہیں؟ تم اپنے منہ سے بتاؤ اماں۔''

چودھری گلاب نرائن کی بے نور آنکھوں نے گھر والی کے چہرے پر یقین کی پرچھائیں دیکھ لی۔ گویا شکار نے زخمی جانور پر دوسرا فیر کر دیا ہو۔ وہ اپنی کانپتی ٹانگوں پر اپنے وجود کی لاش اٹھا کر اٹھے اور کڑھتے ہوئے دروازے سے نکلے۔ اپنی چوکھٹ ...... اپنے ہاتھوں سے چوما۔ اور بغیر منہ سے ایک لفظ نکالے، بغیر آنکھوں سے ایک آنسو بہائے اس پختہ کنویں پر چڑھ گئے جس کی جگت آدمی بھر اونچی تھی اور اس طرح ٹوٹ کر گرے جیسے گراری تک آ کر جہازی کھڑے رسی ٹوٹ جائے۔ اتنے زور کا دھماکہ ہوا کہ سارا تھان گاؤں الٹ پڑا۔ آدمی کنویں کے اندر اتر گئے۔ چودھری گلاب نرائن نکال بھی لیے گئے لیکن وہ تو اسی قوت مر گئے تھے جب اپنے بیٹے کے منہ سے اپنی مالکن کے ساتھ اپنے تعلق کی بات سنی تھی۔

کہانیوں سے ...... چٹ پٹی کہانیوں سے انسان کو...... گاؤں کے ان انسانوں کو جن کے حواس ہر طرح سے بلبلاتے رہتے ہیں ...... جو پیدائشی محبت ہوتی ہے...... قاتل محبت ہوتی ہے اس محبت نے چودھری گلاب نرائن کی خودکشی کے خاکے میں رنگ بھر لیا اور مشہور ہو گیا کہ مالکن ...... تو چودھری گلاب نرائن پر میر محمد بیگ کی زندگی ہی میں مرتی تھیں۔ ان کے مرنے کے بعد تو اور کھیل کھیلیں۔ منے خان نے کتنا کتنا کہا لیکن وہ چودھری کو چھوڑ کر پاکستان جانے پر رضامند نہ ہوئیں۔

پاکستان جانے پر جہاں لوگ اپنی آل اولاد اپنے محلے دو محلے اپنے گاؤں گرام تک چھوڑ کر چلے گئے۔

پھر مالکن کو علاقے کی وہ آوارہ عورتیں ناک پر انگلی رکھ کر گھورنے لگیں جن کی جوانی کی کالی راتیں عاشقوں کے بوسوں کے چراغوں سے جگمگا چکی تھیں۔ وہ مالکن کو گھور رہی تھی۔ ادھیڑ مالکن کی کمر سیدھی تھی ایک سفید لٹ چاندی کے جھومر کی زنجیر کی طرح ان کی پیشانی پر جھولتی رہتی ہے نازک خدوخال کے سفید چہرے پر بھوک نے سائے ڈال دیئے تھے لیکن برسوں کی حکومت اور امارت کی بخشی ہوئی تاب ابھی مرنہیں پائی تھی۔ ان گنت جاگتی راتوں نے ان کی آنکھوں کا نشہ سکھا دیا تھا۔ لیکن اب بھی جب وہ پلکیں اٹھا کر آنکھیں پوری کھول دیتیں تو مخاطب کی نظریں چوروں کی طرح راستہ ڈھونڈنے لگتیں۔ نوکرانیوں کے سے پھٹے پرانے کپڑوں میں بھی وہ بیگموں کی طرح جگمگایا کرتیں۔ ان کو دیکھ کر تو ایسی جھوٹی کہانی بھی سچی معلوم ہوتی۔ دور دور تک پھیلی ہوئی بکھری ہوئی ٹوٹی ہوئی عمارت کی یادگار میں وہ محرم کی ایک ''روشن چوکی'' کی طرح جھلملایا کرتیں۔ دل ہلا دینے والی یادوں کو مودب قافلے ان کی کم نور آنکھوں کے سامنے سے دبے پاؤں گزرتے رہتے چیت' بیساکھ کے جلتے تپتے دن' ساون بھادوں کی روتی ہوئی کلموہی راتیں ...... سب کھوٹے سکوں کی طرح ان کے وجود کی ''گولک'' میں کھنکھنایا کرتیں اور وہ اس کے بے فیض ''جھناجھن سے بے نیاز چھوٹی چھوٹی مادی کلفتوں کے ناقابل بیان بوجھ میں دبی کراہا کرتیں۔

ایک دن جب وہ چودھری گلاب نرائن کا انتظار کرتے کرتے سوکھ چکی تھی اور ان بھیانک دنوں کا انتظار کرنے لگی تھیں جو ان کے لیے فاقوں کی سوغات لے کر آنے والے تھے کہ چودھری گلاب نرائن کی خودکشی کی کہانی ٹوٹی دیواروں کو پھلانگ کر ان کے کچے آنگن میں چڑیل کی طرح ناچنے لگی۔ قہقہے لگانے لگی ان کے منہ پر تھوکنے لگی۔ رونق پور کی مالکن کے اس منہ پر تھوکنے لگی۔ جس منہ کے سامنے رونق پور کا سارا علاقہ آنکھ اٹھانے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ وہ اٹھ کر بغیر دروازوں کی کوٹھری میں گر پڑیں۔ ننگی زمین کے ٹھنڈے فرش پر دوزانو ہو کر اس خدائے قہار کے سامنے گڑگڑاتی رہیں جو اپنے پیارے بندوں پر اس لیے مصیبتیں نازل کرتا ہے تاکہ ان کے نفس کا تزکیہ ہو سکے۔ ان کے ایمان پر صیقل ہو سکے۔ پھر اسی دن رونق پور کی بتیس سال کی زندگی میں پہلی بار انہوں نے چودھری گلاب نرائن کو مرد کے روپ میں دیکھا۔ انہوں نے دیکھا۔ حویلی کے اندرونی حصے کے دوسرے درجے کے سیاہ ستونوں والے دالان کے پیچھے لانبے کمرے میں جوٹ کی موٹی موٹی چٹائیوں پر فرشی قالین پڑے ہیں۔ ایک طرف چوکے کی مسند پر گاؤ سے لگے ہوئے میر محمد علی بیگ مرحوم بیٹھے ہوئے ہیں۔ دور کونے میں سلگتی ہوئی مہکتی ہوئی سٹک کی کامدار نے ان کی زانوں پر پڑی ہے جس کی گنگا جمنی منہال سے ان کی انگلیاں کھیل رہی نگاہیں دیوار گیر پر جڑی ہوئی ہیں۔ دور کونے سے ان کی انگلیاں کھیل رہی نگاہیں دیوار گیر پر جڑی ہوئی ہیں۔ ان کے سامنے ہاتھی دانت کے نازک کام کی بھاری سی میز ناشتے کی پلیٹوں کا بوجھ اٹھائے خوبصورت کنیز کی طرح

دوزانوں ہے۔ وہ اپنی مسہری سے اٹھیں ایک ہاتھ سے فرشی پائجامے کے بھاری پائینچے لیے دوسرے ہاتھ سے استنبولی بیل سے جھولتے ہوئے دوپٹے کا پلو سنبھالا۔ موٹے موٹے زیوروں سے ہلکی ہلکی زریں جھنکار پیدا کرتی ہوئیں ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور ان کے ململ کے کرتے کی ملی دلی آستین پر انگشتانوں اور انگوٹھیوں سے مرصع ہاتھ رکھ کر بولیں۔

''تم اتنے اداس کیوں ہو......''

''اداس......نہیں تو''

''نہ تو تم نے غسل کیا......نہ ناشتہ کیا......کتنی دیر سے اسی طرح بیٹھے ہو—''

''ہوں''

''ایک بات کہوں''

''ہوں''

''غصہ تو نہ کرو گے۔''

''اُہ۔ہوں''

''حکیم ڈاکٹر دوائیں کرتے ہیں نصیبے بنانے ...... مجھ کوکھ جلی کے مقدر ہی میں اولاد نہیں ہے تو حکیم ڈاکٹر کیا کر لیں گے......میری مانو......دوسری شادی۔''

''چپ رہو''

وہ اتنے زور سے گرجے کہ باورچی خانے میں کام کرتی ہوئی عورتوں کے ہاتھ سوکھ گئے' کتنی ہی دیر تک ویسی ہی بھیانک خاموشی مسلط رہی۔ پھر ایک عورت سائے کی طرح چلتی ہوئی آ کر تخت کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ مالکن نے اشارے سے پوچھا: ''کیا ہے''

تھان گاؤں والا گلاب نرائن ڈیوڑھی پر کھڑا ہے۔''

''بلاؤ''

دالان کے پردے بندھے تھے۔ کمرے کے دروازوں پر چلمنیں پڑی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک اوسط قد کا سوکھا سا کھا سا آدمی آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے کرتے کے ایک مونڈھے پر پیوند لگا تھا۔ نسبتاً اجلی دھوتی پر گھٹنے کے پاس پھانک سلی ہوئی تھی دھوتی سے نکلی ہوئی سوکھی ماری پنڈلیاں گرد میں اٹی ہوئی تھیں۔ پنجے جوتے میں بند ہونے کی وجہ سے صاف تھے۔ اس کا سر گھٹا ہوا تھا۔ ٹوپی میں میل کی گوٹ تھی۔ وہ سہا ہوا کھڑا تھا اور دونوں ہاتھوں سے ایک جھولا سنبھالے ہوئے تھا۔

''دوا لے آئے۔''

''ہاں سرکار''

اس آدمی نے گڑگڑا کر کہا۔

''دے دو''

اس نے دروازے پر کھڑی ہوئی عورت کو اس طرح جھولا پکڑا دیا جیسے وہ جھولا نہیں شیشے کا پیالہ ہے اور اس میں لبالب عطر بھرا ہوا ہے...... پھر آواز آئی۔

اس کو گلاب دو آنے پیسے اور خوراک دلوا دو۔

اب ان کے آنسو خشک ہو گئے تھے اور وہ یادوں کے میلے میں کھو گئی تھیں۔ جب وہ اپنے آپ کو ملیں تو دھوپ آنگن میں اترنے لگی تھی۔ اور ذہن میں آئے ہوئے جان دینے کے سارے منصوبے دیوالی کے چراغوں کی طرح بجھ چکے تھے۔ وہ باہر نکلی ہی تھیں کہ کمر پر ٹوکرا رکھے اور آدھ بھر کا گھونگھٹ نکالے بانکے کی بہو کمانے آ گئی۔

''ارتم چیت پو جاؤ گی''

''ہاں بی بی''

''تو ذرا ٹھاکر سے کہہ دینا کہ شام کو اگر بازار آئیں تو مجھ سے مل لیں۔''

''بہت اچھا''

مالکن اتنا کہہ کر باورچی خانے کی طرف مڑی ہی تھیں کہ وہ دروازے پر کچھ تند تیز آوازیں شریر لڑکوں کی طرح اچھلنے پھاندنے لگیں۔ مالکن کی نگاہوں کا اشارہ پا کر مہترانی گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک لانبی دبلی عورت کے ساتھ واپس آئی جو لال کنارے کی سفید دھوتی پہنے تھی۔ مہترانی نے اس عورت کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔

''ای تھان گاؤں والے چودھری گلاب کیری چھوٹی بہو ہیں...... لیلا دھر کی دلہن۔''

مالکن چونک پڑیں۔ پھر اپنے اعصاب کو سنبھال کر یہ سوچنے لگیں کہ اسے کس طرح مخاطب کریں اور کیا بات کریں کہ اس نے اپنی بغل سے مڑے ہوئے کرتے نکالے اور مالکن کے ہاتھ میں پکڑا کر ہر جذبے سے خالی آواز میں منمنائی۔

''اے کرتے آپے دھر لیو۔''

جملہ پورا کرتے ہوئے وہ تیر کی طرح آنگن ختم کر کے ٹیڑھی میڑھی اونچی نیچی دیواروں کے پیچ و خم میں غائب ہو گئی۔ ذرا دیر تک مہترانی نے ان کا جائزہ لیا اور دوسرا گھر کمانے چلی گئی۔ مالکن پھول سے کورے داہنے ہاتھ میں اٹھائے آنگن میں کھڑی رہیں۔ جیسے زندگی کی لڑائی میں ہار مان لی ہو اور مصیبتوں کے فاتح لشکر کے سامنے سفید جھنڈا کھول دیا ہو۔

شام کو ڈیوڑھی پر کھڑے ہوئے چیت پور کے ٹھاکر گھنشیام سنگھ سے مالکن کہہ رہی تھیں۔

''اپنے کرتوں کی تنزیب تو آپ بھیجتے رہیے گا لیکن پہلے میرے یہ چاروں کرتے بکوا دیجئے۔''

❁ ❁ ❁

اوپندر ناتھ اشک

بینگن کا پودا

اگر چہ ماہی رام نے وہ بینگن کا پودا اکھاڑ دیا ہے۔ پھر بھی جب میں ترکاری کے کھیت کی مینڈھ پر سے ہوتا ہوا اپنی کوٹھی کو جاتا ہوں تو میری آنکھوں میں بینگن کا وہ سوکھا ہوا پودا اور اس پر لٹکتا ہوا مرجھایا یا پچکا زرد بینگن گھوم جاتا ہے۔

☆☆☆

سردیوں کے مختصر سے دن گزرے دیر ہو چکی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد جب میں ایک لمبا چکر لگا کر نیچے کھدر کی موٹی بنیان۔ اس پر چھوٹا گرم انڈرویر' اس پر موٹے کھدر کی قمیض اس پر اچکن اور گلوبند اور ان سب کے اوپر اوورکوٹ پہنے ہاتھ میں بیڑی لیے اپنے لوہے کی ایڑی والے فلیکس بوٹوں کی ٹھک ٹھک میں مست' دسمبر کی تیکھی ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لیے کانوں کو اوورکوٹ کے کالروں میں چھپاتا ہوا اپنی کوٹھی کے برآمدے میں داخل ہوا تو وہاں ایک میلی سی چارپائی پر ایک نحیف ونزار بوڑھے کو اندھیری کالی رات کی طرح کالا خستہ اور بوسیدہ لحاف لپیٹے دیکھ کر کچھ ٹھٹھک گیا۔

''کیوں بھائی کیا بات ہے؟'' میں نے اوورکوٹ کی جیبوں میں پڑے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لا کر کہا۔

''کچھ نہیں بابو جی' میں ماہی رام کا آدمی ہوں۔''

''ماہی رام ہی کے سہی' لیکن اتنی سردی میں تم اس کھلے برآمدے میں کیوں پڑے ہو؟''

''میرے پاس کپڑا ہے بابو جی۔''

میں نے چپ چاپ اپنا کمرہ کھولا۔ 14 لائن کا ڈٹ مارکہ بڑا لیمپ جلتا چھوڑ گیا تھا اگر چہ اوپر کے دونوں روشندان کھلے تھے' پھر بھی کمرہ گرم ہو گیا تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی گرم لیکن مٹی کے تیل میں لپٹی ہوئی تیز بو کا بھبکا آیا۔ بارہا میرے دوستوں نے مجھے اس طرح لیمپ جلا کر چھوڑ جانے سے منع کیا ہے''۔ شہر کی گندی فضا کو چھوڑ کر اس کھلے ماحول میں رہنے کا فائدہ ہی کیا' اگر شہر کی مضر عادتوں کو نہ چھوڑا جائے اکثر کہا کرتے ہیں اور بتایا کرتے ہیں کہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق

کمرے کو بند کر کے اندر لیمپ جلائے رکھنا بہت نقصان دہ ہے۔ سانس کے راستے گندی ہوا پھیپھڑوں میں جاتی ہے پر اس کا دباؤ پڑتا ہے۔ میں بارہاں بو محسوس بھی کرتا ہوں لیکن۔ لیکن مجبور ہو جاتا ہوں۔ جب بھی کبھی دروازہ کھول کر بیٹھتا ہوں اور تیز ہوا کا جھونکا اندر آتا ہے اور میرے ہاتھ یخ ہو جاتے ہیں اور قلم چلنے سے انکار کر دیتا ہے۔ تو میں اٹھ کر کواڑ بھیڑ دیتا ہوں — جیسے سگریٹ پینے والوں کو اس کی کڑوی کسیلی سر چکرا دینے والی بو اچھی لگتی ہے۔ کچھ اسی طرح ...... یہ سب مجھے بھی اچھا معلوم ہونے لگا ہے۔

ہیٹ کو کھونٹی پر ٹانک کر اور گلوبند کو سر اور کانوں کے ارد گرد لپیٹ کر میں کام پر آ بیٹھا۔ بیٹھ تو گیا لیکن میرا دھیان برآمدے ہی کی طرف لگا رہا۔

اس بوڑھے کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا — صبح ہی دیکھا تھا۔ وہ بینگن کے پودے چھانٹ رہا تھا — اور کمیونٹی کچن (مشترکہ باورچی خانہ) سے گھر آتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے؟ اس نے بتایا تھا کہ بینگن کا پودا دوبار پھل دیتا ہے' ایک بار چھانٹ دیا جائے تو اور بھی پھلتا پھولتا ہے۔ میں نے ان سوکھے پتوں سے محروم بینگن کے پودوں پر نگاہ ڈالی تھی۔ ایک پودے پر ایک مرجھایا ہوا سوکھا' سکڑا' پچکا زرد رو بینگن لٹک رہا تھا۔ وہاں سے ہٹ کر میری نظر اس بوڑھے پر جا ٹکی — اس کی عمر نہ جانے کتنی تھی — لیکن وہ بے حد معمر دکھائی دے رہا تھا۔ اگرچہ اس نے سردی سے بچنے کے لیے کھیس اوڑھ رکھا تھا۔ پھر بھی اس کے لکڑی کے سے پتلے ہاتھ' بانس سی ٹانگیں' سوکھا چرمخ چہرہ' اور آنکھوں کے حلقے صاف نظر آتے تھے۔ اس وقت ایک عجیب سا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا۔ بینگن کا پودا جب سوکھ جاتا ہے تب چھانٹ دینے پر پھر سے پھل لے آتا ہے۔ سانجنا چھانٹنے پر بھی پہلے سے زیادہ بڑھتا ہے۔ نباتات میں ایسے درختوں' پودوں کی کمی نہیں' جو چھانٹنے پر پہلے سے بھی زیادہ پھلتے پھولتے ہیں۔ مثلاً ...... دُوب ...... سبنیحیحا ...... میتھی۔ تو انسان کو خدائے برتر نے ایسا کیوں نہ بنایا — لیکن وہیں کھڑے کھڑے جیسے مجھ سے کسی نے کہا کہ انسان کی بیل بھی تو امر ہے۔ موت اس کی قینچی ہے۔ مرد عورتیں بچے اور بوڑھے اس کے پھل پھول پتے اور شاخیں ہیں۔ جب یہ سوکھ جاتے ہیں یا گل سڑ جاتے ہیں۔ یہ قینچی انہیں کاٹ دیتی ہے اور ان کی جگہ نت نئے ہرے بھرے زندگی کی حرکت سے دھڑکتے' چھلکتے' کودتے' ہنستے' ناچتے گاتے پھول اور پتے لگتے ہیں اور زندگی کی امر بیل پھلتی' پھولتی' جھومتی جھامتی چلی جاتی ہے۔

لیکن یہ بوڑھا یہاں سردی میں کیوں آ پڑا ہے؟ کیا اس کا کوئی گھر گھاٹ نہیں اور اپنی اس محویت سے ذرا چونک کر میں نے پوچھا۔ ''کیوں جی تم ہو کون؟''

''جی میں ماہی رام کا آدمی ہوں۔''

''ہاں ماہی رام کے آدمی تو ہو۔لیکن ماہی رام کے کیا ہوتے ہو؟''

بوڑھا کچھ جواب دینے لگا تھا کہ اسے کھانسی کا دورا پڑا۔کئی لمحے لگاتار کھانسنے کے بعد اپنی سانس کو مشکل سے درست کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ وہ رشتہ میں ماہی رام کا کچھ نہیں لگتا۔وہ اس کا ہم وطن ہے۔اس کا کنبہ بہت بڑا ہے۔پانچ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' اور بیوی ہے۔دو لڑکیاں ہیں۔ بیاہنے کے قابل' اور وہ روزگار کے لیے ماہی رام کے ساتھ آ گیا ہے۔

اس کی آواز میں کچھ ایسا سوز تھا کہ کام کرنا میرے لیے ناممکن ہوگیا۔میں اتنے کپڑے پہنے کے باوجود پتلون پر کمبل ڈال کر بیٹھا ہوں اور وہ غریب سردی میں باہر پڑا ہے۔بستر کے نام پر شاید ایک پھٹی دلائی اس کے پاس ہے اور وہ میلا کالا لحاف بھی برسوں کا پرانا ہے۔قریب قریب پگھل کر میں نے کہا۔''تو بھائی اندر لیٹ جاؤ' باہر تو بڑی سردی ہے۔برآمدہ دونوں طرف سے کھلا ہے۔ باہر تم کیوں بیٹھے ہو یوں؟''

لیکن اسی وقت سمینٹ کے فرش پر بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی اور دوسرے لمحہ ماہی رام — وہ ٹھیکیدار گوپال داس کا چھ فٹ تین انچ لمبا میٹ دروازے پر آ کھڑا ہوا۔بڑی سی پگڑی' اس کے نیچے کالا موٹا کمبل' گھٹنوں تک دھوتی اور پاؤں میں سیر سوا سیر کا جوتا۔ایک دن چھ مولیوں کے لیے وہ ایک میل تک ایک آدمی کے پیچھے دوڑتا چلا گیا تھا اور وہاں پکڑ کر اس نے وہ وہ پٹخنیاں دی تھیں کہ پھر اس نے کبھی ادھر کا رخ نہ کیا تھا۔

''ہم نے اسے خود یہاں سلایا ہے' بابو جی''۔ماہی رام نے کہا۔نہ جانے کون سالا رات کو کھیتوں میں ڈاکہ ڈالتا ہے۔دو تین دن دیکھتے دیکھتے ہو گئے سارے کھیت میں گوبھی کے ایسے پھول نہ ملیں گے۔پرسوں کوئی تمام پکے ہوئے ٹماٹر اتار کر لے گیا۔آپ جانتے ہیں کہ کچن کو ترکاری بھی سپلائی کرنی پڑتی ہے۔پھر دو سو روپے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے وہ بھی تو اسی میں سے پورا کرنا پڑتا ہے اور پھر مزدوروں کی مزدوری۔''

لیکن ترکاری میں کون ڈاکہ ڈالنا چاہتا ہے۔یہاں تو کبھی چوری ہوتے سنی نہیں میری کوٹھی سنسان جگہ میں ہے۔پاس میں کوئی کوٹھی نہیں۔لیکن میں تو دروازے کھلے چھوڑ کر گھنٹوں غائب رہتا ہوں۔

''نہیں بابو جی' باہر کا آدمی اتنی سردی میں صرف دس گوبھی کے پھول لینے نہیں آ سکتا۔''

''لیکن اس دن مولیاں......''

وہ اور بات تھی بابو جی۔وہ تو کوئی راہ چلتا آدمی تھا۔جاتے جاتے اکھاڑ کر لے گیا۔یہ کوئی یہیں کا ہے۔میں سالے کو پکڑ کر ایسا سبق سکھاؤں گا کہ عمر بھر کسی چیز کو ہاتھ نہ لگائے''۔اور اس کے موٹے موٹے ہونٹ پھیل گئے اور چیچک کا مارا ہوا چہرہ تن گیا۔

''لیکن بھائی اگر چاہو تو اسے اندر سلا دو۔''

''نہیں بابو جی سردی تو آپ امیروں کو لگتی ہے' اسے تو یونہی محض دکھاوے کے لیے یہاں سلا دیا ہے۔ ورنہ رکھوالی تو میں خود کروں گا۔ ان مونگروں کے پیچھے بیٹھ کر! یونہی یہ سمجھ کر کہ بوڑھا سو گیا ہے' کوئی آیا کہ میں نے دھر دبوچا۔''

اور وہ ہنسا۔

''لیکن اس کے پاس کپڑے......''

''کافی کپڑے ہیں اس کے پاس بابو جی۔''

یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ بوڑھے کو پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔

میں کام میں منہمک ہو گیا۔ لیکن مجھ سے کام ہو نہیں سکا۔ میرے سامنے ان دونوں کے مالک کی تصویر کھنچ گئی — ٹھیکیدار گوپال داس۔ دھن دولت' اولاد اور بے فکری سے اس کے گال اس پچاس سال کی عمر میں بھی گلاب کی طرح سرخ تھے۔ اس ہڈیوں میں پیوست ہونے والی سردی میں جب یہ بوڑھا باہر پڑا ہے وہ اپنے گرم لحاف میں لیٹا دہکتی ہوئی انگیٹھی سے گرم اپنے کمرے میں مزے سے گپیں ہانک رہا ہو گا۔ تاش یا شطرنج کھیل رہا ہو گا......''

اور یونہی سوچتے سوچتے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ کچھ غنودگی سی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ کھانا زیادہ کھا گیا تھا — کپڑوں کا بوجھ میں نے لاد رکھا تھا اور کمرہ خوب گرم تھا۔ میں اٹھا' کچھ ضروری کاغذ' قلم اور دوات لے کر سونے کے کمرے میں چھوڑ آیا۔ میں نے سوچا کہ کل ذرا سویرے اٹھ کر کام کروں گا۔ دفتر کے کمرے کو تالا لگاتے ہوئے میں نے ایک بار پھر بوڑھے سے پوچھا کہ — ''اگر وہ چاہے تو دفتر کو کھلا چھوڑ دوں۔ لیکن نہیں نہیں بابو جی' میرے پاس کافی کپڑے ہیں''۔ اس کا جواب سن کر قفل بند کر کے میں اپنے چھوٹے سے گرم کمرے میں چلا گیا۔ بستر بچھا ہوا تھا صرف لحاف پر کمبل میں نے ڈال لیا اور کپڑے بدل کر لیٹ گیا۔

بستر برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ میں نے پاؤں سکیڑ لیے اور پھر انہیں آہستہ آہستہ پھیلا دیا۔ کئی طرح کے خیالات دماغ میں گھومنے لگے۔ بے ربط بے ترتیب' لیکن لحاف کی گرمی سے آنکھیں بوجھل ہو گئیں اور بند......

سوتے سوتے کبھی ماہی رام کبھی اس بوڑھے اور کبھی اس کے مالک ٹھیکیدار کی صورتیں میرے سامنے آنے لگیں۔

میں نے دیکھا کہ ماہی رام نے چور پکڑ لیا ہے اور وہ اس مارتا مارتا پاس کے گاؤں دیرو کے تک لے گیا ہے اور سب گاؤں والوں کو جمع کر کے اس نے اعلان کیا ہے کو جو بھی ہماری سبزی چرائے گا اسے ایسے سزا دی جائے گی۔ اتنا کہہ کر وہ پھر چور کو زدوکوب کرنے لگتا ہے۔ چور

نہایت پردرد نگاہوں سے اس کی طرف تکتا ہے اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ وہ ٹھیکیدار گوپال داس کے سوا کوئی نہیں ــــ وہی گھٹا ہوا سر' وہی پھولے ہوئے گال اور وہی چپٹی چوکور ناک!

میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا پاؤں سے رضائی اتر گئی ہے۔ کھانا زیادہ کھا جانے کی وجہ سے سینہ کچھ زیادہ بھاری ہے اور گلا سوکھا جا رہا ہے۔

سرہانے رکھے ہوئے جگ سے پانی پی کر اور اچھی طرح سے لحاف اوڑھ کر دونوں طرف سے اُسے پاؤں کے نیچے کر کے میں پھر لیٹ گیا۔ باہر ہوا مکانوں سے ٹکریں مار رہی تھی درخت حتیٰ الامکان اس کا مقابلہ کرتے ہوئے جوش کی شدت سے چنگھاڑ رہے تھے ــــ شاں شاں ــــ شاں شاں اور دور بادل کی گرج اور رعد کی کڑک بھی سنائی دے رہی تھی۔ لیکن گرم ہو کر جسم ڈھیلا پڑنے لگا اور پھر سو گیا۔

اس بار کیا دیکھتا ہوں کہ زور کی بارش ہو رہی ہے۔ تیز ہوا چلتی ہے۔ پاؤ پاؤ بھر کے اولے پڑتے ہیں ــــ ساری سبزی تباہ ہو جاتی ہے۔ کیاریوں میں پانی بھر جاتا ہے۔ صرف مرجھائے ہوئے سکڑے سمٹے پیلے زرد بینگن کا وہی پودا کھڑا رہ جاتا ہے۔ پھر وہ بینگن میرے سامنے بڑا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ اس کی شکل اس بوڑھے کی سی بن گئی ہے۔ گھٹنوں کے بازوؤں میں لے کر چھاتی سے لگائے وہ سکڑا' سمٹا' ننگا' اپنی لمبی چوٹی کے سہارے لٹک رہا ہے۔ اولے اس کے سر پر لگتے ہیں اور وہ اسی بینگن کے پودے کے ساتھ لٹکا ہوا جھولتا ہے۔

پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ بینگن کا پودا بڑا اونچا' نہ جانے جامن کا' نہ جانے آم کا درخت بن جاتا ہے۔ لوگوں کی بھیڑ نیچے کھڑی شور مچا رہی ہے ــــ بوڑھا مر گیا۔ بوڑھا پھانسی لگا کر مر گیا۔

پھر میرے کانوں میں صرف مر گیا ــــ مر گیا ــــ کی آواز آئی ہے۔ اور ایسا لگتا ہے کہ وہ شاخ ٹوٹ رہی ہے۔ کڑ کڑ...... کڑ کڑ......

میری آنکھ کھل گئی ــــ دیکھا کوئی زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔

سرہانے رکھی ہوئی جرابیں پہن کر سر پر ٹوپی رکھ اور کمبل کو اچھی طرح لپیٹ کر میں اٹھا ــــ دروازہ کھولا ــــ دیکھا تو کالونی کے سکریٹری صاحب دوسرے کئی اصحاب کے ساتھ کھڑے ہیں۔

''کیا بات ہے''۔ میں نے پوچھا

''رات آپ کے برآمدے میں بوڑھا مر گیا؟''

''میں نے دیکھا ــــ اسی میلی سی کالی جیکٹ چارپائی پر اپنے گرد وہی میلا لحاف لپیٹے بوڑھا جھکا ہوا پڑا ہے۔ اس کا جسم اکڑ گیا ہے۔ اور آنکھیں پھٹی پڑتی ہیں اس کا لحاف بھیگ گیا ہے۔ دور دور تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے اور برآمدے کا سارا فرش گیلا ہے۔

''میں نے رات ہی اس سے کہا تھا کہ دروازہ کھلا......'' میں نے کہنا شروع کیا۔

میں چائے کے لیے کچن سے دودھ لینے جا رہا تھا کہ اسے بارش میں بھیگتے پایا۔ آواز دی لیکن ہلا تک نہیں۔ آ کر دیکھا تو معلوم ہوا رات سردی میں اکڑ گیا ہے''۔ اور ٹھیکیدار کے آدمی سے انہوں نے کہا کہ اسے اٹھوانے کا انتظام کیا جائے۔

☆☆☆

دو دن بعد کچن کو جاتے ہوئے اچانک رک کر میں نے ماہی رام سے کہا۔

''خدا کے لیے اس پیلے سے بینگن کے پودے کو اکھاڑ دو۔''

''میری آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ ماہی رام حیران سا میری طرف دیکھنے لگا اور پھر اس نے کہا۔ ''بہت اچھا سرکار!''

خواجہ احمد عباس

بارہ گھنٹے

دسمبر کا مہینہ!

سٹیشن ماسٹر کے دفتر کا گھنٹہ پونے آٹھ بجا رہا تھا۔ گاڑی کے آنے میں اب بھی پندرہ منٹ باقی ہیں۔ بینا نے سوچا اور پلیٹ فارم کے چکر لگانے لگی۔

چھوٹا سا سٹیشن۔ نہ کتابوں اور اخباروں کی دکان' نہ کوئی ہوٹل' چائے کی ایک پیالی ملنی بھی ممکن نہیں۔ بس دو کمروں کی چھوٹی سی عمارت۔ ایک کمرے میں سٹیشن ماسٹر کا دفتر' دوسرے میں ٹکٹ گھر' ٹکٹ گھر پر بھیڑ تو نہیں تھی۔ دو کسان گاڑھے کی چادروں میں لپٹے' کانوں کو رات کی ٹھنڈی ہوا سے بچانے کے لیے ڈھاٹا باندھے' برآمدے میں بیٹھے تھے۔ دور سگنل کی روشنی اندھیرے میں چمک رہی تھی۔

بینا ساڑھی پر ایک سویٹر پہنے ہوئے تھی۔ اس پر ایک اُونی چادر مگر اس وقت اس کو سردی نہیں لگ رہی تھی۔ جب سے وہ انقلابی پارٹی میں شامل ہوئی تھی' یہ پہلا موقع تھا کہ ایک اہم کام اس کے سپرد کیا گیا تھا۔ اسی خیال سے اس کے دل کی دھڑکن تیز تھی اور باوجود برفیلی ہوا کے اس کے گال تمتما رہے تھے۔ کیا وہ یہ کام بخوبی انجام دے سکے گی؟ کوئی گڑبڑ تو نہ کر بیٹھے گی؟ گھبرا تو نہ جائے گی؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اس نے سوچ سمجھ کر انقلابی پارٹی میں شرکت کی تھی۔ وہ بڑے سے بڑا کام کرنے کو تیار تھی۔ اس نے اپنی جان کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ اور یہ بالکل معمولی کام تھا۔ لیڈر نے جو ہدایات دی تھیں وہ اب تک بینا کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

''دیکھو ہمارا پرانا ساتھی وجے سنگھ سولہ برس کی جیل کاٹ کر آ رہا ہے مگر ہمیں معلوم ہوا ہے کہ شہر پہنچتے ہی اس کو پھر گرفتار کر لیا جائے گا۔ کیونکہ پولیس ڈرتی ہے کہ اس کی واپسی سے انقلابی پارٹی کا اثر اور زیادہ بڑھ جائے گا۔ اس لیے تم اسے رام نگر کے سٹیشن پر ہی اتار لینا۔ رات بھر وہ تمہارے مکان پر ٹھہرے گا اور صبح کو وہ شہر آ کر اپنے آپ کو پولیس کے سامنے گرفتاری کے لیے پیش کر سکتا ہے۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ دوبارہ جیل جانے سے پہلے کم از کم بارہ گھنٹے تو آزاد رہے۔ یہ خط تم اسے دے دینا اور اس کا جواب جو وہ لکھے پارٹی کے دفتر میں پہنچا دینا۔''

''رات بھر وہ تمہارے مکان پر ٹھہرے گا''۔ مگر بینا کا مکان تو دو چھوٹے چھوٹے کمروں سے زیادہ نہیں تھا۔ ساٹھ روپے ماہوار پانے والی سکول کی استانی ایسے بڑے مکان کا خرچ کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ پھر وہ رہتی بھی تھی اکیلی۔ نہ کوئی رشتہ دار' نہ نوکر' اپنا کھانا بھی خود ہی پکاتی تھی۔ ان حالات میں ایک غیر مرد کا اکیلے مکان میں اس کے ساتھ رات گذارنا!— بینا کی پرورش ایک مذہبی' رواج پرست گھرانے میں ہوئی تھی۔ اگرچہ کالج کی تعلیم اور انقلابی خیالات نے اس کا دماغ کافی حد تک آزاد کر دیا تھا۔ پھر بھی اس کے دل کی نچلی تہہ میں سماج کا خوف سمایا ہوا تھا۔ لوگ کیا کہیں گے؟ اور ساتھ ہی ایک جوان مرد کی قربت کی ناقابل بیان کشش' جنسی تجربے کی دبی ہوئی خواہش' خواہش بھی اور خوف بھی۔ وہ جوان تھی مگر مرد کی آغوشِ محبت سے نا آشنا۔ وہ کتابی علم کی بنیاد پر جنسیات پر اصولی بحث کر سکتی تھی مگر اس کے عملی پہلوؤں سے بالکل ناواقف تھی۔ ہاں قدرت نے ازخود اس کے بدن میں ایک عجیب سی گدگدی' ایک عجیب سی چبھن اور میٹھا میٹھا درد پیدا کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی ایک ہو دوا ہے مگر شادی سے پہلے اس دوا کی خوراک پینا یہ بھی تو اتنا آسان نہ تھا۔

دُور اندھیرے میں سگنل کی لال روشنی سبز روشنی میں تبدیل ہو گئی۔ پلیٹ فارم کے سامنے کی ریل کی پٹریاں اپنی جھنجھناہٹ سے آنے والی ٹرین کی خبر دینے لگیں۔ بینا کی توجہ جنسی مسائل سے ہٹ کر وجے سنگھ کی طرف مبذول ہو گئی جو ابھی چند منٹ میں رام نگر پہنچنے والا تھا۔ جو رات بھر — بارہ گھنٹے — کے لیے اس کا مہمان تھا وجے سنگھ۔ انقلابی پارٹی میں اس نام کی دھوم تھی۔ اس کے انقلابی کارناموں کو آج تک یاد کیا جاتا تھا۔ آج وہ سولہ برس کی قید کاٹ کر واپس آ رہا ہے۔ کل شاید پھر کسی کال کوٹھری میں بند کر دیا جائے۔ یہی اس کی زندگی تھی۔ وہ اپنے اصولوں پر جان کی بازی لگا چکا تھا۔ وہ نہ قید خانے سے ڈرتا تھا نہ پھانسی کے تختے سے۔ بینا نے پارٹی کے دفتر میں لگی ہوئی وجے سنگھ کی تصویر دیکھی تھی۔ شاندار وجیہہ جوان چوڑا چکلا سینہ' اونچی پیشانی اور چمکدار کالی آنکھیں جو تصویر کے پردے میں سے بھی دلوں کو گرما دیتی تھیں۔ خوبصورت آنکھیں' خوفناک آنکھیں' ان کی گہرائی میں جنون تھا۔ مگر ان کی سطح پر بچوں کی سادگی کھیل رہی تھی۔ ناممکن تھا کہ کوئی ان آنکھوں کو دیکھے اور ان کا شکار نہ ہو جائے۔ بینا نے ان آنکھوں سے انقلاب کا سبق سیکھا تھا۔ اپنے اصولوں کے لیے مر مٹنے کی تمنا— اور آزادی کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کی حسرت۔ سب کچھ جان' مال' عزت' ہاں عزت بھی۔ جب کبھی اس کا قدم انقلاب کی دشوار گذار راہوں پر ڈگمگاتا' بینا ان آنکھوں کی طرف دیکھتی اور ایک لمحے میں اس کا دل ایک نامعلوم طاقت سے بھر جاتا اور پھر اس میں ہر مشکل' ہر مصیبت کا سامنا کرنے کی ہمت پیدا ہو جاتی۔ مگر یہ آنکھیں ایک انقلابی ہی کی نہیں' ایک مرد کی آنکھیں بھی تھیں۔ ان میں ایک حیوانی کشش بھی تھی' ایک جنون انگیز شرارہ' ممنوعہ لذتوں کا ایک اشارہ' اُس دلفریب دنیا کی ایک جھلک جس کا دروازہ سماج نے بینا جیسی غیر شادی شدہ لڑکیوں

کے لیے بند کر رکھا تھا۔ مگر یہ دروازہ توڑا بھی جا سکتا ہے۔ بینا اپنی پارٹی ہی میں کئی ایسی لڑکیوں کو جانتی تھی جنہوں نے اس خیالی دروازے کو توڑ کر آزاد جنسی تعلقات کی سرزمین میں قدم رکھا تھا کیا آج کی رات وہ بھی وجے سنگھ کی مدد......؟ وہ اس خیال ہی سے شرما گئی۔ ایسی باتیں سوچنی بھی نہیں چاہئیں۔ مگر کیوں نہیں۔ وجے سنگھ خوبصورت ہے، جوان ہے، تندرست ہے اور اس کی آنکھوں میں دلفریب مسرتوں کا پیغام ہے۔

ٹرین پلیٹ فارم پر پہنچ گئی۔ بینا کے خیالات کا تار ٹوٹ گیا اور وہ وجے سنگھ کی تلاش میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑنے لگی۔ کہیں اس کا پتہ نہ ملا۔ کسی درجے میں بھی پارٹی کے دفتر والی تصویر سے ملتا جلتا مسافر نہ تھا۔ ٹرین سے اترا تو بس ایک مجہول شخص، بڈھا فقیر، دونوں کسان برآمدے سے اٹھ کر ایک تھرڈ کلاس کے بھرے ہوئے ڈبے میں گھس گئے۔ انجن نے سیٹی دی اور ٹرین چل دی۔ تو کیا وجے سنگھ اس گاڑی سے نہیں آیا؟ کیا اس کو پہلے ہی گرفتار کر لیا گیا؟ مگر وہ بڈھا کیوں پلیٹ فارم کی لالٹین کے نیچے بینا کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا؟

''کیا آپ مِس بینا ہیں؟'' فقیر کی آواز میں نفاست تھی۔

اور جب بینا نے 'ہاں' کہا تو اس کی نگاہ بڈھے کی آنکھوں پر پڑی — آنکھیں جو ایک جھاڑ جھنکار ڈاڑھی میں سے اس طرح چمک رہی تھیں جیسے گھنے جنگل میں کسی خوبصورت مکان کی دو کھڑکیاں جگمگا رہی ہوں۔

''آپ......ہی......کامریڈ وجے سنگھ ہیں؟''

''ہاں مجھے پارٹی سکریٹری کا تار پچھلے سٹیشن ہی پر مل گیا تھا کہ مجھے اس سٹیشن پر اترنا ہے اور یہ کہ تم مجھے لینے آؤ گی۔

''چلیے''

بینا وجے سنگھ کو اپنے گھر لے آئی۔ کھانا تیار کر کے گئی تھی۔ وہ ایک تھالی میں پروس کے اس کے سامنے رکھ دیا۔ بغیر ایک لفظ کہے اس نے کھانا شروع کر دیا۔ یہ بھی نہیں پوچھا ''تم نہیں کھاؤ گی؟''

بینا پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ وجے سنگھ انہماک سے کھانے میں مصروف تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے کتنے ہی دن کے فاقے کے بعد کھانا ملا ہے۔ بینا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے یہ سوچ کر کہ سولہ برس تک دھول ملی روٹی اور تیل میں پکی ہوئی دال کھانے کے بعد اس کو آج انسانوں کی خوراک نصیب ہوئی ہے۔ وہ وجے سنگھ کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ وہ چوڑے چکلے سینے، اونچی پیشانی، چکنے بالوں والا وجے سنگھ ہے جس کی تصویر پارٹی کے دفتر کے دیوار پر ٹنگی تھی؟ نہیں یہ وہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا سر گنجا ہے اور اس پر مدتوں تک نہ نہانے کی وجہ سے پھنسیوں اور میل کے کھرنڈ جمے ہوئے ہیں۔ اس کی داڑھی، آدھی کالی آدھی سفید۔ خوفناک طریقے سے اُگی ہے۔ ہونٹوں کے اوپر اور نیچے کے بال

شاید دال کے دھبے لگتے لگتے زرد ہو گئے ہیں۔ دانت کچھ غائب ہیں اور کچھ زردی مائل۔ ناخن بڑھے ہوئے اور میل سے بھرے ہوئے۔ باوجود شدید احساس ہمدردی کے بینا یہ سوچ کر کانپ اٹھی کہ ٹرین آنے سے چند سیکنڈ پہلے ہی وہ اسی شخص کے ساتھ جنسی زندگی کی پہلی منزل طے کرنے کا ارادہ کر رہی تھی۔

وجے سنگھ نے کھانا ختم کر لیا تو بینا نے کہا ''اب آپ نہا کر کپڑے بدل لیجئے۔ پارٹی والوں نے آپ کے لیے یہ کپڑے بھیجے ہیں۔ میں غسل خانے میں یہ گرم پانی رکھی دیتی ہوں''۔ یہ سن کر وجے سنگھ نے اپنے پھٹے پرانے کپڑوں پر نظر ڈالی۔ جیسے اس کو دفعتاً اپنی غلاظت کا احساس ہوا۔ بغیر ایک لفظ بولے وہ غسل خانے میں چلا گیا۔ سولہ برس کا طویل عرصہ اس نے اکیلے کال کوٹھڑی میں گزارا تھا۔ اسی لیے اُس کو انسان سے بات چیت کرنے کی علادت ہی نہ رہی تھی اور بینا جیسی نوجوان لڑکی کی موجودگی میں تو ایسا چپ ہو گیا تھا جیسے گونگا ہے۔

نہا کر وجے سنگھ نے صاف کپڑے پہنے اور انگیٹھی پر ہاتھ تاپنے لگا جو بینا نے سردی کے خیال سے جلا رکھی تھی۔ لال لال کوئلوں کی روشنی میں اس کی آنکھوں میں بینا کو ہلکی سی مسرت کی جھلک دکھائی دی۔ جیسے انگاروں پر سے راکھ جھٹک دی گئی ہے۔ اس نے بینا سے قینچی مانگ کر اپنے ناخن کاٹے اور پارٹی سکریٹری کا خط پڑھنے بیٹھ گیا۔ بینا کو معلوم تھا کہ اس خط میں پچھلے سولہ سال کے سیاسی واقعات پر تبصرہ ہے۔ انقلابی پارٹی کی کارروائی رپورٹ ہے۔ جوں جوں وجے سنگھ اس کو پڑھتا تھا اس کی وہی پرانی انقلابی چمک واپس آتی جا رہی تھی۔ غصہ' افسوس' خوشی' سب جذبات اس کی آنکھوں کے آئینے میں یکے بعد دیگرے نظر آ رہے تھے۔ رپورٹ پڑھتے ہی وہ پھر انقلابی لیڈر تھا۔ دوبارہ گرفتار ہونے سے پہلے اس کو اپنی پارٹی کو ہدایات دینی تھیں۔ اس نے بینا سے قلم اور کاغذ مانگا اور خط کا جواب لکھنے بیٹھ گیا۔ مگر اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ چکی چلاتے چلاتے قلم پکڑنے کی عادت ہی نہ رہی تھی۔

خط ختم کر کے اس نے بینا کو دیا کہ اگلے دن حفاظت سے سکریٹری تک پہنچا دے۔

بینا نے گھڑی دیکھی' ابھی صرف سوا نو بجے تھے۔ خاموشی توڑنے کے لیے اس نے کہا:

''ابھی آپ سونا چاہتے ہیں یا......! کچھ دیر اور بیٹھنا ہے۔''

وجے سنگھ کا جواب سن کر وہ دنگ رہ گئی۔ ''میں سینما دیکھنا چاہتا ہوں۔ بولتا سینما''۔ دفعتاً بینا کے دماغ میں سولہ برس قید کے ہولناک نتائج کی ایک جھلک بجلی کی طرح کوندگئی۔ سولہ برس 27ء سے 43ء تک یعنی وجے سنگھ نے کوئی ٹاکی ہی نہیں دیکھا تھا۔ نہ اس نے سہگل کی آواز سنی تھی نہ رمولا کا حسن دیکھا' نہ کانن بالا کے رسیلے گانے اور چندر موہن کا کمال اداکاری۔ وہ تو بولتی تصویروں کے جادو سے اتنا ہی ناواقف تھا جیسے افریقہ کے تاریک ترین جنگلوں میں رہنے والا۔ سولہ برس وہ زندگی

کے دلچسپ اور خوشگوار پہلوؤں سے محروم رہا تھا۔ سینما اور تھیٹر' گانا اور ناچ' بچوں کی آواز غروب آفتاب کا رنگین منظر' چاند اور ستارے' برسات کی رم جھم اور گیلی مٹی کی خوشبو۔ درختوں کی چھاؤں' پھولوں کی بہار' ماں کی ممتا' اولاد کی اُمنگ عورت کا پیار۔ کچھ بھی نہیں بس ایک گندی اندھیری کوٹھڑی۔ جیل کے افسروں اور وارڈروں کی کرخت آوازیں۔ عادی مجرموں' ڈاکوؤں اور خونیوں کا ساتھ۔ زندگی کے سمندر میں موت کا یہ جزیرہ۔ انسانیت کی حدود سے باہر۔ دنیا کے بیچ میں۔ مگر دنیا سے بہت دور اور یہاں سے وجے سنگھ نے سولہ برس یعنی ایک سو بانوے مہینے تقریباً چھ ہزار مصیبت بھرے دن اور چھ ہزار کالی راتیں اور اس کے بعد صرف بارہ گھنٹے زندگی ہے' بارہ گھنٹے روشنی' رنگ اور خوشبو کے۔ اس کے بعد پھر جیل خانے کے مہیب کالے دروازے بند ہو جائیں گے۔

''میں سینما دیکھنا چاہتا ہوں' بولتا سینما''۔ بچپن کی سادگی کے ساتھ وجے سنگھ نے کہا تھا۔ ہر انسان کی فطرت میں بچپن ہوتا ہے اور انقلابی بھی تو آخر انسان ہے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ آج کی رات اس کے دل میں سینما دیکھنے کی یہ شدید آرزو پیدا ہو گئی۔ کیا معلوم ہے اب جو وہ جیل جائے تو پھر کبھی زندہ نہ نکلے' شاید سینما دیکھنے کی حسرت دل ہی میں رہ جائے۔

رام نگر میں ایک ہی معمولی سینما تھا جہاں کئی سال کی پرانی ہندوستانی فلمیں دکھائی جاتی تھی۔ بینا تو وہاں ایک دفعہ بھی نہ گئی تھی۔ مگر وجے سنگھ کو لے کر گئی۔ تماشا شروع ہونے ہی والا تھا۔ جب وہ ٹکٹ لے کر داخل ہوئے روشنیاں گل ہو گئیں اور روپہلی پردے پر تصویروں نے حرکت شروع کر دی۔ فلم تھا ''طوفان میل''۔ پرانا زٹیل فلم' مگر وجے سنگھ کے لیے تو معجزے سے کم نہ تھی۔ تصویروں کو چلتے پھرتے تو اس نے ضرور قید ہونے سے پہلے دیکھا تھا مگر گاتے بولتے دیکھ کر وہ بالکل دنگ رہ گیا۔ چارلی اور غوری کے بھونڈے مذاق پر وہ بچوں کی طرح ہنسنے لگا۔ کھلکھلا کر تالیاں بجا کر۔ دوسرے تماشائی مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔ بینا کو پہلے تو ذرا کوفت ہوئی۔ مگر فوراً ہی اس کو یہ خیال آیا کہ شاید سولہ برس میں پہلی بار وجے سنگھ ہنس رہا ہے۔ اور یہ خیال آتے ہی اس کو ''طوفان میل'' فلم بھی اچھی لگنے لگی۔

مادھوری اور بلیموریا پردے پر محبت کا رنگین کھیل کھیل رہے تھے۔ بیباک' بے پروا' حیوانی محبت' وہ محبت نہیں جو شب فراق کے آنسوؤں میں ظاہر ہوتی ہے۔ بلکہ وہ محبت جو قہقہوں اور معنی خیز نگاہوں میں جھلکتی ہے۔ مادھوری ایک چست' بدن سے چپکے ہوئے لباس میں مجسم آرزو بنی ہوئی تھی۔ شہوانیت کا ایک شرارہ جس کی قربت ہر ایک کو جھلس دینے کو کافی تھی۔ اُف رے اس کی شرارت آمیز شہوت خیز باتیں۔ کٹیلی نظر' وہ اُس کا سینہ کے ابھار پر ہاتھ رکھ کر ایک عجیب انداز سے کہنا ''ہائے' یہاں۔''

وجے سنگھ بڑے انہماک سے فلم دیکھ رہا تھا۔ مگر اُس کا ہاتھ۔ کیا یہ بھول سے بینا کے ہاتھ پر رکھا گیا تھا۔ چکی پیستے پیستے ہاتھ سخت ہو گیا۔ مگر پھر بھی اس میں ایک قسم کی نرمی تھی۔ کسی زمانے میں

یہ ہاتھ نازک اور حساس رہا ہوگا۔ انگلیاں اب بھی لمبی اور نازک تھیں وجے سنگھ تماشا دیکھ رہا تھا اور اس کا ہاتھ بینا کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ وہ بینا کے ہاتھ کو دبانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ ''شاید غلطی ہی سے یہ ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھا گیا ہو''۔ بینا نے سوچا اور نرمی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

ہال میں اندھیرا تھا۔ مگر پھر بھی بینا کو ایسا محسوس ہوا جیسے وجے سنگھ کو اس کا ہاتھ ہٹا لینا برا معلوم ہوا ہے۔ اس کے بعد فلم میں اس کی دلچسپی اور انہماک بھی ختم ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں اُس نے کہا۔ چلو گھر چلیں۔ بس دیکھا لی فلم''۔ اور جب وہ سڑک پر روشنی میں آئے تو وجے سنگھ اب روٹھے ہوئے بچے کی طرح زمین پر نظریں جمائے چل رہا تھا۔

گھر پہنچ کر بینا نے اپنے پلنگ پر وجے سنگھ کے لیے بستر درست کر دیا اور اس سے کہا کہ آرام سے سو جائے کیونکہ صبح ہی اس کو شہر جانا تھا۔ اس کے بعد اس نے دوسرے کمرے میں فرش پر دری بچھا کر اپنے سونے کا انتظام کیا۔ ایک گلاس پانی بھر کر وجے سنگھ کے سرہانے رکھ دیا اور پوچھا: ''اور کچھ چاہیے''۔ وجے سنگھ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ مگر بینا نے بجلی کی روشنی میں دیکھا کہ اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر گڑی ہوئی ہیں اور ان آنکھوں کی گہرائی میں وہی جنون، ان کی سطح پر وہی بچوں کی سی سادگی اور ساتھ ہی وہ حیوانی کشش بھی ہے جو پارٹی کے دفتر والی تصویر میں تھی۔ بینا کے دیکھتے ہی آنکھیں دھندلا گئیں اور ان میں آگ کی بجائے دھواں سا، تحکم کی بجائے التجا سی جھلکنے لگی۔ بینا نے جلدی سے روشنی بند کی اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔

مگر دونوں کمروں کے درمیان جو دروازہ تھا اس کی چٹخنی اس طرف لگتی تھی جدھر وجے سنگھ کا پلنگ تھا۔ بینا نے کواڑ بھیڑتے ہوئے آواز دی ''مہربانی کر کے چٹخنی لگا لیجیے گا''۔ یہ کہہ کر وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی اور انتظار کرتی رہی کہ چٹخنی بند کرنے کی آواز آئے۔ ایک منٹ، پانچ منٹ، دس منٹ اور بینا کو ایسا محسوس ہوا کہ جب تک چٹخنی بند نہ ہو گی اسے نیند نہ آئے گی۔ مگر چٹخنی بند نہ ہوئی۔

بینا نے سوچا ''کیا وجے سنگھ سو گیا ہے؟'' مگر دوسرے کمرے سے پلنگ پر کروٹیں بدلنے کی آواز آئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اٹھ بیٹھا ہو۔ پھر کمرے میں چلنے کی آواز وہ سویا نہ تھا ٹہل رہا تھا۔

بینا کو وجے سنگھ کی بے چینی کی وجہ معلوم تھی۔ اس لیے کہ وہ خود اس بے چینی کی وجہ تھی۔ سولہ برس کی تنہائی اور بے لطف زندگی کے بعد ''طوفان میل'' کی بیباک محبت کے سین دیکھ کر اس کے سوئے ہوئے جذبات جاگ اٹھے تھے اور اپنی تسلی چاہتے تھے۔ کل صبح وہ پھر جیل چلا جائے گا یہی چند گھنٹے باقی تھے۔

بینا نے اب تک اپنے آپ کو جنسی لذتوں سے محروم رکھا تھا۔ کیا اسی لیے کہ ایک کریہہ المنظر لمبی داڑھی والے، گندے اور بیمار بوڑھے کی ہوس کی آگ بجھائے؟ اس نے ہمیشہ ایک

خوبصورت' تندرست نوجوان کے خواب دیکھے تھے۔ نوجوان جو اس سے محبت کرتا ہو۔ اس کے ساتھ اپنا تمام جیون بتانے کو تیار ہو۔ کہاں اس کے سپنوں کا وہ کڑیل جوان اور کہاں یہ مرجھایا ہوا بڈھا! نہیں ہرگز نہیں۔ وہ ہرگز! ایسا نہیں کر سکتی۔

مگر بینا کے حساس مگر ہمدرد دماغ نے اسی صورتحال کو دوسری طرف یوں پیش کیا۔ ''بیشک وجے سنگھ قبل از وقت بڈھا ہو چکا ہے۔ اس کے چہرے پر خوفناک داڑھی ہے۔ اس کی پیشانی پر جھریاں پڑی ہوئی ہیں۔ اس کے سر پر پھنسیاں نکلی ہیں' اس کے منہ سے زرد اور گندے دانت جھانک رہے ہیں مگر کیوں؟ بینا سوچ' سولہ برس ہوئے۔ یہی وجے سنگھ ایک خوبصورت کڑیل جوان تھا۔ تو نے اس کی تصویر دیکھی ہے۔ کیا تو نے اس تصویر کی طرف تمنا بھری نظروں سے نہیں دیکھا؟ آج اسی وجے سنگھ کی یہ حالت کیوں ہے؟ کیوں؟ سولہ برس میں پچیس برس کا نوجوان اتنا بڈھا تو نہیں ہو سکتا۔ وجے سنگھ کیوں اپنی جوانی' اپنا حسن' اپنی تندرستی کھو بیٹھا؟ انقلاب کے لیے۔ بینا۔ انقلاب کے لیے۔ اسی انقلاب کے لیے جس کی خاطر تو جان دینے کو تیار ہے۔ مگر تو تو باتیں ہی بناتی ہے۔ اس نے تو کر دکھایا۔ اپنی جوانی' اپنی تندرستی' اپنے دوست اور عزیز' اپنے رومان بھرے خواب' سب کچھ انقلاب کے لیے قربان کر دئے۔ سولہ برس جیل میں کاٹے' کال کوٹھڑی میں رہا' کوڑوں کی مار کھائی' وارڈروں کی ٹھوکریں کھائیں گالیاں سنیں کس لیے؟ انقلاب کے لیے' اور تو' تیرا دل اتنا چھوٹا ہے کہ آج تو اس وجے سنگھ کی داڑھی' اس کی جھریوں اور اس کی پھنسیوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے' لعنت ہے تجھ پر۔''

دوسرے کمرے میں وجے سنگھ اب بھی ٹہل رہا تھا۔ قدم چلتے چلتے دروازے کے قریب آئے اور رک گئے۔ بینا کا دل بھی حرکت کرتے کرتے رک گیا۔ نہ چٹخنی بند کرنے کی آواز آئی نہ دروازہ کھلا۔ چند سکنڈ کے بعد قدم واپس چلے گئے۔ بینا کا دل پھر حرکت کرنے لگا۔

نہیں وہ اپنی طرف سے پہل نہیں کرے گا۔ وہ حساس ہے' اس کو اپنی بدصورتی کا علم ہے۔ وہ تجھے چھیڑنے کی ہمت نہ کرے گا۔ اگر تو اس کمرے میں نہیں جائے گی تو وہ رات بھر ٹہل کر گذار دے گا اور صبح کو ایک لفظ کہے بغیر پھر جیل چلا جائے گا۔ جس نے سولہ برس یوں گذار دیئے وہ تو باقی زندگی بھی گذار سکتا ہے۔ مگر تو نے اس کو مایوس لوٹ جانے دیا تو اپنے آپ کو تو کبھی معاف نہ کر سکے گی۔ اس کی حسرت اور آرزو بھری نگاہیں ہمیشہ تیرا پیچھا کرتی رہیں گی۔''

وجے سنگھ کے قدم چلتے چلتے رک گئے۔ پلنگ پر بیٹھنے کی آواز آئی۔ پھر لیٹنے کی۔

''شاید سو جائے''۔ بینا نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر فوراً ہی کروٹیں بدلنے کی آواز آئی اور یہ کیا؟ کیا بینا کے کان دھوکا دے رہے تھے' یا واقعی وجے سنگھ رو رہا تھا؟ بینا گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ وجے سنگھ رو رہا ہے! وجے سنگھ جس کے متعلق مشہور ہے کہ جب اُسے کوڑے مارے گئے تو وہ ہنستا رہا تھا۔ وجے سنگھ جو پھانسی کا حکم پا کر بھی مسکرایا تھا۔ وہی وجے سنگھ جس نے پچاس دن بھوک

ہڑتال کی تھی۔ جو نہ قید سے ڈرتا تھا نہ مار سے‘ جو موت سے گھبراتا تھا نہ کالے پانی کی سزا سے۔ وہی وجے سنگھ آج رو رہا ہے۔ بچوں کی طرح سسکیاں لے لے کر۔

وجے سنگھ کی آنکھیں بینا کے شہوانی جذبات کو بیدار نہ کر سکی تھیں۔ اس نے بینا کے ہاتھ کو چھوا تھا۔ مگر یہ پیغام بے کار ثابت ہوا تھا لیکن اس کو روتا دیکھ کر بینا کی مامتا جاگ اٹھی۔ بچوں کی ہر ضد پوری کرنی چاہیے اور ہندوستان کا سب سے بڑا انقلابی‘ نڈر وجے سنگھ بھی اس معاملے میں بچہ ہی تو تھا۔ باوجود اپنی داڑھی‘ اپنی پھنسیوں اور میلے میلے زرد دانتوں کے۔

بینا کے دل کی تہہ میں سے رواجی اخلاقیات نے سر اٹھایا اور اس کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ''عصمت عورت کا بہترین زیور ہے۔ کیا تو اس کو یوں لُٹا دے گی؟'' اور جب یوں بھی نہ مانی تو اس کو ڈرانے کی کوشش کی۔ ''وہ بیمار ہے اس کے پھنسیاں نکلی ہوئی ہیں۔ تجھے کوئی بیماری لگ جائے گی۔''

مگر بینا اس وقت ان خوفناک سولہ برسوں کا خیال کر رہی تھی جو وجے سنگھ نے قید میں گذارے تھے۔ وہ طویل عرصہ جس میں وہ زندگی کی ہر دلچسپ اور خوشگوار رنگینی سے محروم رہا تھا۔ سینما اور تھیٹر گانا اور ناچ‘ بچوں کی آواز‘ غروب آفتاب کا رنگین منظر‘ چاند اور ستارے‘ برسات کی رِم جھم اور گیلی مٹی کی خوشبو۔ اور کل پھر وہ اسی دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔ اور یہ زندگی کے بارہ گھنٹے یوں ہی گذر جائیں گے۔ وجے سنگھ اپنی پیاس کو ساتھ لیے واپس چلا جائے گا۔ وہ جس نے اپنی جان قوم کی آزادی اور انقلاب کے لیے قربان کر دی تھی۔ اس کے واسطے ایک عورت چند گھنٹے کے لیے اپنا جسم بھی دینے کو تیار نہ ہو گی۔ عورت نرمی پیار‘ دل کے قریب ایک اور دھڑکن‘ سولہ برس تک وہ ان سے محروم رہا اس وقت اس کو اگر یہ نصیب نہ ہوا تو شاید مرتے دم تک نصیب نہ ہو۔

نہیں وہ ایسا نہ ہونے دے گی۔ اس نے اپنی جان انقلاب کے لیے وقف کر دی تھی۔ اپنی جان‘ اور اپنا جسم‘ اپنی عصمت بھی‘ وجے کی قربانیوں کے سامنے اس کے حقیر جسم کی کیا وقعت تھی۔ اس سے بہتر جسم بازار میں پانچ پانچ روپے میں فروخت ہوتے ہیں۔ نہیں وہ اپنی محبت سے‘ اپنے بدن کی گرمی سے وجے سنگھ کو آرام پہنچائے گی۔ چند گھنٹے میں سولہ برس کی محرومیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس کے بدن میں وجے سنگھ کو چند لمحے کے لیے ہی سہی‘ پھولوں کی بہار‘ بچوں کی آواز‘ ماں کی مامتا‘ موسیقی کا جھنکار غروب آفتاب کی رنگینی‘ برسات کی رِم جھم۔ سب کچھ مل جائے گا اور آئندہ زمانے میں جب وہ جیل کی سختیوں سے تنگ آ کر دنیا اور زندگی کی طرف سے مایوس ہونے لگے گا تو اسے ان چند گھنٹوں کی یاد آئے گی۔ ایک لڑکی کی یاد۔ ایک نوجوان جسم کی یاد‘ اور وہ مسکرا دے گا۔ مایوسی کے بادل چھٹ جائیں گے۔ وہ زندگی سے منہ موڑتے موڑتے رک جائے گا۔ وہ اپنے جسم اور دماغ اور دل کو زندہ رکھے گا۔ ہندوستان کی خاطر — انقلاب کی خاطر۔ اور پھر

جب ملک آزاد ہو جائے گا تو وجے مایوس اور شکستہ خاطر نہیں بلکہ مسکرتا ہوا قید خانے سے نکلے گا تاکہ پھر اپنی قوم اور اپنے ملک کی خدمت کر سکے۔ لاکھوں اس کی کہانی سنیں گے اور اس کی قربانی اور ایثار سے ان کے سر بلند ہو جائیں گے اور دل فخر سے بھر جائیں گے۔ اس وقت شاید وجے سنگھ بینا کا نام بھی بھول جائے گا۔ انقلابی حکومت کو چلانے کے کام میں اس کو ایک گمنام لڑکی کو یاد کرنے کی فرصت کب ہوگی۔ مگر اس وقت بینا کو وہ احساس فتح نصیب ہوگا جو ایک آرٹسٹ کو اپنا شاہکار دیکھ کر نصیب ہوتا ہے۔

بینا اٹھی، دروازہ کھولا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

❀ ❀ ❀

رضیہ سجاد ظہیر

کچھ تو کہیے

جاوید نے حسب دستور سائیکل ایک جھٹکے کے ساتھ برآمدے میں چڑھائی دھڑام سے دروازہ کھولا۔ اندر والے برآمدے میں چائے میز پر لگی تھی اس پر ایک نظر ڈالی اور ہاتھ دھونے لگا۔

شوہر کے آنے کی آہٹ پا کر یاسمین ہاتھ میں نمک پاروں کی بھری ہوئی پلیٹ لیے نکلی۔

جاوید بیوی کو دیکھتے ہی بولا: ''یسمی بھئی ساڑھے تین بجے سے میچ ہے اور تین بج رہے ہیں' میرے کپڑے نکال دیئے ہیں۔''

یاسمین آہستہ سے بولی: ''ہاں نکال دیئے ہیں—''

جاوید اپنے میچ کے چکر میں اس قدر مصروف تھا کہ اسے نہ تو یاسمین کے چہرے پر بدلتے ہوئے جذبات نظر آئے نہ لہجے کی افسردگی کا احساس ہوا' کھٹاک سے کرسی کھینچ کر وہ چائے پر ڈٹ گیا—

جاوید باہر نکلا تو یاسمین دروازہ بند کر ہی رہی تھی کہ اسے دور سے پروین آتی ہوئی دکھائی دی' پروین کو آتے دیکھ کر یاسمین کو نہ جانے کیوں ایک دم سے وہ دن یاد آئے' جب وہ پروین کے برابر تھی کیا امنگوں کا زمانہ تھا— آئینہ دیکھنے کے کچھ معنی تھے' پھولوں میں رنگینی ایک بات تھی خوشبو میں ایک کیفیت تھی' قدم قدم پر زندگی اور نئی اور بہاراں لگتی تھی' پھر انعام کی صورت اس کی نظروں میں پھرنے لگی انعام جو اس کو چاہتا تھا' اسے پیار کرتا تھا' اسے اپنے گھر کی رانی بنانے کی تمنا رکھتا تھا—اب وہ نہ جانے کہاں ہوگا' اتنے برس ہوئے جب معلوم ہوا تھا کہ کلکتہ میں ہے کسی فرم میں ہے اور شادی نہیں کی ہے۔ شعر بہت اچھے کہتا ہے۔ شعر تو وہ جب بھی بہت اچھے کہتا تھا— وہ کیا کہا تھا اس نے......

پروین نے دور سے ہی آواز دی ''ہلو امی'' اور پھر دوڑتی ہوئی آ کر اسے لپٹ گئی: ''امی— ذرا تکلیف کر کے ہمارا گلابی جوڑا استری کر دیجئے— وہ اختری کی سالگرہ ہے— ہم اسے پریزنٹ تو وہ دے دیں گے عطر حنا کی شیشی جو......'' عطر حنا کے ذکر پر یاسمین کو اپنی شادی کا شروع کا زمانہ یاد آ گیا— کبھی کبھی انسان کو نہ جانے کیا ہو جاتا ہے کہ یادیں آتی ہی چلی جاتی ہیں— جب بھی باہر جانا ہوتا تو جاوید یاسمین کے کپڑے خود انتخاب کرتا' جاوید کے دفتر سے آنے کا وقت ہوتا تو یاسمین خاص اہتمام سے تیار

رہتی — پروین اور اصغر جب تک چھوٹے رہے تو وہ بھی اپنی امی کے تیار ہونے کا انتظار کرتے رہتے اور پھر اُسے آنکھیں پھاڑے دیکھا کرتے — اصغر کے خیال پر اس کو یاد آیا کہ کل ہی اس کا خط علی گڑھ سے آیا تھا جس میں ایک بات بار بار دہرائی گئی تھی: ''میرے گرم کپڑے سب ٹھیک کر دیجئے گا۔ ڈبیٹ میں کانپور جا رہا ہوں، واپسی میں لکھنؤ سے ہوتا ہوا آؤں گا۔''

یاسمین نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اب زندگی کتنی عجیب ہو گئی تھی کئی سال سے اس نے اچھے کپڑے پہننے چھوڑ دیئے تھے، کہتی تو وہ یہی تھی اب میں کیا پہنوں پروین پہنے گی، لیکن اصل بات یہ تھی کہ وہ کس کو دکھانے کے لیے پہنتی، جاوید اب اس سے فرمائش ہی نہیں کرتا تھا کہ یہ پہنو وہ پہنو — وہ خود سے جاوید کے لیے بن سنور کر کیوں اپنی ناک نیچی کرتی۔ آخر کہہ کے تو کسی سے محبت نہیں کی جا سکتی جاوید تو فٹ بال اور برج میں مصروف رہتا تھا۔ اور اصغر اور پروین ہر وقت اپنی پڑھائی اور اپنے دوستوں میں لگے رہتے تھے۔ ویسے تو لگتا تھا کہ گھر میں ہر شخص کو اس کی ضرورت ہے لیکن اس کی ذات جیسے ویٹنگ روم بن گئی تھی کہ سب ہی گاڑیاں ٹھہرتی تھیں پر اپنا وقت ختم کر کے چلی جاتی تھیں — سب ہی مسافر اترتے تھے پر اپنے اپنے رستے نکل لیتے تھے — بیٹا بیٹی شوہر سب اس کے محتاج تھے مگر اپنی ضرورت کے لیے اپنے آرام کے لیے — اس کی ذات سے پیار کرنے والا اس کے درد کو محسوس کرنے والا کوئی بھی نظر نہیں آتا تھا — اس نے پھر ایک ٹھنڈی سانس بھری — اور پروین کا گلابی جوڑا نکالنے لگی۔ پروین کے جانے کے بعد وہ اصغر کے گرم موزے رفو کرنے بیٹھ ہی رہی تھی کہ دستک ہوئی ''محمود — دیکھ دروازے پر کون ہے۔ کہہ دینا صاحب نہیں ہیں۔''

محمود ایک پرچہ لیے ہوئے واپس آیا اور یاسمین کی طرف بڑھتا ہوا بولا: ''بیگم صاحب کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔''

پرچے پر نظر پڑی تو رفو کی سوئی یاسمین کی انگلی میں دھنستے دھنستے رہ گئی! اسے یوں لگا کر سترہ سال کسی کونے میں جا چھپے اور پرانا زمانہ خزاں کے کسی سوکھے پتہ کی طرح کہیں سے اڑتا ہوا یکا یک اس کے قدموں پر آ گرا — اس کے سامنے حروف اور الفاظ ناچ رہے تھے ''انعام الرحمٰن — کلکتہ۔''

وہ اٹھی بہکتے قدموں اور دھڑکتے دل سے کھڑکی کی آڑ سے باہر نظر ڈالی — ہاں انعام ہی تھا، وہی لمبا قد گھونگریالے بال البتہ ان میں کافی سفیدی آ گئی تھی — ویسی ہی نیلی ٹائی اور فاختئی سوٹ ہاتھ کی انگلیوں میں اسی ادا سے سگریٹ دبا، دوسرا ہاتھ اسی طرح پتلون کی جیب میں پڑا۔

یاسمین نے دروازہ کھولا اور بغیر انعام کی طرف دیکھے مڑ کر اندر چلنے لگی، وہ پیچھے پیچھے آیا، میز پر لگے چائے کے برتنوں کو دیکھ کر بولا: ''واہ بھئی بڑے موقع سے آئے ہم — تم چائے پی چکیں۔''

یاسمین نے کرسی کا ہتہ پکڑا' آہستہ سے بہکتے ہوئے الفاظ میں بولی: ''تم پیو گے۔''

''ضرور — لیکن یہاں نہیں — تم...... اگر تیار ہو جاؤ تو کہیں چلیں۔''

پھر آہستہ سے بولا: ''کوئی گلابی ساری ہو تو پہننا۔''

یاسمین کو عجیب لگا — مدتوں کے بعد کسی نے اس سے کہا کہ ایسے رنگ کے کپڑے پہنو —

جاوید میچ جیت کر آیا — داخل ہوتے ہی آواز دی۔

''سیمیں'' — خالی گھر میں ایک گونج سنائی دی۔ — سیمیں''

کمرے میں چاروں طرف سناٹا چھایا تھا اور ایسے آثار نمایاں تھے کہ یاسمین جلدی میں تیار ہو کر کہیں گئی ہے — سینٹ کی ہلکی سی خوشبو فضا میں رچی تھی' تکیہ پر پڑی ہوئی کنگھی میں دو چار بال الجھے ہوئے تھے' پلنگ کے نیچے جوتے کا ڈبہ اوندھا پڑا تھا جس کے معنی تھے کہ وہ نئی سینڈل پہن کر گئی ہے — چھوٹی میز پر وہ ڈبہ کھلا پڑا تھا — جس میں یاسمین اپنے بندے اور ہار رکھتی تھی مدتوں بعد نظر آیا یہ ڈبہ — تو وہ بُندے بھی پہن گئی تھی' شاید ہار بھی — پھر اسے یکا یک خیال آیا کہ ایک عرصہ سے یاسمین نے زیور پہننا چھوڑ دیا تھا' نہ کپڑوں ہی کا کوئی خاص خیال کرتی تھی — اور اگر یاسمین کا جو دل نہ چاہتا تھا کہ جاوید کے لیے خوبصورت کپڑے پہنے' زیور پہنے' بنے سنورے پھر جاوید کیوں اس سے کہہ کر بھرم کھوتا؟ آخر کہہ کے تو کسی سے محبت نہیں کروائی جا سکتی' وہ کیوں اپنی ناک نیچی کرتا؟ — اس نے ایک سگریٹ نکال کر منہ میں لگایا اور اس طرح ماچس جلائی جیسے اپنے آپ کو اور اس سارے گھر کو پھونک کر رکھ دے گا — جلتی دیا سلائی سگریٹ تک پہنچا ہی چاہتی تھی کہ صدر دروازہ کھلا' یاسمین کی ہنسی کی آواز آئی' پھر خدا حافظ سنائی دیا' بھاری قدموں کے واپس لوٹنے کی آہٹ آئی اور یکا یک یاسمین اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی — وہ جیسے حیران سا رہ گیا — سترہ سال پہلے کی یاسمین پھر زندہ ہو گئی تھی! گلابی ساری' بالوں میں پھول گلے اور کان میں زیور' پاؤں میں نئی سینڈل اور پھر وہ یکا یک ہنس پڑی — سترہ سال پہلے کی ہنسی جاوید کے کانوں میں گونجنے لگی — مدتوں بعد سنائی دی یہ ہنسی!

''کیا دیکھ رہے ہو بھئی'' یاسمین ذرا جھینپ کر بولی — ''دیکھتا ہوں کہ...... تم ایک دم سے اتنی اچھی کیسے لگنے لگیں'' — یاسمین چپ رہی! جاوید نے کرسی پر پہلو بدلا آہستہ سے بولا تمہیں یاد ہے شادی کے دوسرے دن بڑی باجی والی دعوت میں تم نے گلابی ساری پہنی تھی — اس دن بھی یہ رنگ تم پر بہت اچھا لگ رہا تھا اور آج بھی......''

یاسمین مسکرائی اور گردن آگے بڑھا کر بہت دھیمے سے شکایتی لہجے میں بولی: ''لیکن اس دن اور آج کے دن کے بیچ میں تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ مجھ پر گلاب رنگ اچھا لگتا ہے۔''

جاوید بے قرار ہو کر اس کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بیوی کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں

لے کر بولا: ''سیمیں — سیمیں میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں۔''

یاسمین کی آنکھیں چھلک آئیں' آنسوؤں کی چلمن سے وہ دور تکنے لگی جیسے کھو گئی ہو — پھر اس کے ہونٹ آہستہ سے کھلے: ''میں نے بہت دنوں بعد تمہاری زبان سے یہ الفاظ سنے'' —

جاوید پہلو بدل کر بیوی کی کرسی کے ہتے پر بیٹھ گیا اور اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتا ہوا بولا: ''کیا محبت کے اظہار کی اتنی ضرورت ہے — ''

''ہاں ہے — '' یاسمین نے آہستہ سے کہا

جاوید نے غور سے یاسمین کی طرف دیکھا ''اور یہی بات اگر میں تم سے کہوں — '' یاسمین نے غور سے جاوید کو دیکھا — دکھ بھری آواز میں بولی: ''کاش کہ تم کچھ کہو'' — دونوں کی نظریں چار ہوئیں — اور پھر یکایک دونوں ہنسنے لگے۔

❁ ❁ ❁

ہنس راج رہبر

مہاوت

''دوسرے جو چاہیں کریں، میرے گھر کا یہ دستور نہیں ہے اور سن رکھو، میرے جیتے جی ایسا نہیں ہوگا۔'' بہل نے فیصلہ کن انداز میں کہا، اور عینک چڑھا کر خود لکھنا شروع کر دیا۔

لکشمی خاموش بیٹھی پتی کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے اور آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔ بہل نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ خط لکھنے میں مصروف تھا۔ اسے مکمل کر کے پتہ لکھا: ''بمقام لدھیانہ ڈاک خانہ خاص ضلع خاص محلہ بیری والاان میں پہنچ کر عزیز دیودت بہل کو ملے۔''

دیودت اس کا بڑا لڑکا تھا جو پہلی بیوی سے پیدا ہوا تھا، لدھیانہ میں اس کا ہوزری کا کاروبار تھا اور وہ اپنے کنبے کے ساتھ مدت سے وہیں رہتا تھا۔ خط و کتابت یا شادی غمی میں شرکت کے علاوہ بہل کا اس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پہلی بیوی سے ایک لڑکی بھی تھی وہ بھی اپنے گھر بار اور بچوں میں خوش تھی۔ بہن بھائی میں کافی میل جول اور محبت تھی۔ ان کا رہن سہن باپ سے مختلف تھا۔

لکشمی دوسرے بیاہ کی بیوی تھی اور وہ تین بچوں کی ماں تھی۔ یہ بچے بھی اب بچے نہیں تھے سب سے چھوٹی لڑکی ارملا نے چار سال ہوئے میٹرک پاس کیا تھا۔ منجھلی کی شادی ہو چکی تھی۔ ان دونوں سے بڑا وید برت نام کا لڑکا تھا جس کی عمر اس وقت چھبیس ستائیس سال تھی۔ وہ ایک بسکٹ فیکٹری میں کام کر رہا تھا۔ ڈیڑھ سو پونے دو سو تنخواہ ملتی تھی۔ سعادت مندی کا یہ عالم تھا کہ ہر مہینے پوری پوری تنخواہ باپ یا ماں کو لا کر تھما دیتا تھا۔ اس نے اپنی مرضی سے کبھی چار پیسے کا پان بھی خرید کر نہیں کھایا۔ کبھی گھنٹہ، دو گھنٹے دیر سے آنا ہوتا تو گھر والوں کو پہلے سے مطلع کر جاتا۔ اس کا باپ روپ چند بہل کنبے کا بزرگ اور سرپرست تھا۔ اسے ملازمت سے ریٹائر ہوئے چھ سات سال ہو چکے تھے مگر گھر میں اس کی حکمرانی تھی۔ شوہر جو چاہتا تھا کرتا تھا لکشمی اسے قسمت کے لکھے کی طرح بے چوں چرا قبول کر لیتی تھی۔ شوہر اس کی کوئی بات مانے یا مانے ضد، بحث تکرار کرنا اس کی سرشت میں شامل نہیں تھا۔

آج وہ خاموش ضرور تھی مگر اس کی آنکھوں میں التجا تھی — ایک ایسی التجا جسے ہم کسی بے کس کا اصرار بھی کہہ سکتے ہیں۔

بہل عینک صرف لکھتے پڑھتے وقت استعمال کرتا تھا اس لیے خط لکھنے کے بعد اس نے عینک اتار دی اور اسے خول میں بند کر کے حسب عادت سرہانے کے نیچے رکھ لیا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ لکشمی اس کا فیصلہ سن کر بھی وہیں بیٹھی ہے وہ اٹھ کر گئی کیوں نہیں؟ وہ چند منٹ بیوی کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بولا: ''یاد ہے' پچھلے سال جب محلے کی عورتیں گڑھ مکھتیشور نہانے جا رہی تھیں تو تم نے انہیں جواب دیا تھا کہ جب تک وہ ساتھ نہ ہوں میں نے آج تک گھر سے باہر قدم نہیں رکھا۔ اب بھی ان کے بغیر کہیں نہ جاؤں گی۔'' بہل فخر سے مسکرایا لیکن بیوی کی آنکھوں میں جو التجا تھی اس نے ایک کربناک سوال کی صورت اختیار کر لی۔ اس لیے بہل نے مزید کہا۔ ''تم میری عادت کو جانتی ہو۔ میرے مزاج کو سمجھتی ہو پھر بھی یہ امید کرتی ہو کہ میں جوان جہان لڑکی سے نوکری کراؤں گا۔'' ''سوچ لو' کوئی ہرج تو ہے نہیں۔'' بیوی نے کہا اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

بہل اپنی جگہ بیٹھا سوچتا رہا۔ لکشمی نے اپنی بات گو نہایت آہستہ سے کہی تھی مگر اس کے الفاظ کمرے میں گونج رہے تھے۔ بہل انہیں گونجتے ہوئے سن رہا تھا اور اس کے دل و دماغ میں سوئیاں سی چبھ رہی تھیں۔ لکشمی نے زندگی میں پہلی بار اصرار کیا تھا اور بہل اپنے آپ کو پہلی بار عاجز محسوس کر رہا تھا جیسے نوکری کی طرح گھر کی حکمرانی بھی اس کی گرفت سے نکل چکی ہو' دنیا میں اس کی کچھ بھی قدر و منزلت نہ رہی ہو۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آیا اور وہ جھلا کر بولا:

''ہرج کیوں نہیں؟ میں جو کہتا ہوں ہرج ہے' ہرج ہے' بہت ہرج ہے۔''

لیکن اس کی حالت اس مسافر جیسی تھی جو گاڑی نکل جانے سے جھلا اٹھا ہو اور پلیٹ فارم پر کھڑا دل کی جھوٹی تسلی کے لیے کہہ رہا ہو۔'' کوئی ہرج نہیں' میں کل چلا جاؤں گا۔'' بہل کو اپنی تردید بالکل بے معنی معلوم ہو رہی تھی اور لکشمی کے الفاظ پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ فضا میں گونج رہے تھے اور گزشتہ دو تین سال کے واقعات سے ان کی تصدیق ہوتی تھی۔

مسئلہ تھا اُرملا کی شادی کا۔ بہل اپنی اس بیٹی کی شادی بھی اس طرح کر دینا چاہتا تھا جس طرح پہلی دو شادیاں کی تھیں۔ ویسے وہ دور اندیش تھا چنانچہ اس مقصد کے لیے پہلے ہی سے پانچ ہزار روپیہ فکسڈ ڈیپازٹ میں جمع کرا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ہزار دو ہزار اور بھی خرچ کرنے کو تیار تھا۔ مگر پچھلے دو تین سال کی دوڑ دھوپ نے ثابت کر دیا تھا کہ اتنے روپے میں اچھا بر ملنا ممکن نہیں ہے۔ جہاں بھی بات چلی وہیں مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کچھ لوگ تو ایسے تھے جن سے برسوں پرانی جان پہچان تھی اور جن پر روپ چند بہل کو پورا بھروسہ تھا۔ مثلاً ایک صاحب ہیرانند تھے انہوں نے اس تجویز پر بڑے تپاک سے کہا۔ ''بھائی صاحب' یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ کی بیٹی میری بیٹی اور میرا لڑکا آپ کا عزیز آپ جانتے ہیں کہ ایسے معاملوں میں عورتوں سے صلاح مشورہ ضروری ہے۔ اس لیے بات پکی کرنے سے پہلے میں آپ کی بھابی سے پوچھ لینا ضروری سمجھتا ہوں یا پھر یوں کیجئے پرسوں

شام کو غریب خانہ پر تشریف لے آئیے۔ میں بھی ہوں گا آپ کی بھابی بھی ہوں گی اور چائے پیتے وقت بات یوں چلائیے جیسے مجھ میں آپ میں اس سلسلہ کی کوئی گفتگو ہوئی ہی نہ ہو۔ آپ مجھ سے مخاطب ہونے کے بجائے اپنی بھابی سے کہئے۔ ان کا رخ دیکھ کر میں بھی حامی بھر دوں گا۔

بہل گیا' بات چیت چلی اور آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ بیوی کا تو محض بہانہ ہے دراصل ہیرانند خود یہ رشتہ قبول کرنے کو تیار نہیں کیونکہ بیٹے کے بیاہ سے انہوں نے جو امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ انہیں وہ پورا نہیں کر سکتا۔

''دیکھو' یہ حالت ہے۔'' بہل نے گھر لوٹ کر بیوی سے شکایت کی۔ ''کوئی کسی کا کیا اعتبار کرے لوگ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔''

''دنیا میں سب ہی طرح کے لوگ بستے ہیں گھبراؤ نہیں۔ لڑکا مل جائے گا۔ پہلے بھی تو شادیاں کی ہیں۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔'' بیوی نے تسلی دی۔

''کھانے کے وقت پانچوں برابر ہو جاتی ہیں۔'' بہل طنزاً مسکرایا۔ کوشش اس کے بعد جاری رہی لیکن بات نہیں بنی کبھی لڑکے میں نقص ہوتا اور کبھی لڑکے والے اعتراض کرتے کہ لڑکی کے نین نقش تو اچھے ہیں لیکن رنگ سانولا ہے اور کوئی کہتا کہ تعلیم تھوڑی ہے۔

آخر دیودت نے اپنی جان پہچان کا ایک لڑکا بتایا جس کا نام ہربنس تھا اور وہ بینک میں ملازم تھا۔ صحت اچھی تھی اور عمر بھی مناسب تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ اپنی مرضی سے بیاہ کر سکتا تھا اور اسے جہیز وہیز کا بھی کوئی لالچ نہیں تھا۔

بہل اس سے مل کر بہت خوش ہوا۔ ہربنس کو گھر پر بلایا بیوی نے دیکھا' لڑکی نے دیکھا اور لڑکا سب کو پسند آیا۔ جہاں وہ روپ رنگ اور ڈیل ڈول میں موزوں تھا وہاں بات چیت بھی سمجھ داری اور سلیقے سے کرتا تھا۔

جب اس کے سامنے بیاہ کی تجویز رکھی گئی تو اس نے نہایت حلیمی سے کہا: ''میں نے دیودت کے پاس کام کیا ہے۔ ان کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔ آپ ان کے بزرگ ہیں تو میرے بھی بزرگ ہیں۔ میں آپ کی بات ٹال نہیں سکتا۔ مگر مجھے جو تنخواہ ملتی ہے ماں باپ کا گزارہ بھی اسی پر ہے۔ اس کے علاوہ میرا ایک چھوٹا بھائی ہے اسے پڑھانے کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہے۔ ان حالات میں میں اور کوئی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کو تیار نہیں ہوں۔'' ''تو کیا بیاہ نہیں کرو گے؟'' بہل نے ہنس کر کہا۔

''ایسا تو خیر کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' اس نے قدرے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''سال دو سال انتظار ہو سکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ جہاں دو ڈھائی سو میں کماتا ہوں' سو ڈیڑھ سو لڑکی بھی کمائے ورنہ آپ جانتے ہیں مہنگائی کے اس زمانہ میں گرہستی چلانا آسان نہیں ہے۔''

بہل کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اسے بے حد افسوس ہوا لیکن جواب کیا دے۔ حقیقت کو

منطق سے کیسے جھٹلائے؟

"آپ میرے بزرگ ہیں۔ میرا آپ کو کوئی صلاح دینا چھوٹا منہ بڑی بات ہے"۔ ہربنس نے پھر کہا: "لیکن بہتر یہی ہے کہ آپ لڑکی کو ٹیچرز ٹریننگ سکول میں داخل کرا دیں۔ آپ نے بیاہ کے لیے جو روپیہ رکھ چھوڑا ہے اس میں سے خرچ کریں۔ بعد میں آپ کو لڑکا ڈھونڈنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اور اس میں خود لڑکی کی بھلائی ہے۔"

ہربنس کی صاف گوئی نے بہل سے زیادہ لکشمی کو متاثر کیا اور فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ اختیار اور دانشمندی کا زعم مرد میں ضد اور ہٹ دھرمی پیدا کرتا ہے اس کے برعکس عورت اپنے جائز حقوق سے بھی محروم ہے وہ زندگی کو جنم دیتی ہے اس کی نشو ونما کے لیے ہر طرح کا ایثار کرتی ہے اور ارتقاء پذیر قدروں کو غیر شعوری طور پر ہی مرد کی بہ نسبت جلد قبول کر لیتی ہے۔ چنانچہ جب ہربنس چلا گیا تو لکشمی بولی: "بات تو وہ ٹھیک کہتا ہے۔ ہمارے پڑوس میں چوپڑہ ہی کی مثال لے لو ان کی پشپا ہماری ارملا سے سال ڈیڑھ سال چھوٹی ہے اس کے لیے وہ کتنے فکرمند تھے پر جب سے ٹائپ سیکھ لیا ہے اور دفتر جانے لگی ہے ماں باپ بھی خوش ہیں اور لڑکی بھی خوش ہے اب انہیں بیاہ کی ذرا بھی فکر نہیں ہے۔"

جولا وا بہل کے اندر کھول رہا تھا بیوی کی بات سن کر باہر نکل پڑا اور وہ چلایا:

"دوسرے جو چاہیں کریں مگر میرے گھر کا یہ دستور نہیں ہے......"

اس کے بعد اسے رات بھر چین نہیں آیا...... وہ بہت دیر تک کروٹیں بدلتا اور سوچتا رہا۔ دمے کا مرض جو کچھ دنوں سے دب گیا یکا یک پھر عود کر آیا۔ دوا پی بیوی نے روئی سے چھاتی پر سینک کیا۔ تب کہیں آدھی پچھلی رات آنکھ لگی۔

صبح جب ٹہلنے نکلا تب بھی پریشان تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

"بہل آج کچھ اداس معلوم ہوتے ہو"۔ سیر کے ساتھی تیرتھ رام سونی نے پوچھا: "اداس ہی نہیں بہت پریشان ہوں" بہل نے جواب دیا۔

"کیوں، بات کیا ہے؟"

سونی اس کا ہم عمر تھا اور اس کے ساتھ ہی ریلوے کی ملازمت سے ریٹائر ہوا تھا۔ دونوں ایک ساتھ سیر کو جاتے تھے اور آپس میں دکھ سکھ کی باتیں کرتے تھے۔ چنانچہ بہل نے اپنی بپتا بیان کرتے ہوئے کہا: "میں اس لڑکی کے مارے جتنا پریشان ہوں اتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پھر دیکھو شادی تم نے بھی کی تھی اور میری بھی دو شادیاں ہوئیں۔ ہم لوگ تو صرف یہی دیکھتے تھے کہ لڑکی شکل صورت سے اچھی اور گھر کے کام کاج میں سگھڑ ہو مگر آج کے لڑکوں کو تو پر نکل آئے ہیں اور بالکل ہوا میں اڑتے ہیں"۔ اس کا دم اکھڑ گیا لیکن کھانسنے کے بعد پھر بولا: "دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ پہلے یہ رواج چلا کہ لڑکیوں کو پڑھایا جائے۔ چلو، مان لیا خط پتر لکھنے اور کتاب جانچنے کے لیے

تھوڑی بہت پڑھائی بھی ضروری ہے۔ مگر اب تو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ عورتیں نہ صرف پڑھیں بلکہ مردوں کے برابر نوکری بھی کریں۔ بتاؤ تو یہ کہاں کی سمجھ ہے۔ کیا عورت کے لیے کرنے کو گھر کا م تھوڑا ہوتا ہے؟''

''لیکن دوست' ہماری تمہاری سمجھ تو اب پرانی ہوگئی۔ ہمیں اب کون پوچھتا ہے۔ دور جانے کی ضرورت نہیں میں اپنے ہی گھر کی بات کہتا ہوں۔ پچھلے سال پرکاش کی شادی ہوئی۔ بہو بی۔اے' بی ٹی ہے۔ تمہیں سوچو کہ جو لڑکی بی۔اے' بی ٹی ہے وہ گھر میں کیسے بیٹھے گی۔ لڑکوں کی بھی یہ رائے تھی کہ وہ نوکری کرے۔ میں نے کچھ دخل نہیں دیا۔ اپنے میں سوچ لیا اچھا بھئی ٹھیک ہے۔''

''لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی سب چاہتے ہیں کہ میاں بھی کمائے اور بیوی بھی کمائے۔''

''اور زمانہ جدھر چلے ادھر چلنا ہی پڑتا ہے۔ کوئی نہ چلے تو وہ اڑیل ٹٹو کہلاتا ہے۔''

بہل نے چونک کر سونی کے منہ کی طرف دیکھا وہ سنجیدہ اور گمبھیر تھا اس نے یونہی قاعدے کی ایک بات کہی تھی مگر ''اڑیل ٹٹو۔'' میں طنز کا جو ڈنک تھا وہ اس کے گھاؤ میں چبھ گیا اور وہ درد کو سینے میں چھپا کر چپ ہو رہا۔

''ویسے آدمی دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور ہے لیکن دوست' زمانہ اس سے بھی زیادہ زبردست ہے۔'' سونی نے سلسلہ جاری رکھا جس طرح ربڑ کی سیٹی والی گیند کا سوراخ پھٹ کر پھیل جاتا ہے اس کی بائیں بانچھ قدرے پھیلی ہوئی تھی جس سے بات کچھ بکھر جاتی تھی اور سونی بولتے ہوئے بچے کی طرح معصوم دکھائی دیتا تھا۔ اب بھی اس نے نہایت معصومیت سے کہا۔'' سنو بہل' ہم نے تو جو کچھ دیکھا سنا اور پڑھا ہے اس سے بس ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے۔''

''کیا؟'' بہل چلتے چلتے رک گیا اور اسے یوں محسوس ہوا کہ سونی جس صداقت کا انکشاف کرنا چاہتا ہے اسے سننے کے لیے پیڑ پودے اور پرندے بھی ہمہ تن گوش ہیں۔

''ہاتھی کو مہاوت ہانکتا ہے اور آدمی کو وقت......''

سونی نے جواب دیا اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک تھی جو کہیں دور روح کی گہرائیوں سے آ رہی تھی۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں لڑکی کو داخل کرا دوں؟''

''کوئی ہرج نہیں۔'' سونی نے آہستہ سے جواب دیا۔

اور وہ دونوں اپنی آخری منزل نہر کے پل پر بیٹھے تھے۔ موسم نہایت خوشگوار تھا۔

❀ ❀ ❀

قرۃ العین حیدر

ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی

رات بھر میرے دریچے کے نیچے آذربائیجانی ترکی میں قوالی ہوا کی۔ صبح منہ اندھیرے آوازیں مدہم پڑیں اور کوہ قاف کے دھندلکے میں ڈوب گئیں۔

جب سورج نکلا میں نے سرائے کے باہر آ کر آسمان پر رخ کو تلاش کیا۔ لیکن رخ کے بجائے ایک فاختہ ارارت کی سمت سے اڑتی ہوئی آئی۔ فاختہ کی چونچ میں ایک عدد خط تھا۔ صحن میں آ کر وہ اس سماوار پر بیٹھ گئی جو انگوروں کی بیل کے نیچے ایک کونے میں تپائی پر رکھا تھا۔

فاختہ نے پتلیاں گھما کر چاروں طرف دیکھا اور مجھ پر اس کی نظر پڑی۔ وہ پھدک کر سماوار سے اتری اور لفافہ نزدیک گرایا اور کوہ ارارت کی طرف پھر سے اڑ گئی۔

سرائے کے مالک نے بغیر دودھ کی چائے فنجان میں انڈیل کر مجھے دی اور بولا: ''حانم شاید رخ نے آپ کو اطلاع بھیجی ہے کہ اس نے اپنی فلائٹ پوسٹ پون کی۔''

''ہو سکتا ہے''۔ میں نے جواب دیا۔ ''لیکن میرا خیال ایسا ہے کہ یہ ان دکھیاروں میں سے کسی ایک کا خط ہے جو اپنے لاپتہ عزیزوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ کچھ عرصے سے مجھے اس قسم کے پیغام مشرق و مغرب دونوں طرف سے اکثر ملا کرتے ہیں۔''

''کوئی تعجب نہیں کیونکہ جنگیں ہر سمت جاری ہیں''۔ سرائے کے سفید ریش مالک نے جو بالکل ٹالسٹائی کا حاجی مراد معلوم ہوتا تھا اور روسی بلاؤز کی چرمی پیٹی میں ایک عدد مرصع نقلی پستول رکھتا تھا۔ اطمینان سے حقہ گڑگڑاتے ہوئے دریافت کیا: ''حانم یہ والی جنگ کون سی تھی؟''

میں نے فنجان تخت کے کنارے پر رکھ کر خط پڑھا۔

تب میں نے طے کیا کہ وقت آ گیا ہے کہ تلاش شروع کرنے کے لیے بالکل ابتدا کی طرف واپس چلا جائے۔

چنانچہ میں نے اپنا روزمرہ کا ماسک چہرے سے اتارا۔ حاجی مراد کو خدا حافظ کہا اور ارارت کی سمت چل پڑی جو سامنے جگمگا رہا تھا لیکن بہت دور تھا۔

میں دن بھر چلا۔ بہت سی وادیاں اور منزلیں طے کیں۔ عین غروب آفتاب کے وقت

صنوبروں میں گھرا ایک شفق رنگ چشمہ نظر آیا۔ اس کے کنارے ایک نیلی آنکھوں اور سرخ داڑھی والا فقیر مراقبے میں مشغول تھا۔ میں نے بغور دیکھا۔ وہ خواجہ سبز پوش نہیں تھا بلکہ جیسا کہ ان علاقوں کا دستور ہے۔ اس بزرگ نے فل بوٹ پہن رکھے تھے۔ اس کی سفید نمدے کی کلاہ اور دھاری دار چغے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اگلے وقتوں کا بیکتاشی درویش ہے۔

اب میں نے دیکھا کہ آفتاب اور بدر کامل دونوں افق پر موجود ہیں۔ صنوبروں پر رات کے پرند نغمہ زن ہوئے۔ پھر سورج اور چاند دونوں جھیل کے پانیوں میں گر گئے جھیل کا رنگ سیاہ ہو گیا۔

اس بزرگ نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اور ''یا ہو'' کا نعرہ بلند کیا جو مجھے معلوم تھا کہ بیکتاشی فقراء کے سلام کا طریقہ ہے۔

دفعتاً اس پیر مرد نے بولنا شروع کیا۔ جیسے کسی نے ایک غیر مرئی ٹیپ ریکارڈر چلا دیا ہو۔ اس نے کہا: ''میں اس عجیب روشنی میں سفر کرتا ہوں جو نہ زمین کی روشنی ہے نہ آسمانوں کی۔ جو انوارالٰہی کی سات روشنیوں سے مل کر بنی ہے۔ سنو کہ زندہ ابھی سے مر چکے ہیں۔ اور مردے زندہ ہیں۔ کھوپڑیاں چمکتے غاروں میں گا رہی ہیں جب ان کی آوازیں سمندروں کا شور بن جاتی ہیں میں اپنے تکیے پر منتظر رہتا ہوں۔

میں رات دن خوف الٰہی کی چکی پیستا ہوں اور خالق کی رضامندی کی چکی میں سے دانہ نکالتا ہوں۔ اے خانم آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''افندم'' میں نے عرض کی: ''ایک اجنبی عورت نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ وہ یہاں سے ہزاروں میل دور ایک طوفانی دریا کے کنارے رہتی ہے اور اس نے لکھا ہے۔

دریاؤں کی موجیں لوٹ لوٹ آتی ہیں لیکن وقت نہیں لوٹتا کیونکہ زمیں بھی بوگس ہے خزاں کی ہوائیں چلیں۔ اور جنگلوں میں اونچے درختوں کے پتے سرخ ہو گئے۔ شاخیں کھڑکھڑائیں اور دلدلوں میں جنگلی بطخیں چلا رہی ہیں دماغ باقی ہیں۔ اور جسم ختم ہو گئے۔

''عرصہ دو سال کا ہوا میرا شوہر غائب ہو گیا۔ میں بادری سب سے پوچھتی پھرتی ہوں کوئی مجھے کچھ نہیں بتاتا۔ خاتون' آپ کو ترکوں کی سرزمین میں شاید کوئی واقف اسرار مل جائے۔''

جس وقت میں یہ خط پڑھ کر سنا رہی تھی شمشاد کے درخت کے نزدیک کھڑے اس بزرگ نے ہاتھ سامنے باندھ کر سر جھکا رکھا تھا۔

تب اس فقیر نے ہاتھ آستینوں سے نکالے اور نظریں اٹھائیں اور کہا: ''ملک ہنگری میں میرے جدامجد حاجی گل بابا بیکتاشیؒ کی درگاہ ہے۔ ایک زمانہ تھا جب بخارا اور استنبول اور البانیہ اور رومانیہ سے کلمہ گو ان کے مزار پر انوار کی زیارت کے لیے پاپیادہ ہنگری جایا کرتے تھے۔ اے خانم' اب میں وہاں جاتا ہوں اور واپس آ کر تمہیں اطلاع دیتا ہوں۔''

درویش نے ایک صنوبر کے سائے میں کھڑے ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ چند لمحوں بعد آنکھیں وا کیں اور یوں گویا ہوا: ''میں نے ڈینوٹ کے کنارے اس شکستہ درگاہ پر ماضی اور مستقبل کا نظارہ کیا۔ سنو جب میرا پردادا حاجی عدنان آفندی ایک کارواں کے ہمراہ ملک خطا جاتا تھا یارقند کے نزدیک اسے بیکتاش قلی یعنی بندۂ خدا کے سلسلے کا ایک نوجوان فقیر ملا۔ اس نے حاجی عدنان کو پلٹ کر دیکھا اور بولا: ''آغا فکر کرو۔ فکر کرو۔ محتاط ہو۔'' اس کے بعد وہ شاہراہ کے کنارے آباد ایک نقش بندی خانقاہ کے دروازے میں غائب ہوا اور اسی لمحے دوسری طرف نکل گیا اور سمرقند میوزیم میں داخل ہو گیا۔ اب وہ سمرقند' ازبک سوشلسٹ سویٹ ریپبلک کے عجائب خانے کے ایک گلاس کیس میں کھڑا ہے اور اس کی آنکھیں کانچ کی ہیں۔ حانم میرے ساتھ آئے۔''

درویش نے اپنا عصا سنبھالا اور جھکا جھکا میرے سائے کی مانند میرے آگے آگے چلنے لگا۔

ہم جھیل دان کے کنارے ایک تکیے پر پہنچے یہ تکیہ ایک چوبی عمارت تھی جس کی چھت سرخ رنگ کی تھی اور چاروں طرف سیب کے درخت تھے۔ اس قلندر نے کہا کہ اس لفظ کے معنی ہیں ''خالص سونے کی روح'' مجھے سیڑھیوں پر کھڑا چھوڑ دیا اور ہوا کے جھونکے کی مانند اندر چلا گیا۔

جب وہ دیر تک باہر نہ آیا تو مجھے بہت ڈر لگا میں دبے پاؤں دریچے کے نزدیک پہنچی اور اندر جھانکا۔

تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک چوکر کمرہ ہے جس کا فرش چوبی ہے اور چھت نیچی۔ جس کے شہتیر سیاہ رنگ کے ہیں فرش پر ایک آذربائیجانی غالیچے پر دو بالکل ہم شکل درویش آمنے سامنے خاموش بیٹھے ہیں۔ ایک کونے میں چینی کا ایک فرنچ اسٹوو رکھا ہے جس پر گلاب کے پھول بنے ہیں۔ ایک شہتیر سے ایک طنبورہ آویزاں ہے اور فرش پر ایک نے رکھی ہے کہ مولانا جلال الدین رومی کی روحانی بانسری کی نمائیدہ ہے۔

دونوں درویش چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر ان میں سے ایک اٹھا اور جنوب کی طرف رخ کیا جو مجھے معلوم تھا کہ مدینہ منورہ کی سمت تھی۔ درویش کے اپنے سفید پٹکے سے آذربائیجانی بھیڑوں کی اون سے بنایا گیا تھا ایک چھوٹا سا پتھر نکالا۔ کہ المصطفیٰ اکثر بھوکے رہنے کی وجہ سے اپنے پیٹ سے پتھر باندھے رہتے تھے۔ اور بیکتاشی فقراء اس سنت رسول کی پیروی کرتے ہیں۔ درویش نے بتکتاشی طریقت کی ایک رسم شروع کی۔ اس نے پٹکے کی گرہ باندھی اور کھولی اور پھر باندھی اور کھولی اور دہرایا ''میں شر کو باندھتا اور خیر کو کھولتا ہوں۔ میں جہالت کو باندھتا اور خوف الٰہی کو کھولتا ہوں۔ طمع کو باندھتا اور فیاضی کو کھولتا ہوں۔ میں عجز وانکساری کی درانتی سے پرہیزگاری کی فصل کاٹتا ہوں۔ میں خود آگہی میں بوڑھا ہوتا ہوں اور صبر کے تنور میں اپنی روٹی پکاتا ہوں۔

تب میں دریچے سے چند قدم پیچھے ہٹی اور آسمان کی طرف منہ کیا اور ایک اور بتکتاشی

مناجات پڑھی — ''اے وہ جس کا کوئی نسب نامہ نہیں۔ اوبیکتاش جو زمانے کے ساتھ گردش کرتا ہے۔ جو شب تاریک میں سنگ سیاہ پر رینگتے چیونٹے کی آواز سن لیتا ہے''۔ لیکن اب میں نے بڑی چالاکی سے اپنے پیغام کا اضافہ کر دیا: ''اوبیکتاش! بس تو مظلوموں کی فریاد ہی نہیں سنتا۔''

لیکن میری آواز درویشوں کے وظیفے کے شور میں ڈوب گئی۔ وہ اب چلا رہے تھے ''او نبی۔ جس پر بادل ہمیشہ اپنا سایہ کیے رہتے تھے۔ المصطفیٰ — دنیا پر رحم فرما — رحم — رحم'' ''کریم اللہ — یا ہو''۔ کے بیکتاشی نعروں سے کمرہ گونج اٹھا۔

دوسرے لمحے وہ درویش کے نام ان کا حاجی سلیم آفندی تھا' ایک صراحی اور کوزہ ہاتھ میں لیے برآمد ہوئے۔ حانم' اس بدقسمت عورت کے لیے جو کچھ میں کر سکتا ہوں کروں گا۔ لیکن علی مرتضیٰ شاہِ ولایت نے کہا ہے: ''جو کچھ لکھا گیا ہے ہمیشہ موجود رہے گا۔''

تب میں نے ایک بہت غیر متعلق بات حاجی سلیم سے کہی۔ میں نے عرض کیا: ''افندم۔ میرے وطن میں جو یہاں سے ہزاروں میل دور ہے' ہماری آبائی حویلی میں جو اب کھنڈر ہو چکی ہے' ایک تہ خانہ ہے اس تہ خانے میں پرانی کتابوں کے انبار ہیں۔ اور ایک پرانا شکستہ چینی کا فرنچ اسٹوو۔ جس پر گلاب کے پھول بنے ہیں اور انٹلیکچونل چوہے ان کتابوں کو کترنے میں مصروف ہیں جو دولت عثمانیہ اور برطانیہ' فرانس' مصر اور ایران میں کسی زمانے میں بڑے شوق سے لکھی اور چھاپی گئیں — قسطنطنیہ 1872ء۔ لندن ای سی فور 1884ء۔ طہران 1892ء۔ قاہرہ 1902ء۔ اور ایک نسبتاً جدید کتاب بھی وہاں پڑی ہے۔ لندن رسل اسکوائیر 1952۔ اور دفعہ کا ذکر ہے ایک کہر آلود سہ پہر میں فرنگیوں کے اس بزرگ صوفی سے ان کے فیبر اینڈ فیبر رسل اسکوائر کے دفتر میں ملی تھی۔ اور انہوں نے مجھ سے رقصاں درویشوں کے متعلق باتیں کیں تھیں۔ چونکہ آپ خود اس حلقہ سے تعلق رکھتے ہیں مجھے قونیہ کے اس مرحوم سلسلے کے متعلق کچھ بتایئے کہ قونیہ بھی اب محض ایک ٹورسٹ اٹریکشن ہے۔''

درویش نے سر جھکایا اور رونے لگے پھر آنسو آستین سے پونچھے اور خود بھی ایک قطعی غیر متعلق بات کہی: ''حانم'' حاجی سلیم نے فرمایا: ''میں اس لیے روتا ہوں کہ قانون خداوندی کے مطابق میرا ہمزاد جو اندر بیٹھا ہے۔ میرے مرنے سے ٹھیک چالیس دن قبل مر جائے گا۔ ان چالیس دنوں میں کیا کروں گا؟ کیونکہ وہ مجھے خبردار کرتا رہتا ہے۔

دفعتاً حاجی سلیم پھر چلائے: ''مولائے کائنات شاہ نجف نے فرمایا: ''جو کچھ لکھا گیا ہے رہے گا۔''

''افندم''۔ میں نے عرض کی: ''اوپر والوں کی باتیں تو میں نہیں جانتی مگر جو کچھ یہاں لکھا جاتا ہے اکثر بیحد خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ آپ کو علم ہے۔ ہر حرف کا ایک موکل موجود ہے۔''

درویش نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے کہا: ''جب اس صاحب زماں نے حکمنامے پر دستخط کیے تو اس کے حروف کے طاقتور موکل اڑ کر یورپ کی سمت گئے اور انہوں نے تباہی پھیلا دی۔ دماغ پاش پاش ہوئے اور جسموں کے پرخچے اڑ گئے ــ افندم۔ میں اس اجنبی عورت کو کیا جواب دوں؟''

''فکر کرو۔ فکر کرو۔ محتاط ہو۔ خبردار رہو۔''

''اس اجنبی خاتون نے لکھا ہے کہ اس کے خاوند کا نام ابوالمنصور تھا اور وہ تصویریں بناتا تھا۔''

''کیا وہ اپنی کھوپڑی بچانے کے لیے جنگل کی سمت نہیں بھگا؟'' حاجی سلیم نے دریافت کیا۔

''جی نہیں، اجنبی عورت نے لکھا ہے کہ وہ ایک تالاب کے کنارے بیٹھا جنگلی بطخوں کی تصویریں بناتا رہا۔''

''نہایت احمق تھا'' حاجی سلیم نے مختصراً کہا۔

اور ہزاروں لاکھوں انسان جنگلوں اور دلدلوں اور سرحدوں کی طرف بھاگے اور زمین ان کے پیروں تلے سے نکل چکی تھی اور سروں پر تلواروں کا سایہ تھا۔''

''کوئی تلوار نہیں سوا ذوالفقار علیؑ کے'' حاجی سلیم نے بات کاٹی۔

میں خاموش ہو گئی۔

''کیا جب قیامت آئی شخص مذکور تنہا تھا؟'' حاجی سلیم نے دریافت کیا۔

''جی نہیں مرگ انبوہ کے جشن میں شامل تھا۔''

''یہ کہاں کا ذکر ہے۔''

ہر جگہ کا، مشرق، مغرب، شمال، جنوب بیکتاش کا چہرہ ہر سمت ہے۔''

حاجی سلیم نے غور سے مجھے دیکھا: ''خانم۔ کیا تم ان میں سے نہیں ہو جو ایمان لائے؟''

میں نے بات جاری رکھی: ''اور لاکھوں سرحدوں کی طرف بھاگے۔ وہ بہ حالت خاموشی مشرق سے مغرب کی جانب آئے اور اسی طرح سر جھکائے پھر واپس لوٹ گئے۔ تب میں نے بہت سوچا کہ یہ سب کیوں ہوا اور مجھے یاد آیا لکھا ہے: ''جو اپنی روح کا حج کرے اس پر اسرار منکشف ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنی روح کا حج کیا پر کچھ دریافت نہ ہوا''

''خانم۔ شاید تمہارے قلب پر کفر کی مہر گہری لگی ہے''۔ حاجی سلیم نے کہا اور صراحی سے تھوڑا سا پانی کوزے میں انڈیلتے ہوئے ایک بیکتاشی دعا پڑھی ــ ''کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے اور محمدؐ اس کا رسول اور علی اس کا دوست اور امام مہدی آخرالزماں اور موسیٰ کلیم اللہ اور عیسیٰ روح اللہ ــ خانم اس پانی میں دیکھو۔''

''کیوں۔ کیا آپ کو جام جمشید مل گیا؟'' میں نے ذرا جھنجھلا کر پوچھا۔

''خانم۔ پانی میں دیکھو۔''

میں نے دیکھا اور کہا: ''افندم۔ اس میں مجھے ایک عدد گھوڑا گاڑی نظر آتی ہے۔ یعنی اسٹیج کوچ' جو ایک جاپانی سے پل پر سے گزر رہی ہے''۔ پھر دفعتاً میں نے ریڈیو یا ٹیلی ویژن کے Commentaor کی طرح جوش سے کہنا شروع کیا: ''اور اس گاڑی میں ایک کٹھ پتلی نوہ ماسک پہنے بیٹھی ہے — اور کوچوان کا چہرہ نہیں ہے — کوچوان کا چہرہ نہیں ہے — اور اب ایک ناؤ جو وسیع دریا کے دھندلکے میں رواں ہے اور کنارے پر نازک سے پہار اور بانس کے جھنڈ اور بید کے پودے اور پہاڑی کے دامن میں بانس کا جھونپڑا۔ اس کے برآمدے میں ایک منحنی انسان' بکرے کی سی داڑھی — بیٹھا تصویر بنا رہا ہے — افندم — یہ سب تو کچھ زین معلوم ہوتا ہے —''

''زین بھی درست ہے۔ حانم۔ اور ذرا غور سے دیکھو۔ ناؤ یا بکتر بند گاڑیاں؟''

''افندم — افندم — آپ کے پیالے کا پانی سرخ ہو گیا!''

''کریم اللہ — یا ہو —'' حاجی سلیم نے ٹھنڈی سانس لے کر آہستہ سے دہرایا کوزہ اٹھا کر سر جھکائے سیڑھیاں اترے سیب کے جھرمٹ سے گذرتے جھیل کے کنارے پہنچے اور دفعتاً اس مشاقی اور پھرتی سے کوزہ دور پانی میں پھینک دیا جیسے کرکٹ کے کھلاڑی گیند پھینکتے ہیں۔ پھر وہ تکیے پر واپس آئے اور سیڑھی پر بیٹھ کر کہنا شروع کیا: ''میں خوف الٰہی کی چکی پیتا ہوں۔ اور نفرت اور ظلم کو باندھتا ہوں اور محبت اور دردمندی کو کھولتا ہوں۔ اور غیظ و غضب کو باندھتا ہوں — اے حانم ہندی — کیا یہ شخص ابوالمنصور ایک انسان تھا یا ایک علامت؟''

''دونوں'' میں نے جواب دیا۔ حاجی سلیم نے سر جھکا کر دوبارہ شروع کیا۔

''کیا میں اس خاتون کو لکھ دوں کہ وہ صبر کے تنور میں اپنی روٹی پکاتی رہے؟'' میں نے پوچھا: ''افندم۔ اب میں بادشاہ آباد واپس جاتی ہوں۔ آپ بھی استنبول لوٹ جائیے اور وہاں محلہ پیرا یا توپ کاپو میں اپنا تکیہ مولوی آباد کیجئے یا خانقاہ اوغلو علی پاشا۔''

''حانم' میرے واپس جانے کے لیے اب کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ استنبول کے دو سو چھپن تکیے نصف صدی ہونے آئی ایک صاحب الزماں کے حکم سے بند کر دیئے گئے۔ چند ایک کے ماڈل عجائب خانوں میں رکھے ہیں یہ فقیر حقیر بھی ایک گلاس کیس میں کھڑا ہے —'' حاجی سلیم نے کہا اور آنسو بہاتے رہے۔ دفعتاً میں نے نوٹس کیا کہ حاجی سلیم کی نیلی آنکھیں کانچ کی تھیں۔

''بہر حال افندم' آپ جہاں کہیں بھی واپس جائیں اس بیکتاش سے کہہ دیجئے گا ساری دنیا میں' مشرق و مغرب شمال و جنوب میں' اس کے قلیوں پر بہت ظلم ہوئے اور ہو رہے ہیں — اور دعا کرتے رہیے۔''

''ہم بیکتاشی محض دعا نہیں کرتے۔ حانم تم نماز پڑھتی ہو؟ سیدھی سادی نماز؟ ہم نماز پڑھنے کو دارِ منصور پر چڑھنا کہتے ہیں۔ میں روز دار منصور پر چڑھتا ہوں اور فنا ہوتا ہوں' اور زندہ ہوتا

ہوں چونکہ تم ایسا کبھی نہ کرو گی تمہیں کچھ معلوم نہ ہو گا۔ میں روزانہ خواہشات کو باندھتا اور قناعت کو کھولتا ہوں۔ خدا صابر ہے کیونکہ حی و قیوم ہے۔ بندہ بے صبر ہے کیونکہ اس کی زندگی چند روزہ ہے اور وقت تیزی سے گذرتا جاتا ہے۔''

تب میں نے ذرا بے ادبی سے کہا: ''افندم آپ کو ہسپانیہ کے حاجی یوسف بیکتاشی کا نام یاد ہے؟ پندرہویں صدی عیسوی میں وہ علیہ الرحمتہ اندلس میں موجود تھے۔ جب مسلمانوں پر قہر ٹوٹا ان کا اور ان کے مریدوں کا صبر و رضا کسی کام نہ آیا۔''

حاجی سلیم نے میری بات کا مطلق نوٹس نہ لیا اور کہتے رہے: ''میں انوار الٰہی کی روشنی میں سفر کرتا ہوں۔ میں ننانوے اسمائے الٰہی کی روشنی میں چلتا ہوں۔ ہو جو بے رنگ سرخ ہے۔ احد سبز اور عزیز جو سیاہ ہے اور ورد وہ کی جس کی ذات میں روشنی نہیں ـــ حاجی سلیم بیکتاشی کی گفتگو ختم ہوئی ـــ''

معاً غیر مرئی ٹیپ ریکارڈر میں سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں جیسے کسی نے اسے الٹا چلا دیا ہو۔ کیونکہ وجود متعدد حصوں میں منقسم ہے۔

حاجی سلیم سامنے دیکھتے دیکھتے اپنا لبادہ سرسراتے تکیے کے اندر جا کر غائب ہو گئے۔ دروازہ باہر سے بند تھا اس میں زنگ آلود موٹا قفل پڑا تھا۔

میں نے انگور کی بیلوں سے گھرے دریچے میں جا کر اندر جھانکا۔ حاجی سلیم اور ان کا ہمزاد اپنے اپنے ہاتھ سامنے باندھے گم صم آمنے سامنے دوزانو بیٹھے تھے۔ دیکھتے دیکھتے وہ دونوں پیلے پرانے کاغذوں میں تبدیل ہو گئے۔ کوہ ارارات کی طرف سے ہوا کا ایک تیز سرد جھونکا آیا جس میں دریچے کے شکستہ پٹ بھڑ سے کھل گئے اور وہ دونوں درویش پرزہ پرزہ ہو کر کمرے میں بکھر گئے باہر آ کر ان کے پرزے فضا میں چکر کاٹنے لگے اور خستہ فالتو کاغذوں کی طرح ہوا میں اڑ گئے۔

☆☆☆

رخ تغلق آباد کی سرزمین پر اترا اور اپنے پنکھ پھیلا دیئے۔ میں نے نیچے آ کر شہر کا رخ کیا۔ راہ میں سوچی تلاش یہاں ازسرنو شروع کرنے سے قبل اپنے پرانے دھرانے کی ماسک کی مرمت کروانا ضروری ہے۔ گو میں زیادہ مدت بعد واپس نہیں آئی تھی لیکن شہر بدل گیا تھا۔ تب اندر پرستھ کی ایک گلی میں میں نے ایک رتھ بان سے پوچھا: ''او بھائی رتھ بان، جمہوریت کی تازہ ترین آج کل کی راجدھانی کا راستہ کدھر ہے؟'' اس نے کہا: ''معلوم نہیں'' اور گھوڑوں پر چابک لگا کر ہوا ہو گیا۔

تب میں اور آگے بڑھی اور ایک تورانی شہسوار سے دریافت کیا: ''او بھائی شہسوار اگر میں تغلق آباد پہنچ گئی ہوں تو کسی ایسے کارخانے کا راستہ بتاؤ جہاں میں اپنے ماسک کی مرمت کروا سکوں۔''

شہسوار نے جواب دیا: ''بی بی سامنے قتلق نگار خانم کا مقبرہ ہے۔ یعنی تھا اس کے اوپر جو ایرکنڈیشنڈ عمارت کھڑی ہے۔ اس کے اندر وہ قدیم خاتون جو رائیڈ ہیگرڈ کے ناولوں میں She کے

نام سے ایکٹنگ کرتی تھی اب بیوٹی پارلر چلاتی ہے۔''

لہٰذا میں اس کارخانے پر پہنچی۔ اس کے سامنے ایسا ہجوم تھا جیسے کوئی مر گیا ہو۔ میں نے اندر جھانکا۔ ہیروں سے جگمگاتی بہت سے عورتیں ایک قطار میں خوفناک مشینوں کے نیچے سر دیئے ساکت وصامت بیٹھی تھیں۔ اور مزید عورتیں اس طرح آ رہی تھیں جیسے فرنگستان میں مردے Morticians کے یہاں آتے ہیں۔

دہشت زدہ ہو کر میں الٹے پاؤں باہر نکلی تو شاہجہان آبادی کی ایک گلی میں ایک چگی داڑھی والے نوجوان نے میرا راستہ روکا اور گویا ہوا— ''اے اس قدر Confused نظر آنے والی بھارتیہ مہیلا۔ میں ایک پردیسی مسافر ہوں اور مجھے بھوک لگی ہے۔ کسی ایسی جگہ کا پتہ بتلا سکتی ہو جہاں میں دریائی مچھلی اور اچھا بھات کھا سکوں؟''

میں اسے جامع مسجد کے قریب ایک بھٹیارخانے میں لے گئی قلعہ کے چبوترے ''سلاطینوں'' اور شعراء کی آمدورفت رہتی تھی۔ دیکھا تو بھٹیارخانہ سنسان پڑا تھا۔ میں بہت مایوس نظر آئی تو اس اجنبی نوجوان نے کہا: ''بانوئے محترم آیئے نیو دہلی چلتے ہیں۔''

نیو دہلی کے ایک Mod ریستوران میں چگی داڑھی والا یوں داخل ہوا جیسے بطخ پانی میں داخل ہوتی ہے۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ شخص نامعلوم آرٹسٹ ہے۔ اس طعام خانے میں مرد اور عورتیں بالکل یکساں نظر آ رہے تھے۔ بلکہ عورتیں مرد اور لڑکیاں معلوم ہوتے تھے کہ یہ Unisex کہلاتا ہے۔

پردیسی نوجوان نے دریچے کے قریب میز پر بیٹھ کر دریائی مچھلی منگوائی اور کہا کہ گو وہ اب ہمارا دوست اور حلیف ہے لیکن اپنا بل خود ادا کرے گا۔

تب میں نے اس سے کہا: ''او بھائی پردیسی مہمان۔ میں تمہاری اس خودداری کی قدر کرتی ہوں۔ لیکن تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

وہ نوجوان دریچے سے باہر دیکھتا رہا جہاں ترک بادشاہوں کے خستہ مقبروں میں غریب غربا ٹاٹ کے جھونپڑے ڈالے شام کا کھانا پکا رہے تھے کیونکہ بہرحال سب کچھ زین ہے بیکتاش کا چہرہ ہر طرف ہے۔ اچانک اس نوجوان نے حاجی سلیم آفندی کی آواز میں کہنا شروع کیا۔ ''کٹھ پتلیاں سُتلیوں سے آویزاں اسٹیج پر اتاری جاتی ہیں۔ تماشا گر ایک سُتلی اوپر کھینچ لیتا ہے۔ دوسری کٹھ پتلی نیچے اتار دیتا ہے۔

''یہ بھی درست ہے۔'' میں نے حاجی سلیم آفندی کی مانند جواب دیا۔ پھر میں نے مستعدی اجنبی عورت کا خط پرس میں سے نکالا اور بولی: ''او بھائی مسافر۔ زندہ مردوں کے خواب دیکھ رہے ہیں اور مردے زندوں کے اور تصویروں کی تصویریں باقی ہیں چونکہ تم طوفانی دریاؤں کی سمت سے آئے ہو ممکن ہے تم نے مصور ابوالمنصور کا نام سنا ہو۔''

مسافر کھانا کھاتا رہا کیونکہ کھانا پیدائش اور موت اور ازل اور ابد کے درمیان سب سے بڑی اور اٹل حقیقت ہے۔ گو ہم سے کہا گیا تھا کہ بھوک کو باندھو اور قناعت کو کھولو۔ تاکہ کچھ لوگوں باقی لوگوں سے زیادہ کھا سکیں۔

میں نے پھر دریافت کیا: ''تم یہاں کاہے کی جستجو میں آئے ہو؟''

''کیا جستجو ضروری ہے؟'' اس نے کہا: ''میں یہاں نیشنل اسکول آف ڈراما میں آپ کی حکومت کے اسکالرشپ میں فن تماشاگری سیکھنے آیا ہوں جس فن کے آپ لوگ ماہر ہیں۔''

''کیا تمام ان لوگوں کے قبیلے سے ہو جو نقلی چہرے لگا کر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کوئی اور ہیں؟ کیا تمہارے ماں باپ اداکار ہیں؟''

''میرا باپ جنگلی بطخوں کی تصویریں بناتا تھا۔''

''کیا اب بھی وہ زندوں میں شامل ہے؟'' میں نے بے صبری سے پوچھا:

تب نوجوان نے اکتا کر کہا: ''شاید میری ماں نے آپ کو بھی خط لکھا ہے۔ وہ طرح طرح کے لوگوں کو خط لکھ لکھ کر میرے باپ کی کھوج میں مصروف ہیں اور یہ یقین کرنے کو ہرگز تیار نہیں کہ میرے باپ کو صبح پانچ بجے طلوع آفتاب سے قبل مکان سے باہر لے جا کر عالم بلا روانہ کر دیا گیا تھا۔'' اس کے بعد اس شخص گم نام نے کھانا ختم کیا۔ سکون سے خدا حافظ کہا اور ریستوان سے باہر چلا گیا۔

میں نے دریچے میں سے دیکھا۔ نئی دہلی کی سڑکیں بارش میں بھیگ رہی تھیں۔ اتنے میں دور سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آئی۔ اور ایک گھوڑا گاڑی تغلق نگار خانم کے مقبرے کے پیچھے سے نمودار ہوئی۔ اور سنسان سڑک پر سامنے سے گذر گئی۔ اس اسٹیج کوچ کو اندر ایک کٹھ پتلی نوہ ماسک لگائے بیٹھی تھی۔ کوچوان نے شوگن عہد کا کیمونو پہن رکھا تھا۔ کوچوان نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ اور اس کا چہرہ نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے ماسک کو چھوا اور مجھے یہ خوفناک احساس ہوا کہ میں یہ محض ظاہر ہی نہیں کرتی کہ میں کوئی اور ہوں۔ میں واقعی کوئی اور ہوں اور ایک ایسی نوہ تمثیل میں شامل ہوں جو کسی کے سمجھ میں نہیں آتی۔

☆☆☆

عزیزمن آج سے چھ سو برس قبل حاجی گل بابا بیکتاشی علیہ الرحمہ نے یہ معمہ اپنے مریدوں کے سامنے رکھا تھا جب وہ نیلے ڈینیوب کے کنارے عثمانی مملکتِ ہنگری میں اپنی خانقاہ کے اندر بیٹھے حکایاتِ قدیم و جدید کے ذریعہ درس دیا کرتے تھے۔

''اور اس مقام پر میرا راگ ختم ہوا۔ اے دیناؤ اب رخصت ہو اور واپس جاؤ''۔ مولانا جلال الدین رومیؒ نے کہا اور نے ہاتھ سے رکھ دی۔

❀❀❀

انور عظیم

ساری رات

دوسرا گلاس بھی خالی تھا۔ میرا گلاس' جو پہلا گلاس نہیں تھا' خالی ہو رہا تھا۔ میں نے دوسرے گلاس کو بھی بھر دیا اور انتظار کرنے لگا۔ اس کا جس کے آنے کا انتظار تھا۔ اُس کا جس نے آنے کا وعدہ نہیں کیا تھا۔

چھت پر چاندنی سو رہی تھی۔ ہوا جاگ رہی تھی اور رات کا دل دھڑکا رہی تھی۔ کبھی کبھی رات گہری سانس لیتی تھی اور خاموش ہو جاتی تھی۔ میں خاموش نہیں تھا۔ میں بول رہا تھا لیکن کوئی میری آواز سن نہیں رہا تھا۔ خالی گلاس' جس کو میں نے چند لمحے پہلے بھر دیا تھا' اب بھی خالی خالی آنکھوں سے مجھے گھورے جا رہا تھا۔ چاند میرے گلاس میں اتر آیا تھا اور آہستہ آہستہ پگھل رہا تھا۔

''بہت انتظار کرایا تم نے۔ تمہارا جام کب سے بھرا ہوا ہے۔ رات بیت رہی ہے۔ پیو' پیو۔ جتنی رات اب باقی ہے' بہت ہے۔'' میں نے کہا' اُس سے جس کے آنے کا مجھے انتظار تھا۔ گلاس بھرا ہوا تھا' لیکن مجھے خالی نظر آ رہا تھا۔

''ہاں بہت ہے۔'' اس نے کہا جس کے انتظار میں میں شام سے چھت پر بیٹھا تھا۔ پی رہا تھا سگریٹ کے کش اڑا رہا تھا۔ تمباکو اور وہسکی کی خوشبو میری روح میں بسی ہوئی تھی۔

''تم بہت اکیلے ہو۔'' اُس نے کہا جو نہیں آیا تھا۔ اُس کے ہونٹ مڑ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بھیگی بھیگی چنگاریاں جھلملا رہی تھیں۔ ہونٹ اور مڑ گئے اور اس نے میری طرف جھک کے کہا ''تم بہت اکیلے ہو۔''

اس کے لہجے میں کتنا کدورت بھرا چٹخارہ تھا۔

مجھے اپنے آپ پر بڑا ترس آیا۔ میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ چہرہ ٹھنڈا تھا۔ نمی نے چہرے پر جالے سے بُن دیئے تھے۔ گلاس کے باہر بھی' میرے چہرے کی طرح' نمی کے جالے پگھل رہے تھے۔

یکا یک میرا چہرہ گرم ہونے لگا۔ سانس جلنے لگی: ''میں سب کچھ بدل سکتا ہوں۔ اس کے پرخچے اڑا سکتا ہوں جس کا مجھے انتظار ہے۔ میں اس چھت سے کود سکتا ہوں۔ اور نیچے گر سکتا ہوں۔ گر

کر کہاں جا سکتا ہوں۔ نیچے پاتال ہے۔ یہ چھت بھی پاتال ہے پاتال سے پاتال میں۔ یہ گرنا بھی کوئی گرنا ہے۔''

اُس کے ہونٹ اور مڑ گئے۔ چوٹ کھائے ہوئے جھینگر کی طرح۔ جھینگر بول رہے تھے۔ جھینگروں کی آواز سن کر' نیچے اصطبل میں گھوڑے ہنہنانے لگے۔ آواز آواز کو جگاتی ہے۔ خاموشی خاموشی کو تھپکیاں دیتی ہے۔ میں نہ آواز ہوں' نہ خاموشی۔ میں کیا ہوں۔ اُس کے ہونٹ پھیل گئے۔ جھینگر غائب ہو گئے۔ اس نے ہنس کر کہا ''تم اپنی آواز سے ڈرتے ہو۔''

میں اس کی آواز کو کڑوے گھونٹ کی طرح پی گیا۔

''پیو پیو' ابھی رات باقی ہے۔''

''ہاں ابھی رات باقی ہے۔ جام بھی باقی ہے۔ تم بھی باقی ہو۔''

دوسرے گلاس پر انگلیوں کی گرفت کبھی سخت ہو جاتی تھی' کبھی ہلکی۔ کبھی انگلیاں پگھلنے لگتی تھیں' کبھی برف کی طرح جم جاتی تھیں اور ایسا لگتا تھا کہ وہ کانچ کی دیوار بھی پگھل گئی ہے جسے میں گھورے جا رہا تھا۔

میں جھکا۔ میں نے انگلیوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ خالی گلاس کتنا سرد تھا۔ ہونٹوں کی طرح۔ اور وہ انگلیاں جن کی گرفت میں گلاس تھا۔ انگلیاں بھی کتنی سرد تھیں۔ برف کی انگلیاں' برف کی آنکھیں' برف کے ہونٹ' برف کا چہرہ' برف کی مسکراہٹ۔ میں نے خالی گلاس کو پھر شیشے کی میز پر رکھ دیا۔ انگلیوں سمیت' جن میں نہ جانے کتنے ڈنک چھپے ہوئے تھے۔ میں نے سارے ڈنک اپنے ہونٹوں میں چھپا لیے اور چپ چاپ اپنی کرسی میں سما گیا۔ میں نے ہاتھ بڑھایا' ربڑ کی آستین کی طرح' اور گلاس میں پگھلے ہوئے چاند کو پی گیا۔ بیٹھے بیٹھے میری آنکھ لگ گئی۔ پھر جو آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ — وہ سامنے بیٹھا ہے۔ رات کا دھندلکا میری روح سے چھن رہا ہے اور ستاروں کی گرد کی طرف سفر کر رہا ہے۔ وہ سامنے بیٹھا ہے اور انگلیوں سمیت اس گلاس کو خالی کیے جا رہا ہے جو شروع سے خالی تھا اور جس پر انگلیوں کی گرفت سخت تھی جس کے سارے ڈنک میں نے اپنے ہونٹوں میں چھپا لیے تھے۔

بینک میں ''ٹوکن'' جس طرح ایک کے اوپر ایک رکھے جاتے ہیں' مینار کی طرح' اسی طرح اس کے اعضا تھے' ایک کے اوپر ایک۔ جسم کی طرح مینار ڈھے گیا تھا اور اعضاء ہوا میں تیر رہے تھے۔ لیکن ایک کے اوپر ایک پھن پھیلائے ہوئے سانپ کی طرح جس کے ہزاروں ٹکڑے ہو گئے ہوں لیکن جس کا ہر ٹکڑا زندہ ہوا' اور ایک کے اوپر ایک' لہرا رہا ہو۔

میں انگلیوں کو چھوتا ہوں' میرے ہونٹ خوشبو کا پیچھا کرتے ہیں۔ ہاتھ کا سفر' بانہوں کا سفر' گردن کا سفر اور — اور — اور — اس کے آگے کچھ نہیں۔ چہرہ' وہ چہرہ' کہیں نہیں ہے۔ میرا چہرہ اور

اس کا چہرہ' دونوں غائب ہیں۔ سفر ختم ہوا۔ وہ ہنستی ہے' یہ اس کی ہنسی ہے میں ہنسی کو دیکھتا ہوں۔ آواز جو دکھائی نہیں دیتی' چہرہ بن گئی ہے۔ میں اس آواز کو چومتا ہوں۔ اب ایک سفر اور شروع ہوتا ہے جو چہرے سے آگے جاتا ہے ہونٹوں اور آنکھوں سے آگے آواز کے ساتھ۔ آواز بہت دور جاتی ہے کیونکہ آواز وقت ہے۔ وقت جو وقت سے آگے جاتا ہے۔

گھوڑے ہنہناتے ہیں۔ سارے تانگے والے یہیں رہتے ہیں۔ وہ وہیں رہتے ہیں جہاں گھوڑے ہنہناتے ہیں۔ جہاں گلی کوچوں کا اندھیرا ہے۔ وہ اپنے گھوڑوں سے بھی زیادہ تھکے ہوئے ہیں اور بیہوش ہیں جو اپنے زمانے سے آگے نکل جاتے ہیں وہ بیہوش ہو جاتے ہیں۔ چاہے وہ میں ہوں یا گھوڑے ایک ہی بات ہے۔

ان جان لیوا انگلیوں نے' جو ہوا سے زیادہ سبک ہیں' گلاس کو چھوڑ دیا ہے۔ انگلیوں سے چھوٹتے ہی گلاس بجھ گیا ہے' چراغ کی طرح۔ ساری رات چاند بجھا رہا ہے ساری رات۔

اب کیا ہو گیا۔ تم نے گلاس چھوڑ دیا ہے۔ گلاس کتنا خالی ہے۔ گلاس کی دیوار پر نمی کس طرح پسیج رہی ہے اور تم کتنی بے لباس ہو۔ سچائی کی طرح' مجھے اپنے جرم کا اقرار ہے۔ مجھے لباس سے زیادہ تم پسند ہو' بے لباس سچائی' سچائی نڈر ہے۔ اسی لیے تم اتنی خوبصورت ہو۔

ساری کھڑکیاں دور دور تک اندھی آنکھوں کی طرح نظر آ رہی ہیں۔ کمروں کی آنکھیں باہر دیکھتی ہیں۔ میں ان آنکھوں کے اندر دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہاں کیا ہو رہا ہے ان کمروں کے اندر ایک کمرے میں وہ ہیں ایک کمرہ میں' میں ہوں۔ تم اس کمرے میں کتنی اکیلی ہو۔ مجھے تمہارا یہ اکیلا پن بہت اچھا لگتا ہے۔ کھویا ہوا چہرہ' کھوئی ہوئی بانہیں' کھوئی ہوئی باتیں۔ ایک کمرہ تم ہو میں اس کمرے میں کتنا اکیلا ہوں۔ ہر طرف گھٹن ہے' ساری کھڑکیاں بند ہیں اور میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ تم کسی طرح آ نہیں سکتیں نہ جانے کیا قصہ ہے۔

رات گرد کی طرح اڑ رہی ہے' سورج کی طرف۔

یہ سب محض خیال ہے' باتیں' ان ہی باتوں نے مجھے یہاں تک پہنچایا ہے۔ اس چھت تک جس کے نیچے اصطبل ہے' جہاں گھوڑے ہنہنا رہے ہیں تھکے ہوئے گھوڑے۔

میں بھی تھک رہا ہوں۔

تم پھر آ گئے یہ بھی کوئی آنے کا وقت ہے' کیسا وقت۔ تم نے بلایا میں آ گیا۔ اچھا چھوڑو یہ باتیں۔ تم اب جاؤ میں اس وقت اکیلا رہنا چاہتا ہوں۔ لیکن تم اکیلے کب ہو۔ وہ کون ہے وہ کوئی نہیں' یہاں اور کوئی نہیں ہے۔ میں بھی نہیں' تم بھی نہیں' لیکن یہاں کوئی تو ہے دوسرے گلاس پر انگلیوں کے نشان کیسے ہیں۔

وہ نتھنے پھلا کر انگلیوں کو سونگھتا ہے۔ گلاس کی دیوار پر نشان جاگتے ہیں۔ آہستہ آہستہ

انگلیوں میں خون دوڑ رہا ہے۔ اس کا جسم تن گیا۔ اس کی زبان نکل آئی ہے۔ اس کی دُم سخت ہو گئی ہے لوہے کی دم۔ وہ گلاس کو سونگھتا ہے اور چھت کو پنجوں سے کریدتا ہے۔ اس کے پنجے بھی لوہے کے ہیں۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی ہیں۔ اس کے منہ سے' زبان سے جھاگ ٹپک رہا ہے۔ پوری چھت پر جھاگ ہے۔ میں چلتا ہوں' جھاگ پر پھسلتا ہوں' اور گرتا ہوں' اٹھتا ہوں اور کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں۔ وہ بھونکتا ہے' گلاس کو سونگھتا ہے' دم ہلاتا ہے اور باہر چلا جاتا ہے۔

میرا دل دھک دھک دھک کر رہا ہے۔ اچھی مشین ہے یہ دل' غریب دل' رفریجریٹر کی طرح کام کیے جاتا ہے مشن کی موٹر گرم اور چیزیں ٹھنڈی۔

تم میرے پاس آؤ' چہرہ نہیں ہے تو نہ سہی' تم تو ہو' تم اور تم اور تم۔

یہ سارے سال' مہینے' دن' کتنے میلے' کتنے شکن آلود ہیں۔ ڈالو ان کو ردی کی ٹوکری میں۔

اس وقت ساری باتیں یاد آ رہی ہیں۔ یادیں ستاروں کی طرح جھلملاتی رہتی ہیں۔ رات بھر ہم بھی ان کے ساتھ جھلملاتے رہتے ہیں رات بھر۔

تم نے ایک بار مجھ سے کہا تھا — شاید وہ تمہاری زندگی کا سب سے کمزور لمحہ تھا — کیا کہا تھا میں نے۔ تم نے کہا تھا میں بہت انوکھا انسان ہوں۔ میں' نے پوچھا تھا — کیوں؟ تم نے ہنس کر کہا تھا — تم بہت شریف آدمی ہو۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ میں نے ساری رات باتوں میں کاٹ دی۔ ہاں مجھے یہ سمجھنے میں بہت دیر لگی کہ راتیں باتیں کرنے کے لیے نہیں ہوتیں۔

تم بہت زور زور سے سانس لے رہی ہو۔ منہ پر رومال مت رکھو۔ کھانسی بھلا رومال رکھے رکتی ہے تم پیاسی ہو' خالی گلاس اور تمہارا چہرہ خالی گلاس میں ہے۔ میرے گلاس میں چاند ہے۔ تمہارے گلاس میں چہرہ ہے' چہرے پر وقت کی جھریاں بُن دی ہیں۔ وقت اپنے چہرے پر جھریاں بنتا رہتا ہے۔ وقت خالی گلاس میں ہے۔ وقت کو اسی طرح پہچانا جاتا ہے۔ ہر شخص وقت کو اپنے گلاس میں انڈیل کر پی جاتا ہے۔ آنکھوں میں کتنا کاجل بھر لیا ہے تم نے۔ ہونٹوں کو لپ اسٹک نے کتنا پھیکا بنا دیا ہے۔ ہاتھوں پر رگیں جونکوں کی طرح رینگ رہی ہیں۔ تمہارے دانت کتنے میلے ہو گئے ہیں۔ وقت کی طرح — جس میں ہم زندہ رہے' جو ہم سے چھو کر میلا ہو گیا۔ ہم وقت کو اپنی زندگی کے اس میل کے سوا اور کچھ نہ دے سکے۔ رات کا چل چلاؤ ہے۔ وقت کم ہے۔ تمہارے گلاس میں بھی جو خالی ہو رہا ہے۔ میرے گلاس میں بھی جو خالی ہو رہا ہے۔ اب تم آئی ہو تو بھلا کیا آئی ہو۔

تم گلاس کے اندر سے مجھے دیکھ رہی ہو۔ کاجل بھری آنکھوں سے' اور تمہارے چہرے کی جھریاں جالے کی طرح اڑ رہی ہیں اور تمہاری آنکھوں پر جھول رہی ہیں۔

ہال سب ٹھیک ہے' بینک کی نوکری' معاشقے' فلم دیکھنے کے لیے ملاقاتیں۔ میزوں کے نیچے پیروں اور گھٹنوں کا ملاپ' کافی کے ساتھ' وہسکی کے ساتھ' موٹی موٹی گالیاں' دھکم پیل' زندگی اس

ریلے میں بہتی ہوئی اس چھت تک پہنچ گئی ہے۔ تمہاری جھریوں کی طرح۔ جس کو وقت نے تمہارے چہرے میں چھپا دیا تھا اور جن کو وقت ہی نے ابھار کر چہرے پر پھیلا دیا ہے۔ اب جھریوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ چہرہ کہیں کھو گیا ہے۔ تمہارا بھی اور میرا بھی۔ سارا غازہ' سارے رنگ' ساری خوشبو — سب کچھ چہرے کے ساتھ کھو گیا ہے۔ اب چہرے کی تلاش بیکار ہے۔

گلاس میں پڑا ہوا چہرہ خوشی میں چیختا ہے۔ جھریاں کانپتی ہیں۔ میری آنکھیں جل رہی ہیں کان جل رہے ہیں۔ گلا خشک ہوا جا رہا ہے۔ میں انگارے چبا رہا ہوں۔

اتنی بڑی' اتنی لمبی زندگی' اتنا چھوٹا سا چہرہ' اتنا چھوٹا سا گلاس اور اتنا خوفناک قہقہہ۔

میں نے دوسرا گلاس اٹھا لیا۔ ایک ہی چوٹ سے گلاس کا سر ٹوٹ گیا۔ ٹوٹا ہوا کنارا دانتوں کی طرح چمکنے لگا۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ دانت پیس کر ٹوٹے کنارے کو اپنی کلائی پر رکھا دانت گوشت میں چبھے' میں نے گلاس گھما دیا۔ کلائی ادھڑ کر رہ گئی۔ میں نے گرم پھواروں کو گلاس پر' میز پر' چھت پر گرتے دیکھا۔ گرم پھواریں' جن کا کوئی رنگ نہیں تھا' میری رگوں سے پھوٹی تھیں۔ میں نے چاروں طرف دیکھا۔ چھت ویران تھی' آسمان کی طرح جن پر ستارے بجھ رہے تھے' دیکھتے دیکھتے ستاروں کی گرد نے مجھے گھیر لیا۔

گلاس کے ٹوٹ جانے کا مجھے افسوس ہے جس میں تمہارا چہرہ ڈوب گیا تھا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم کہیں ہو اور مجھے دیکھ رہی ہو۔ اور میں صرف اس لیے مسکرا رہا ہوں کہ میں تمہاری آنکھوں کے سفر سے ڈرتا ہوں۔ میری مسکراہٹ تمہاری آنکھوں کا راستہ روکے کھڑی ہے۔ اب تمہاری آنکھیں مسکراہٹ کے سوا کچھ نہیں دیکھ سکتیں۔

میں گلاس اٹھاتا ہوں اور منہ سے لگاتا ہوں۔ میرا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ اب یہ گلاس بھی خالی ہے۔

❀ ❀ ❀

جیلانی بانو

جوائے

جوائے مقناطیس کا ایسا ٹکڑا تھا جس پر گھر کے بکھرے ہوئے سب ذرے چمٹ جاتے تھے۔

''بھوں — بھوں — بھوں —'' اس گھر میں صبح بہ یقین جوائے کی آواز سے آتا ہے۔

میرا گھر — جہاں سب ایک دوسرے سے منہ پھیر کر جی رہے تھے' ایک دوسرے کا جی جلا کر اپنا جی خوش کرتے تھے' باہر ملنے والی ساری ناکامیوں' ناانصافیوں کا انتقام' ایک دوسرے سے لیتے تھے۔

مگر جوائے انہیں کچھ کرنے بھی دے۔ اب تو صرف گھر میں جوائے کی مرضی چلتی ہے۔ کسی کو پیار آتا ہے تو جوائے پر — ہنسی آتی ہے تو جوائے کی حرکتوں پر — اس کا موڈ' اس کی محبت' اس کی پسند ناپسند — کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے جیسے صدر خاندان کی کرسی پر میری بجائے جوائے بیٹھا ہو اس گھر میں۔ جوائے ہر کام کی نگرانی کرتا ہے۔ باہر جانے والوں کو گیٹ تک چھوڑتا ہے۔ اندر آنے والوں کو پہلے شک و شبہ سے دیکھتا ہے اور پھر ان کے کردار کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد ہی انہیں اندر آنے کی اجازت دیتا ہے۔ پھر کچن کی نگرانی کرتا' دیواروں سے جھانکنے والی بلیاں' درختوں پر شور مچانے والے کوئے اور دروازے پر بیل بجانے والے اجنبی چہروں سے نپٹنے میں وہ خوب تھک جاتا ہے۔

''بھوں — بھوں — بھوں — اٹھو اٹھو —'' وہ اجالا ہونے سے پہلے مجھے جھنجھوڑ ڈالتا ہے۔ ''کوئی اچھا خواب تو تمہارے نصیبوں میں ہے نہیں' تو پھر چلو۔ نیچے سڑک پر کوئی خوبصورت خیال' خوبصورت دلچسپ حادثہ' ڈھونڈیں۔''

اونہہ — میں اپنے چہرے پر جوائے کے پیار کی نمی پونچھ کر کروٹ بدل لیتا ہوں۔

کوں — کوں — کوں — جوائے اب میرے بستر پر آ گیا ہے۔

میری بیوی رما نیند کی گولی کھا کر سوتی ہے اور جوائے یہ بات جانتا ہے کہ اس جرأت پر اس وقت وہ رما کی لات نہیں کھائے گا۔

تو دروازہ کھول کر اندر کیسے آ جاتا ہے— ؟ میں اس کی گردن پکڑ کر نیچے دھکیل دیتا ہوں۔
ہم دونوں سونے سے پہلے اپنے اپنے موسم بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی مجھے گرمی لگتی ہے۔ کبھی رما کو سردی' پھر دن بھر کے شکوے شکائتیں' ایک دوسرے پر الزاموں کی بوچھاڑ اور ان سے بچنے کے لیے کرنٹ والے تار ہم نے اپنے چاروں طرف پھیلا رکھے ہیں۔ جب میں رما کی طرف بڑھتا ہوں تو کتنے سوئچ آن اور آف کرنا پڑتے ہیں۔

مگر جوائے انہیں ایک ہی چھلانگ میں پار کر کے مجھے پیار کرنے آ جاتا ہے۔ اس ادا پر اس کا منہ نہ چومیں تو کیا کریں۔

مگر اس کے بعد رما کی نفرت بھری چھی چھی— تھو تھو—

اور تھوڑی دیر بعد جب رما بستر پر بیٹھی جمائیاں لیتی ہے تو جوائے اس کی گود میں چڑھ کر بھی اپنا پیار وصول کر لیتا ہے اور چوری پکڑے جانے پر وہ ایسے سر جھکا لیتی ہے جیسے میں نے اسے کسی عاشق کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔

میں ایک ناکام بزنس مین ہوں۔ بیوپار میں گھاٹا میرا بلڈ پریشر بڑھا دیتا ہے۔ مگر صبح ٹی وی پر بڑھتی ہوئی قیمتوں کا نشان مجھے پرسکون کر دیتا ہے۔ ایسے وقت انسان کا جی چاہتا ہے' آنکھیں بند کیے راتوں رات لکھ پتی بننے کا خواب دیکھے۔

لیکن ڈاکٹر نے مجھے صبح سویرے چلنے کا حکم دیا ہے اور یہ بات سب بھول جائیں جوائے نہیں بھولتا۔ سڑک پر آنے کے بعد میرے ہاتھ میں جوائے کی زنجیر ہوتی ہے۔ مگر جوائے تو جیسے زنجیر میرے گلے ڈال کر من مانے راستوں کی اور چل نکلتا ہے۔

چار منزلوں کی سیڑھیاں اترنے کے بعد میرا جی چاہتا ہے لان کی بنچ پر ہی بیٹھا رہوں۔ مگر جوائے کے لیے تو صبح کے اُجالے میں بے شمار وعدے اور امیدیں جگمگاتی ہیں۔ رات کو اس راہ سے گزرنے والی کتیاں یہاں اپنی خوشبو بکھیر گئی ہیں۔ جوائے اپنے نتھنے پھیلا کر منہ اٹھا کر ہوا میں کچھ سونگھتا ہے اور انجانی راہوں پر بھاگنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی بزنس کے دم گھونٹ دینے والے پھندوں سے جان چھڑا کر میرا جی چاہتا ہے میں ایک نظم لکھوں۔ کھلی ہوا میں بیٹھ کر کسی نئے خیالوں کو پکڑوں۔

مگر جوائے بھی ایک دیکھنے والا آرٹسٹ ہے جو اپنی نئی تخلیق کی کھوج میں آگے دوڑنا چاہتا ہے۔ کبھی میں آگے آگے چلتا ہوں اور جوائے ایک سعادت مند بچے کی طرح ساتھ ساتھ میرے موڈ کو دیکھتے ہوئے چلتا ہے۔ پھر اچانک سڑک کا کوئی نظارہ اسے دوڑنے پر مجبور کر دیتا ہے اور میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے ہانپ جاتا ہوں۔ میں ایک ناکام بزنس مین' معمولی سا شاعر— ساری زندگی اونچا اڑنے کے خواب دیکھتا رہا۔

''ڈیڈی— آپ نے بزنس کی لائن اپنانے سے پہلے کسی سے مشورہ نہیں کیا؟

''ڈیڈی آپ کے کلاس فیلو کتنے مشہور ڈاکٹر ہیں۔ آپ نے میڈیسن میں ایڈمیشن کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

اپنے بچوں کے ایسے سوالوں پر میں گھبرا جاتا ہوں۔

''ارے انہوں نے تو زندگی بھر جس سودے میں ہاتھ ڈالا گھاٹا ہی کھاتا''۔ رما ٹھنڈی سانس بھر کے اپنا ماتھا پیٹ لیتی ہے۔

اور مجھے چاروں طرف دھواں ہی دھواں نظر آتا ہے۔

رما جتنی سندر تھی اتنی ہی کڑوی۔ شیرہ ٹپکاتی گلاب جامن جیسی اس موہنی سی لڑکی پر میں اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا تھا۔ پھر جس دن اپنی کرہ میں اس کا پلو باندھ کر میں اپنے گھر کی سیڑھیاں چڑھا تھا تو جیسے کسی پہاڑ پر چڑھتا گیا۔ رما مجھ سے دور ہی دور کھڑی ہنستی رہی اس نے میرے گلے میں ایک رسی ڈال کر ڈگڈگی بجا دی تھی۔

اب میں جوائے کے گلے میں رسی ڈال کر بھاگ رہا ہوں۔ ہم دونوں ہانپ رہے ہیں میں جانتا ہوں وہ جس راستے پر جا رہا ہے وہاں آگے کچھ نہیں ہے۔ مگر کھوج اور کسی انہونی خوشی سے مڈبھیڑ' اُسے دیوانہ بنائے رکھتی ہے وہ قریب سے گزرنے والے لوگوں' کاروں اور اسکوٹروں کو بڑے غور سے دیکھتا ہے اور پسند نہ آنے والے چہروں پر بھونکنے لگتا ہے۔

''ارے احمق یہ تو کسی منسٹر کی کار تھی تجھے کیا ضروری تھا اس پر بھونکنا؟''

یہ سن کر جوائے رکا اور پاس والے کھمبے کی طرف ٹانگ اٹھا کر پیشاب کرنے کی ایکٹنگ کی۔ اس سے پہلے وہ ہر پسند نہ آنے والے چہرے کو دیکھ کر یہی کام کرتا رہا ہے۔

اب آسمان پر وہم کی طرح نظر آنے والا اُجالا' آنے والے دن کا یقین بن کر پھیل رہا ہے۔

وہ ابھی تک نہیں آئی۔ ہم دونوں ایک ساتھ دور تک دیکھتے ہیں۔

رات کو وہ اس راہ سے گزری تھی۔ نتھنے چوڑے کر کے جوائے اس کی خوشبو سونگھتا ہے۔

پھر اچانک دور سے آنے والی روزی کی بھوں' بھوں اسے روک دیتی ہے۔ وہ منہ اوپر اٹھا کر ''آشیانہ'' مکینوں سے کہتا ہے۔ ''بھوں بھوں بھوں — چھوڑ دو روزی کو سلاخوں کے پیچھے مت بند کرو۔ روزی ڈیر نیچے آؤ۔''

''نرا احمق ہے تو — '' مجھے غصہ آجاتا ہے۔ وہ تو بند دروازوں کے پیچھے قید ہے۔ اس کی موٹی مالکن کو ٹہلنے کے نام سے چڑ ہے۔ اس لیے وہ اپنی نازک اندام کنواری کتیا کو عاشق مزاج کتوں سے دور رکھتی ہے۔ سلاخوں والی کھڑکی کے پیچھے بٹھا دیتی ہے کہ جوائے جیسے کتے بھونکتے بھونکتے بے حال ہو جائیں۔

چلاؤ مت یار

''وہ مل جائے گی تو اور پچھتاؤ گے بیٹا۔''

مگر جوائے اپنی محبتوں کے سراغ جانے کہاں کہاں کھوجتا پھرتا ہے۔ جگہ جگہ رک کر وہ پنجوں سے زمین کھود ڈالتا ہے۔ اپنی منہ زور خواہشوں سے بیتاب ہو کر چھلانگیں لگاتا ہے۔ مجھے اکتاہٹ ہونے لگتی ہے۔ اسے آگے ہی آگے دوڑتی ہوئی سڑک پر میرے لیے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ جوائے کی زنجیر تھام کر اس کے پیچھے پیچھے چلنا ہی میرا کام ہے۔

ڈاکٹر نے کہا ہے روز پانچ کلومیٹر چلنا چاہیے۔ اس فاصلے کو کئی بار میں نے دل میں ناپا' پٹرول پمپ سے آگے' آئس کریم پارلر کے پاس— مگر جوائے کے لیے کوئی حد آتی ہی نہیں۔

روزی کے لیے چلاتے چلاتے ایک پرندے کا اڑتا ہوا پر اس کے لیے نئی خوشیوں کا سامان لے آیا— وہ جی بھر کے اچھلا کودا' غرایا اور پھر اس پر کو منہ میں دبوچ کر میری گود میں ڈال دیا۔ جوائے کے لیے اس دنیا میں کتنی خوشیاں تھیں اور میں خالی ہاتھ گود میں رکھے فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوں۔

ایک عورت کی غصہ بھری نظریں اُسے پھر آگے کی طرف دوڑانے لگتی ہیں۔ اپنے گلے میں پڑی ہوئی زنجیر کو وہ اب نہیں مانتا۔ جیسے زنجیر اس نے میرے گلے میں ڈال دی ہو سڑک پر جتنی خوبصورت عورتیں جا رہی ہیں۔ وہ جوائے کو دیکھ کر ہنستی ہیں۔ راستہ چلنے والے بچے اسے دیکھ کر سیٹی بجاتے ہیں۔ چمکیلی دھوپ اس کے لیے نکلی تھی۔ اُسے ٹھنڈی ہوائیں مل رہی تھیں' مزیدار خوشبوئیں' انوکھے منظر دلچسپ کھلونے۔

اور میرے ساتھ صرف تیز دھوپ ہے آج آنے والے بزنس کی الجھنیں اور ہر پل زیادہ گرم پڑھنے والا سورج۔

سڑک پر چہل قدمی کرنے والے سب لوگ جوائے کو وش کرتے ہیں کتے کے سر پر ہاتھ پھیرنا مہذب ہونے کی نشانی ہے اور مجھ جیسے فالتو آدمی سے سڑک پر بات کرنا اونچی سوسائٹی میں اچھا نہیں سمجھا جاتا اس لیے جب جوائے میرے ساتھ ہو تو لوگوں کو وہ اکیلا ہی نظر آتا ہے اور جب میں سڑک پر اکیلا ہوں تو لوگ مجھے ایک آدمی کی طرح نظر انداز کر دیتے ہیں۔

ہم دونوں سر جھکائے اب گھر کی طرف چل رہے تھے کہ اچانک سڑک پر دور پنکی اپنی ماں کے ساتھ نظر آئی اور ہم دونوں کے دلوں کی کلی کھل اٹھی۔

جوائے......جو......جو......جو

وہ سڑک پر ملے تو جوائے کے لیے سٹیاں بجاتی ہے۔ جوائے اس کی آواز سنتے ہی بھاگتا ہوا پنکی کی گوری پنڈلیوں سے لپٹ جاتا ہے اس کی فراک پکڑ کر جھولتا' اُسے دھکے دے کر آس پاس

منڈلاتا ہے۔ پنکی ہم دونوں کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتی ہے۔ اس نے ایک بار ٹی وی پر میری نظم سنی تھی اور مجھ سے آٹو گراف لینے آئی تھی۔

پنکی کی مسکراہٹ کی ٹھنڈک' اس کے قرب کی آنچ' اس کی نظروں کی پسند' میری تھکن بھی اتار دیتی ہے۔ کبھی کبھار جوائے سے کھیلنے کے بہانے پنکی ہمارے گھر بھی آنے لگی ہے۔ حالانکہ اس کی ماں سے لان خراب کرنے کے سلسلے میں رما کی زبردست جنگ ہو چکی ہے مگر وہ ارچنا کی سہیلی ہے اور دوستی کا بندھن اب جوائے سے بندھ گیا ہے۔ پڑوس کے سب بچے ہمارے گھر کو صرف جوائے کا گھر کہتے ہیں۔

پنکی کے گھر میں آتے ہی جوائے میری کرسی کے نیچے سے اچھل کر اس کی طرف بڑھتا ہے۔ خوشی سے بھری کوں کوں کے ساتھ دھکیلنے لگتا ہے۔ پنکی اس کے لیے چاکلیٹ لاتی' یا چھوٹا سا بال اور ان دونوں کی اچھل کود' چیخ پکار سے سارا گھر گونج اٹھتا۔ جوائے کے ساتھ کھیلتے کھیلتے پنکی میرے کمرے میں آجاتی تو میں گھبرا کے کھڑا ہو جاتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی کوئی نہ کوئی بات ہو جاتی۔ میری کوئی چیز ضرور کھو جاتی تھی اور میں سارے کمرے کو الٹ پلٹ کر ڈالتا۔ تب جوائے میرے سامنے پھیلا ہوا اخبار کو سمیٹ کر ڈسٹ بن میں ڈال آتا — سب ہنسنے لگتے۔

''اب یہ بہت ستانے لگا ہے پنکی''۔ ارچنا بھی ان کے کھیل میں شریک ہو جاتی تھی۔

''جوائے کو جو چیز اچھی نہیں لگتی اسے ڈسٹ بن میں پھینک دیتا ہے'' پنکی ہنسنے لگی۔

''سچی — ؟''

''ہاں' ہماری کوئی چیز کھو جائے تو ڈسٹ بن مل جاتی ہے' پرسوں ممی کی لپ اسٹک۔''

''ارچنا' شور مت کرو — میرے سر میں درد ہو رہا ہے''۔ ممی کی ڈانٹ سن کر ان دونوں کی ہنسی تھم گئی۔

''بھوں بھوں بھوں'' جوائے نے رما کو ڈانٹ دیا۔

''چپ رہو — ہر وقت کی بک بک — ''

رما کو جوائے پر غصہ تو بہت آیا پھر سب کے سامنے یوں ظاہر کیا جیسے جوائے کو جانور سمجھ کر معاف کر دیا ہے۔

میری ہنسی بڑی دیر تک نہ رکی۔ جوائے نے جیسے آج میری دلی مراد پوری کر دی۔ رما کو کوئی ڈانٹ سکے یہ کیسی ان ہونی بات تھی۔

ناشتے کی میز پر اخبار رکھا ہو گا۔

چاروں طرف دنیا میں گھمسان کا رن پڑا ہے۔ اخبار والی میز کے آس پاس بھی گھر کی بڑی طاقتوں کے درمیان شدید تضاد تھا۔ رؤمی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ جائیداد میں سے اپنا حصہ لے

کر امریکہ چلا جائے گا تاکہ ایسے احمق باپ اور ضدی ماں سے پیچھا چھڑا سکے۔ ارچنا اپنی پڑھائی چھوڑ کر اس اسٹیج اداکار سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی' جو اب تک دو بیویوں کو چھوڑ چکا ہے۔ رما سمجھتی تھی اس گھر میں اس کے احکام نہ مانے جائیں' یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی اولاد کے بگڑنے کی ساری ذمہ داری ان کے باپ پر ہے جو اتنا مفلس ہے اور اتنا بزدل ہے کہ اولاد پر کوئی رعب ہی نہ ڈال سکا۔

کویت ایک چھوٹا سا ملک ہے جس پر راتوں رات ایک بڑی طاقت نے حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اخبار کی یہ خبر بریڈ کے سلائسوں اور مارملیڈ کی مٹھاس میں کڑواہٹ کھو چکی ہے۔

رما اور بچوں کے ساتھ اس وقت بولنے والے ڈائیلاگس میں راستے بھر یاد کرتا رہا ہوں۔

ہمیں دروازے میں دیکھ کر سب سے پہلے رومی سیٹی بجاتا ہے۔ ''جُو جُو جُو — ''

اب جوائے میرے ہاتھ سے زنجیر کا سرا چھڑا کر رومی کی طرف اچھلتا ہے۔ اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا ہے۔ اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر جھنجھوڑ ڈالتا ہے۔ رومی بڑی محبت سے اس کے بال سہلاتا ہے۔ خوب مکھن لا کر بڑے چاؤ سے اسے سلائیس کھلاتا ہے اور پھر گھبرا کر مجھ سے پوچھتا ہے۔ ڈیڈی آج تو شاید آپ کو جوائے کا انجکشن بھی دلوانا ہے نا — ؟'' (یہ صرف ڈیڈی سے بات کرنے کا بہانہ ہے)

میں کوئی جواب نہیں دیتا' صرف سر ہلا دیتا ہوں (اس ڈائیلاگ کی مجھے امید نہیں تھی نا)

''اتنی دیر لگا دیتے ہو آنے میں'' رما بھی ابلا ہوا انڈہ توڑتے کچھ کہنا ضروری سمجھتی ہے۔

''ہمیں جلدی جانا ہے۔ اس لیے ہم نے ناشتہ شروع کر دیا'' ارچنا سر جھکا کر کہتی ہے۔

''صبح سویرے لوگ اندھا دھند کار چلاتے ہیں۔ ذرا دیکھ بھال کر لے جایا کرو جوائے کو۔''

کرسی پر بیٹھ کر میں اپنی پلیٹ کو سیدھا کرتا ہوں۔ جانے ڈاکٹر نے کل مجھے کیا پرہیز بتایا تھا۔

بہت بھوکا ہے بیچارہ — خوب تھک گیا ہے نا — سنو پہلے جوائے کو دودھ دے دو'' ارچنا چاہتی ہے اس وقت سب جوائے کی بات کریں۔ اس کے بارے میں نہیں۔

ڈاکٹر نے مجھے ناشتے سے پہلے دو دوائیں کھانے کو کہا ہے مگر اتنا تھک گیا ہوں کہ بیڈ روم سے دوائیں لانے کو جی نہیں چاہتا۔

''کیوں! آج پھر ناشتہ نہیں کرو گے — ؟'' رما بیزار سی میری طرف دیکھتی ہے۔

''اچھا اچھا ابھی کھاتا ہوں۔''

''جوائے' جوائے — جوائے — ارچنا سے کھیل رہی ہے۔ وہ ارچنا کو چھو چھو کر بھاگ

رہا ہے' کبھی صوفوں پر اچھلتا ہے۔ کبھی اس کی ساری کو پلو پکڑ کے کھینچتا ہے۔

فون کی گھنٹی بجی — جوائے کھیلنا چھوڑ کر فون کی طرف منہ کر کے بھونکنے لگا۔ اسے فون آنے سے بڑی چڑ تھی۔ اتنی دیر اسے چپ رہنا پڑتا ہے نا۔

فون رومی کے لیے تھا — وہ تو منہ پر انگلی رکھ کر جوائے سے کہا چپ — چپ — "

جوائے چپ ہو گیا مگر نیچے بیٹھنا اس کے بس میں نہ تھا۔ اس لیے چاروں طرف ایسی چیزیں ڈھونڈنے لگا جو اس کمرے میں اسے غیر ضروری لگ رہی تھیں۔ اس نے پہلے ارچنا کی کتاب صوفے سے اٹھا کر ڈسٹ بن میں ڈالی۔ پھر میری دوا کا پیکٹ' رما کے بالوں سے گرے پھول!

"جوائے اسے بھی ڈسٹ بن میں ڈالو" میں گھبرا گیا۔ ارچنا نے میری طرف اشارہ کیا تھا — نہیں میرے پیروں کے پاس چھوٹا سلائیس پڑا تھا۔

"آپ ناشتہ کیوں نہیں کرتے" رما بیزار ہوتی جا رہی تھی۔

"ہاں' کرتا ہوں پہلے دوا کھانی ہے۔"

"اتنی دوائیں کھا کھا کے ہاضمہ خراب کر لیا ہے"۔ وہ منہ بنا کر میز سے اٹھ جاتی ہے —

سلائیس پھینکنے کے بعد جوائے نے رومی کا سگریٹ کیس منہ میں دبایا اور ڈسٹ بن کی طرف بڑھا۔ مگر فون رکھ کر اس نے جوائے کے منہ سے سگریٹ کیس چھینا۔ ایک تھپڑ اس کے منہ پر لگایا اور ایک فحش گالی دی۔ "میری کسی چیز کو ہاتھ لگایا تو مار کے اُسی ڈسٹ بن میں پھینک دوں گا۔"

مار کھا کر جوائے چکرا گیا — گالی سن کر سہم گیا — لڑکھڑاتا ہوا وہ میری طرف آیا اور میرے قدموں کے پاس بیٹھ کر ہانپنے لگا۔

جوائے کے پٹنے پر رما تلملا سی گئی۔ مگر غصے میں بھرے بیٹے کے سامنے منہ کھولنے کی ہمت نہ پڑی۔

"وہ گالی برداشت نہیں کر سکتا"۔ ارچنا کو بھی جوائے کا پٹنا اچھا نہ لگا — "ہاں اسے تو ڈانٹ دو تب شرمندہ ہو جاتا ہے"۔ ارچنا نے اپنا پرس اٹھا کر باہر جاتے ہوئے کہا — "وہ بھی کوئی انسان ہے کہ مارنے لگے؟"

جوائے کے مزاج سے اس گھر میں سب اچھی طرح واقف تھے اس کی تکلیف پر سب کو دکھ ہوتا ہے۔ جوائے تم لکی ہو۔

گھر سے باہر جاتے وقت گھر کا ہر فرد بڑی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑا رہتا ہے۔ سب اپنے چہروں پر دوسرا ماسک چڑھاتے ہیں۔ ہنستے مسکراتے' دنیا کو اپنانے اور اپنی چالاکی کو کیش کرانے کے لیے اچھا میک اپ اور اچھی ایکٹنگ ضروری ہو گئی ہے۔

"جُو — جُو — جُو — " باہر جاتے وقت رومی نے روٹھے ہوئے جوائے کو منانا ضروری

سمجھا' اور اس کی آواز سنتے ہی اچھل کر دوڑنا اور رومی کی ٹانگوں سے لپٹ جانا ضروری تھا۔ جب تک رومی کی کار گیٹ سے باہر نہ چلی جاتی وہ چلا چلا کر اچھلتا رہتا تھا۔ مگر آج اس نے ذرا سی آنکھ کھول کر رومی کو دیکھا اور منہ پھیر کر لیٹ گیا۔

مجھے شک ہونے لگا۔ جوائے میں کسی انسان کی روح آ رہی ہے۔ وہ دھیرے دھیرے انسانوں جیسا بن رہا ہے۔ اگر سچ مچ ایسا ہو گیا تو — کسی ڈسٹ بن میں پھینک دیئے جاؤ گے —!

اخبار پڑھتے پڑھتے مجھے اونگھ سی آنے لگی۔

میں کھانے کی میز کے نیچے پڑا رومی کی مار سے کراہ رہا تھا — میرے گلے میں ایک زنجیر پڑی تھی جسے جوائے گھسیٹ رہا تھا۔

''کیسی بے دردی سے گھسیٹتے ہوئے — ؟'' رما جوائے سے کہہ رہی تھی — ''آؤ میری گود میں آؤ —''

میں کود کر رما کی گود میں جا بیٹھا — اور جب رما نے اپنا محبت بھرا ہاتھ میرے بالوں پر پھیرا تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جانے کون رو رہا تھا —! میں — ؟ یا وہ — ؟

❁ ❁ ❁

م لعل

نئی دھرتی پرانے گیت

سائیں داس شام کو چھ بجے گھر لوٹا' تھکا ماندہ اور پریشان' سائیکل ڈیوڑھی میں دیوار کے ساتھ لگا کر اندر آیا۔ برآمدے میں اس کی ادھیڑ عمر بیوی چارپائی پر بیٹھی اپنے آگے ڈھیر سارے شلغم رکھے ایک بڑی چھکور میں کاٹ کاٹ کر ڈالتی جارہی تھی۔ اپنے شوہر کی طرف دیکھ کر پہلے تو مسکرادی۔ پھر اس کی مغموم صورت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بولی: ''خیر تو ہے!''

سائیں داس ایک لمبی 'ہوں' کہہ کر ٹائی کی گرہ کھولتا ہوا سیدھے کمرے کے اندر گھستا چلا گیا۔ کوٹ پینٹ اتار کر ایک رنگین تہمد باندھ لیا اور آرام کرسی پر دھنس کر بیٹھ گیا۔ اس کی بیوی بھی اندر چلی آئی۔ شلغموں کی چھکور اور چھری اٹھائے ہوئے۔

''بتاتے نہیں بات کیا ہے؟''

''کوئی نئی بات تھوڑی ہے بھلی لوک''۔ اس نے ایک لمبی سانس لے کر کمرے کی پرانی چھت کو گھورا۔ بوسیدہ' دیمک لگی' لکڑی کی کڑیاں چھت کے بوجھ سے جھکی جھکی سی تھیں۔ کسی بھی لمحے گر بھی سکتی تھیں۔ کمرے کی وسطی دیوار میں سنگ مرمر کا ایک پتھر نصب تھا۔ جس پر سیاہ حروف میں —'اللہ اکبر' لکھا تھا۔

''آج پھر کلیم آفس کی خاک چھانتا پھرا ہے۔ دفتر سے آدھ گھنٹے کی چھٹی لے کر گیا تھا۔ پر وہاں لگ گئے پورے چار گھنٹے۔''

''پھر؟— کچھ ملا مکان کی مرمت کے لیے!''

''خاک— کہتے ہیں ایک ہفتے کے بعد آؤ۔''

''بتایا نہیں انہیں سردیوں کی جھڑی لگ گئی تو مکان ہی گر پڑے گا!''

''اندھیر ہے' نرا اندھیر اگر کچھ ملنے کی امید ہو تو اپنا ہی تھوڑا بہت بیچ باچ ڈالیں۔

''کیا بھروسہ بھلی لوک' دفتروں کی کارروائیوں کا۔ ملتے ملتے دو سال تو لگ ہی جائیں گے۔''

اس کی بیوی پاس پڑے پلنگ پر بیٹھ گئی دھیرے سے بولی:

''آج وہ — ٹھاکر داس اور اس کی بیوی' دونوں آئے تھے۔ بیٹے کا شادی کارڈ دینے۔''

''اچھا!''

''ہاں آپ تو تھے نہیں۔ میں نے بھی مناسب نہیں سمجھا کچھ کہنا' سننا۔ کارڈ لے کر رکھ لیا جانے میں نے کہاں رکھ دیا ہے!''

اُس نے سرلا کر ذرا اونچی آواز سے پکارا: ''سرلا' نی سرلا!!۔''

ذرا فاصلے سے ایک مترنم جواب سنائی دیا...... ''جی ماتا جی۔ آتی ہوں۔''

اور پھر پاؤں میں پہنے ہوئے ربڑ سول سلیپروں کی ہلکی ہلکی ٹھپ ٹھپ کی آواز پیدا کرتی ہوئی جس میں ایک رقص کا سا ترنم اور نظم تھا' اٹھارہ انیس سال کی شلوار قمیص اور دوپٹے میں ملبوس ایک خوبصورت لڑکی کمرے کے اندر داخل ہوئی۔ اس نے اپنے باپ کو بیٹھا ہوا دیکھا تو مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھ گئی۔ کرسی کی پشت پر پڑے ہوئے باپ کے کپڑے دیکھے تو انہیں لپک کر اٹھا لیا اور ہینگر میں لگا کر دیوار پر لٹکاتی ہوئی ماں سے بولی۔

کہیئے نا ماتا جی کیا کام ہے۔

''پتر وہ کارڈ کہاں رکھا ہے ترلوک کی شادی والا۔ جو آج ہی اس کے ماں باپ دوپہر میں دے گئے تھے!''

''یہاں رکھا تو ہے!'' وہ دیوار گیر پر رکھی ہوئی ایک تصویر کے پیچھے سے ایک بڑا سا لفافہ نکال کر لے آئی۔

سائیں داس کچھ منٹ تک بڑی خاموشی سے کارڈ پڑھنے میں محو رہا۔ اس کی بیوی ایک شلغم کو دھیرے دھیرے چھیلتی ہوئی بولی:

''کیا خیال ہے؟ جایئے گا شادی میں؟''

سچ پوچھو تو جی تو نہیں چاہتا۔ انہوں نے اب تک ہمارے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ کارڈ لینا ہی نہیں چاہیے تھا تمہیں۔''

یہ کہہ کر سائیں داس نے اپنے سرخ و سفید چہرے کو دونوں ہاتھ رگڑ رگڑ کر ملا۔ پھر اپنی مہندی سے رنگی ہوئی سرخ مونچھوں کو سہلایا۔ پھر وہ ٹھوڑی کے نیچے بلاوجہ کھجانے لگا۔ اس کی اونچے بانس کی ناک اور سختی سے بھنچے ہوئے ہونٹوں سے اس کی اندرونی خفگی کا ایک واضح اظہار ہو رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ اسی طرح تھکی تھکی اور اکتاہٹ بھری آواز میں بولا: ''اسی مکان کا قصہ لے لو۔ ہماری ایلاٹمنٹ کینسل کرانے کی ٹھاکر داس نے کتنی کوشش کی۔ سر توڑ کوشش کی نا! پر کامیاب نہ ہو پایا۔ اس نے ہمارے ساتھ ایسا حاسدانہ رویہ نہ اپنایا ہوتا تو آج ہم ایک دوسرے کے کتنے قریب ہوتے! یاد ہے تم ہی نے ایک بار مجھ سے اپنی سرلا اور ان کے ترلوک کا ذکر کیا تھا!''

سرلا اپنا نام سن کر دھیرے سے باہر چل دی۔ سر جھکا کر۔ اب اس کا ربڑ سول سرخ سلیپروں کا پہلا سا مترنم آہنگ سنائی نہ دیا۔ وہ مایوسی میں ڈوبی ہوئی ایک محتاط سی چال تھی بس!

''ہاں!!— وہ تو تب کی بات ہے جب رام دیوان آٹھوں پہر میرے گھر میں گھسی رہتی تھی۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی کام لیے چلی آ رہی ہے۔ بہن یہ بات ہے! اسے تو سوئی میں دھاگا بھی ڈالنا ہوتا تو مجھ سے صلاح لیے بغیر ایسا نہیں کرتی تھی۔ دوڑتی بھاگتی' بیچ کی دیوار اولانگھ کر جھپاک سے میرے پاس پہنچ جاتی تھی۔ اب وہی پڑوس ہے۔ وہی رام دیوان ہے اور میں بھی وہی ہوں۔ لیکن بیچ کی دیوار اونچی ہو گئی ہے۔ اور مہینوں بیت جاتے ہیں ایک دوسرے کی شکل دیکھے ہوئے۔ انہوں نے حضرت گنج میں دکان کیا کھول لی دماغ ہی آسمان پر جا پہنچا ہے!

یہ کہہ کر سائیں داس کی بیوی نے جلدی جلدی ایک شلغم کی کئی ڈلیاں کاٹ ڈالیں۔ بالکل بے خیالی میں اور سائیں داس بولا:

''روپیہ محبت کا دشمن ہوتا ہے بھلی لوک' روپیہ پا کر تو آدمی قریبی سے قریبی رشتے تک بھول جاتا ہے۔ ایک ہی ماں باپ کے جائے ایک دوسرے کے ویری بن جاتے ہیں ہمارا تو بس ایک ہی شہر کا ناطہ تھا۔ پاکستان سے نکل کر یہاں پہنچے تو اتفاق سے پڑوسی بن گئے تھے۔''

''پر ہم لوگ بھی کتنے عجیب ہیں۔ اس شہر کی کئی لاکھ کی آبادی میں اپنی طرف کے مشکل سے تیس چالیس گھر ہوں گے۔ اس پر بھی آپس میں مل بیٹھتے نہیں! ایک دوسرے کے ساتھ نام کو بھی ہمدردی نہیں رہ گئی ہے!''

یہ کہہ کر سائیں داس کی بیوی نے ایک انگلی سے کان کو زور زور سے کھجایا۔ اطمینان نہ ملا تو کان میں پڑا ہوا جھمکا اتار لیا اور کان کو دھیرے سے ملنے لگی۔ اس کے کانوں کے کنارے کئی سوراخ تھے۔ کسی زمانے میں اس کے یہی کان کئی کئی طلائی بالیوں کے بوجھ سے پھلوں سے لدی ہوئی شاخوں کی مانند جھکے رہتے تھے اب تو وقت کے ساتھ سمجھوتہ کر کے وہ ایک ایک ہی جھمکا پہننے لگی ہے۔

اس کے شوہر نے کوئی جواب نہ دیا اور آنکھیں بند کیے کیے آرام کرسی کی پشت کے ساتھ سر ٹکا کر سوچتا رہ گیا تو وہ چھکور میں سارے شلغم سمیٹ کر باہر جاتی ہوئی بولی: ''روٹی پکاؤں؟ پریتم اور اشوک بھی آتے ہوں گے۔''

''کہاں گئے ہیں وہ؟''

''کہیں یار دوستوں میں گپ لڑا رہے ہوں گے!''

وہ باہر نکل گئی۔ سائیں داس سوچ میں ڈوبا بیٹھا رہا۔ ٹھاکر داس کے ساتھ اپنے تعلقات پر غور کرتا رہا۔ کتنے سال انہوں نے اسی شہر میں گزار لیے ہیں۔ وقت پر لگا کر اڑتا جا رہا ہے۔ جب آئے تھے تو دونوں کے بچے چھوٹے چھوٹے سے تھے۔ آج بڑے ہو کر شادی بیاہ کی عمر کو پہنچ گئے

ہیں۔ ٹھاکر داس بیٹے کی بارات لے کر تین سو میل دور ایک دوسرے شہر میں جائے گا۔ سردیوں کا موسم اوپر سفر کی تکلیفیں اور گرانی! ہوں! لیکھ سنجوگ کی ہی بات ہے!

اُسے اچانک کچھ آوازیں سنائی دیں۔ بولنے اور چل کر آنے کی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ سر گھما کر دیکھا۔ آنگن میں کچھ لڑکیاں اس کی بیوی کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ وہ چلی گئیں تو اس کی بیوی نے اندر آ کر بتایا — ''ٹھاکر داس کی لڑکیاں آئی تھیں آج رات ان کے ہاں رت جگا ہے۔ گائیں بجائیں گی۔ میرے تو بھئی جوڑوں میں درد رہتا ہے۔ صاف کہہ دیا میں نہیں آسکتی۔ سرلا کو بھیج دوں گی۔''

یہ کہہ کر وہ پھر رسوئی میں لوٹ گئی۔ سائیں داس پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ سرلا اگلے سال ایم۔اے کرے گی۔ اگلے سال اسے پروویڈنٹ فنڈ سے قرض لینا ہوگا کلیم کا روپیہ پتہ نہیں کب تک ملے۔ لڑکی کے ہاتھ پیلے کرنے ہی ہوں گے۔ بھگوان کو منظور ہوا تو یہی مکان کلیم کو مل جائے گا۔ چار بڑے بڑے کمرے ہیں ایک بڑا سا آنگن ہے کسی بے چارے مسلمان کا ہے وہ بھی پاکستان میں کسی ہندو کے مکان میں اپنی عزت آبرو سمیٹے رہ رہا ہوگا اسے بھی کچھ غم ستاتے ہوں گے۔ اپنوں اور پرایوں کے۔ وہ بھی لوگوں کے بدلتے ہوئے رویوں کی شکایت کرتا ہوگا اپنے صدیوں کے ٹھکانوں سے اکھڑ کر انسان ہر کہیں دکھ جھیلتا ہے پر سب دن ہوت نہ ایک سمان۔ مصیبتیں بادلوں کی طرح زندگی پر چھا جاتی ہیں۔ مطلع صاف ہو جاتا ہے پھر دھوپ بھی نکل آتی ہے۔ سائیں داس آنکھیں بند کیے کیے مسکرا دیا۔ ایک خیالی اطمینان سا محسوس کر کے آنکھیں نیم وا کر کے دیوار پر لگے 'اللہ اکبر' کے کتبے کو دیکھا۔ اسے دیکھتا رہ گیا۔ سیاہ جلی حروف ابھر کر اس کے قریب آ گئے۔ اس کی آنکھوں کے بالکل سامنے' پھر وہ ایک دوسرے میں گھلنے ملنے لگے۔ سارے حروف مل کر ایک لمبی عمودی لکیر بن گئے۔ زمین سے اٹھ کر آسمان کو چھونے والی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے ڈھلک پڑے۔

اچانک اس کے کانوں میں پھر کچھ آوازیں آئیں اس نے پوری آنکھیں کھول دیں۔ آنسو پونچھ ڈالے۔ سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کے دونوں بیٹے چلے آ رہے تھے۔ سرخ و سفید چہرے' لمبے لمبے قد ماتھے پر ایکٹروں کے سے انداز میں بال بکھرائے اور چوڑے پائنچوں والی پتلونوں میں ہاتھ ڈالے' مسکراتے ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے سرلا چلی آ رہی تھی۔ اپنے بھائیوں کی طرح لمبی اور پتلی۔ سنہرے بالوں کی موٹی سی چوٹی کو بار بار کھولتی اور گوندھتی ہوئی۔

''پتا جی' ہم ترلوک کی بارات میں جائیں گے۔''

''ہاں پتا جی۔ ہم ضرور جائیں گے۔ وہ بہت زور دے رہا ہے۔ نہیں تو ناراض ہو جائے گا—''

سرلا بھائیوں کے پیچھے سے نکل کر باپ کے پاس آ بیٹھی۔ کرسی کے بازو پر اور سائیں

داس کے کرتے کے بٹن بند کرتی ہوئی بولی۔ ''پتا جی' میں بھی جاؤں گی۔ پشپا مجھے ساتھ لیے بغیر مانے گی نہیں۔ آپ جانتے ہیں وہ میری کلاس فیلو ہے اور کتنی گہری فرینڈ بھی۔''

سائیں داس نے سب کی طرف حیران ہوکر دیکھا اور پھر بلند آواز میں بیوی کو سنانے کے لیے بولا— ''لوسنو! یہ سب کے سب بارات میں جائیں گے۔ جیسے وہ لوگ سچ مچ انہیں ساتھ لیے بنا روانہ ہی نہ ہونگے۔''

اس کی بیوی نے رسوئی میں سے جواب دیا۔ ''ٹھیک پرائی احمق بچے! ان کا تو دماغ خراب ہے۔ آپ ہی سمجھائیے۔''

''نہیں پتا جی! ہم ضرور جائیں گے۔ اسی بہانے میرٹھ بھی دیکھ لیں گے۔ وہاں ہم ابھی تک نہیں گئے۔

''ارے بھئی اگر سیر سپاٹا ہی کرنا ہے تو کسی اور بہانے سے وہاں چلے جانا گرمیوں کی چھٹیوں میں!''

''نہیں پتا جی! پلیز! میری ساری فرینڈز جا رہی ہیں۔''

اچھا اچھا۔ ہٹو اب یہاں سے۔ سر پر سوار مت ہو۔ سوچیں گے۔ ابھی تو کئی روز پڑے ہیں۔''

کہاں کئی روز پڑے ہیں۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ پرسوں بارات جائے گی۔ شام کی گاڑی ہے۔''

''پر پُتر ان کے ساتھ ہمارے تعلقات پہلے جیسے نہیں ہیں کہ اب سب کے سب شریک ہو جائیں بس ایک جنا چلا جائے۔ کوئی بھی تم میں سے۔''

تینوں بچوں کے چہروں پر اداسی پت گئی۔ کھانے پر بھی وہ منہ لٹکائے بیٹھے رہے۔ بڑی بے دلی سے کھانا کھایا۔ دیوار پار سے لڑکیوں کے ڈھولک بجانے اور گانے کی آواز آنے لگی تو وہ سب اپنے ماں باپ کے چہرے تکنے لگے۔ کوئی لڑکی بڑی شیریں آواز میں گا رہی تھی۔ من ڈولے تن ڈولے میرے دل کا گیا قرار رے!

بچوں کو ماں باپ کی آنکھوں سے امید کی کوئی جھلک نہ ملی تو وہ ایک دوسرے کی طرف بجھی بجھی نظروں سے دیکھنے لگے۔ سرلا کے لیے تو یہ سوچ سوچ کر نوالہ نگلنا مشکل ہو رہا ہے کہ اسے رت جگے میں بھی جانے کی اجازت ملتی ہے کہ نہیں! لیکن اچانک اس کی ماں نے یہ کہہ کر اس کی مایوسی انتہائی خوشی میں بدل دی ''کھانا کھالے تو ذرا دیر کے لیے وہاں چلی جانا۔''

وہ کھانا اسی دم ختم کر کے جلدی جلدی پانی کے دو گھونٹ حلق سے نیچے اتار سلیپروں میں پاؤں پھنساتی ایک ہی چھلانگ میں باہر نکل گئی۔

پریتم اور اشوک بھی جلدی جلدی باہر جانے لگے تو سائیں داس نے پوچھا:

''کہاں جا رہے ہو؟''

جواب ملا: ''ابھی آتے ہیں پتا جی۔ ذرا ترلوک کے یہاں جا رہے ہیں۔ وہاں ہمارے دوست آئے ہوئے ہیں۔''

سائیں داس تازہ حقہ بھر کر پھر کمرے میں جا بیٹھا۔ صبح کا اخبار سامنے رکھ لیا۔ اخبار کا ایک آدھ صفحہ وہ روزانہ رات کو ہی اسی وقت پڑھنے کے لیے چھوڑ دیا کرتا تھا۔ اس کی بیوی بھی رسوئی کے کام کاج سے فرصت پا کر اپنے بستر پر آ بیٹھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا برتن بھی تھا جس میں وہ تیل گرم کر کے لے آئی تھی۔ انگلیاں تیل میں ڈبو ڈبو کر گھٹنوں اور پنڈلیوں پر ملنے لگی۔

پڑوس میں گانوں کی آواز اونچی ہوتی گئی تو وہ ناک چڑھا کر بولی — ''آج کل سڑی فلموں کے ہی گانے گائے جانے لگے ہیں۔ یہی ہر موقع پر سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔''

''ہوں!'' سائیں داس اپنے حقے کی گڑگڑاہٹ اور اخبار کی خبروں میں کھویا ہوا تھا۔ اس کی بیوی نے اپنی بات کو دہرانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ گھٹنوں اور پنڈلیوں پر مالش کر چکی تو تیل سے چکنے ہاتھوں کو اپنے سر کے رنگے ہوئے بالوں پر مل لیا جو مہندی لگانے سے ڈب کھڑبے ہو گئے تھے۔ اسی لمحے ایک گانے کی سریلی آواز کمرے میں آئی۔ سیاں جھوٹوں کا بڑا سرتاج نکلا! تو سائیں داس نے اخبار ہاتھ سے جھٹک دیا اور گرج کر بیوی سے بولا:

''جا کر سرلا کو بلا لاؤ۔ کس کی شادی پر گا رہی ہے! ہمارے کون لگتے ہیں وہ!''

بیٹی کے گانے کی آواز سن کر سائیں داس کی بیوی کے چہرے پر بھی ویسی ہی برہمی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے ابھی ابھی ٹانگوں پر گرم گرم تیل ملا تھا۔ اور رضائی میں گھسنے لگی تھی لیکن بیٹی کو بھی منع کرنا ضروری تھا اور کون جاتا وہاں! اُس نے جلدی جلدی دونوں ٹانگوں پر اور لنگڑاتی ہوئی سی باہر نکل گئی۔

جب تک سرلا کے گانے کی آواز آتی رہی سائیں داس نہ اخبار کی طرف متوجہ ہو سکا نہ ہی حقے کی نے میں سے دھواں کھینچ پایا۔ کچھ منٹوں کے بعد سرلا کی آواز آنی بند ہو گئی تو اس نے اخبار پھر اپنے آگے سرکا لیا اور حقہ گڑگڑانے لگا لیکن ابھی وہ چند ہی سطریں پڑھ پایا تھا کہ اس کے کانوں میں ا یک عجیب سی آواز آ پہنچی۔ جیسے وہ بہت دور سے آئی ہو۔ سات سمندروں اور سات پہاڑوں پر سے پرواز کرتی ہوئی۔ بڑی جانی پہچانی سی آواز تھی وہ۔ ڈھولک اور گھنگھروؤں کے تال پر کوئی عوت گا رہی تھی۔

میں آئی ماہیا توں مل دے
میڈا بونہہ کر نیدا اے دل دے

بھاویں جانڑیں بھانویں نہ جانڑے
میڈا ڈھول جوانیاں مانڑے

سائیں داس نے اخبار پھر ایک طرف رکھ دیا۔ حقے کی نے اس کے ہونٹوں کے ساتھ ہی لگی رہ گئی۔ وہ اداس سا ہو کر خلا میں گھورنے لگا۔ کتنی صاف شیریں اور تیز تلوار کی دھار جیسی آواز تھی! سینکڑوں میلوں پر پھیلے ہوئے اندھیرے اور سمندروں کی گہرائی جیسی خاموشی کا جگر چیرتی ہوئی اس کے دل پر پھیلے ہوئے اندھیرے اور سمندروں کی گہرائی جیسی خاموشی کا جگر چیرتی ہوئی اس کے دل پر آ کر پیوست ہو گئی تھی۔ اُسے کون بلا رہا تھا۔ اُس کے خوابیدہ جذبات پر کون دستک دے رہا تھا' برسوں پہلے بھی اس نے ایسی ہی ایک آواز سنی تھی۔ یہی بول سنے تھے۔ جب وہ بیس سال کا گبرو تھا۔ سر پر لمبے لمبے پٹے سجاتا تھا اور ننھی ننھی سنہری و بھوری مونچھیں رکھنے لگا تھا۔ مغربی پنجاب میں دریائے سندھ کے کنارے راحت بخش' خنک اور سنہری ریت کے ٹیلوں کے درمیان بسے ہوئے علاقے میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ماہیا گایا کرتا تھا۔ اس کے لبوں سے نکلے ہوئے بول جب چاندنی راتوں میں اڑتے اڑتے جوان کنواریوں کے کانوں میں جا پہنچے تو وہ اپنی چھتوں پر لیٹی لیٹی چونک کر اٹھ بیٹھتی تھیں' اور منڈیروں پر چڑھ کر حد نظر تک چاندنی میں نہائے ہوئے ریت کے ٹیلوں کی طرف بڑی بے چینی سے گھورنے لگی۔

اچانک سائیں داس کو یاد آیا اس کی بیوی سرلا کو بلانے کے لیے گئی ہوئی ہے۔ وہ ابھی تک لوٹ کر نہیں آئی ہے۔ کیا اُس نے بھی یہی آواز سنی ہے؟ اگر سن لیتی تو وہ بھی اسی طرح حیران رہ جاتی۔ اس کی مانند اپنے آپ کو بھول جاتی۔

میں پانی بھریندی یاں راتیں
شالا وڈی ہووی حیاتی
بھاویں جانڑے بھانویں نہ جانڑے
میڈا ڈھول جوانیاں جانڑے

یہ محض آواز نہ تھی۔ کوئی غیبی کشش بھی تھی جو اسے اپنی جانب کھینچ رہی تھی۔ اسے پکار رہی تھی۔ صدا دے رہی تھی۔ لمبی عمر پانے کی دعا بھی۔ اور اس کے سامنے اپنے دل کی کیفیت بھی بیان کر رہی تھی۔ چاند رات میں کنویں یا ندی پر پانی بھرنے کے بہانے جاتی ہوئی اس سے ملنے کی التجا کر رہی تھی۔ اس کی جوانی کا واسطہ دے دے کر اسے بلا رہی تھی۔ اسے یاد تھا۔ عمر کے کئی کڑے کوس نکل جانے کے باوجود اسے وہ ایک ایک لمحہ دیا تھا عشق اور اضطراب میں گزری ہوئی ساری کی ساری کیفیت اس کے ذہن میں ابھی تازہ تھی۔ اپنی پوری دردانگیزی اور شدت کے ساتھ۔ وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ زندگی کے ان بہترین لمحوں کو جو پھر کبھی لوٹ کے نہیں آ سکتے تھے۔

وہ آہستہ سے اٹھا۔ تہمد کو اچھی طرح کس کے کمر کے گرد باندھا اور بنا کھانسے بنا کوئی آہٹ پیدا کیے ہوئے ہولے ہولے قدم رکھتا ہوا آنگن میں سے گزرا اور پڑوس کی دیوار کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اندھیرے میں دیوار کے ساتھ بنے ہوئے تندور کو ٹٹولا۔ اس کی مضبوطی کا اندازہ لگایا اور ایک لکڑی کے صندوق سے کوئلے الٹ کر اسے تندور کے اوپر جما دیا اور سنبھل سنبھل کر اس کے اوپر چڑھ گیا۔ اس کا سر دیوار سے اوپر نکل سکتا تھا۔ وہ جھانک کر بھی دیکھ سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہ کیا۔ سر جھکا کر ہی گانا سنتا رہا جو اس کی روح کی پیاس کو بجھاتا بھی تھا اور بھڑکاتا بھی۔ یہ نہ دیکھ سکا کہ کون گا رہی تھی۔ وہ اس کی کانوں میں رس ٹپکانے والی آواز ہی سنتا رہا۔

اساں اِتھے تے ماہی ساڈا اوڑتھے
کلی راتیں پیا دل دھڑکے
بھاویں جانڑے بھاویں نہ جانڑے
میڈا ڈھول جوانیاں مانڑے

وہ تندور کے اوپر اکڑوں بیٹھا سن رہا تھا۔ اس کے چاروں اور اندھیرا تھا۔ وہ کمرے کی روشنی بھی بجھا کر آیا تھا لیکن گیت کے جادو بھرے الفاظ اس کے سامنے جیسے سیمیں پردے پر کوئی فلم پیش کرتے جا رہے تھے۔ برستی کالی و تنہا راتوں میں کھڑکی سے لگ کر اپنے محبوب کا انتظار کرتی ہوئی کوئی حسینہ! وہ کب واپس آئے گا؟ تلاشِ معاش اس کے محبوب کو اس سے کب تک جدا رکھے گی؟

میں اِتھے تے ماہی میڈا لوہڑے
میڈا کلاہ پیا دل اوہڑے
رُت ملنے دی ڈھول جانی

ڈھولک کی تھاپ تیز ہوگئی۔ تال بدل گیا۔ گھنگھروں کے چھناکے اور عورتوں و لڑکیوں کے قہقہے بھی بلند ہو گئے۔ اور ایک اور گیت ایک نئی آواز کے ساتھ گونجنے لگا۔

تیڈی ماتا میڈی ماسی
بکے چلہے تو ادب نہ راہسی
دکھری تھیندی آں ڈھول جانی
ساڈی گلی آویں تیڈی مہربانی

ہر بار ایک مختلف آواز آنے لگی۔ نئے بولوں کے ساتھ طنز' مزاح اور حقیقت سے بھرپور باتیں' زندگی کی ساری سچائیاں اور تلخیاں ان بولوں میں موجود تھیں۔ ناچ' گانے اور قہقہوں کے ساتھ ایک دوسرے کو کوسا جا رہا تھا۔ شکوے اور شکائتیں کی جا رہی تھیں یہ مقصد کسی دوسرے ذریعے سے

حاصل کر لینا ذرا مشکل لگتا تھا۔ یہ صرف گیتوں کے ہی ذریعے آسان ہو جاتا تھا۔ گیت جو ایک قوم کی خاصیت تھے۔ گیت جو ایک قوم کا مزاج تھے۔ ایک خاص علاقے کی صدیوں کی روایات اور تہذیب و تمدن کے حامل تھے۔ سینکڑوں میل کا فاصلہ اور دشوار گزار منزلوں کی صعوبتیں برداشت کر کے یہ گیت سینوں کے اندر محفوظ کر کے یہاں تک لے آئے گئے تھے۔ کتنی بہنیں اور بچے اور ماں باپ گنوا کر بھی اس خزانے کو لٹنے سے بچا لیا گیا تھا آج وڑچھا لکھنوٴ سے بہت دور ہے۔ لودھراں لوٹ جانے کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔ لیکن ان علاقوں کی یاد ان کا حسن' ان کی سردی اور گرمی سینے کے اندر پوری طرح محفوظ ہے۔ نئی نسل کے لڑکے اور لڑکیاں حیران ہو رہی ہیں وہ لوگ اس زبان کے جس میں گیت کہے گئے ہیں محاوروں اور چٹخاروں سے آشنا نہیں ہیں۔ اس محبت' سادگی' بے ساختگی' خلوص اور حسن سے مالا مال زبان کا محافظ اب کون بنے گا' حالات نے انہیں نئی سرزمین پر پیدا کر دیا ہے۔ بولنے اور سمجھنے کے لیے ایک نئی زبان دے دی ہے۔ ان کی آباو اجداد کا اتنا بڑا سرمایہ ان کے ماں باپ کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔ تیس سے پچاس برس تک کی عمر کی عورتوں کی یہ ٹولیاں پھر یہ گیت نہیں گائیں گی۔ یہ سارے سر خاموش ہو جائیں گے۔ یہ تال ٹوٹ جائیں گے۔ یہ چراغ بجھ جائیں گے ایک ایک کر کے سارے چراغ۔

سائیں داس کے کانوں میں اچانک اس کی بیوی کی آواز آئی تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا بالکل بے اختیار سا ہو کر دیوار سے سر نکال لیا۔ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ اس کے چہرے پر ادھر جگمگاتی ہوئی تیز روشنی پڑ سکتی ہے اس نے عورتوں کے ہجوم میں اپنی بیوی کو دیکھ لیا اور حیران رہ گیا۔ وہ سر پر پگڑی کے انداز میں اپنا دوپٹہ باندھے اور جوڑوں کا درد بھول کر ناچ رہی تھی اور گا رہی تھی۔

میں اتھے تے ماہی میڈا واں تے
لگا آویں بدلاں دی چھاں تے
رُت گرمی دی ڈھول جانی
ساڈی گلی آویں تیڈی مہربانی

اُس نے دونوں بازو دیوار پر ٹیک دیے۔ اس کا جی چاہا بیوی کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر وہ بھی ایک دو بولیاں گائے۔ عورتوں و لڑکیوں کو ناچتا ہوا دیکھنے کے لیے بہت سے مرد لڑکے کمروں سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ بڑی مسرت سے سب کی طرف دیکھتا رہا۔ ان سب کو وہ جانتا تھا۔ اچانک کسی نے اس کے بازو کو چھوا۔ اور اس کی نگاہ دیوار کے اس پار ٹھاکر داس پر ٹک کر رہ گئی جو کسی چیز پر چڑھ کر ابھر رہا تھا۔ اس کے بالمقابل آ رہا تھا۔ ٹھاکر داس زور سے ہنس بھی پڑا اور خوشی سے گلوگیر آواز میں بولا — ''آ نا یار! ادھر آ جا' بڑا مزہ آ رہا ہے!''

سائیں داس نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا۔ ٹھاکر داس کو گھور کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے خلوص کو پرکھا جسے اپنے آبائی علاقے کے جذبات بھرے لوک گیت دل کی گہرائیوں میں سے نتھار کر اوپر لے آئے تھے۔ وہ مسکرا دیا۔ اپنے بازوں پر بدن کا سارا بوجھ ڈال کر اوپر کو اٹھا کر اور اچک کر دیوار پر بیٹھ گیا۔ ٹھاکر داس کے کندھے پر ایک بازوں پھیلا دیا اور دوسرا ہاتھ اپنے کان پر رکھ کر ایک لمبی تان لگائی۔ اس کے سامنے اس کے بچے تھے۔ بیوی تھی محلے بھر کی عورتیں۔ لڑکیاں اور مرد تھے۔ وہ سب کی موجودگی سے اچانک بے نیاز ہو گیا۔ اپنی عمر کو بھی بھول گیا۔ اپنے آپ کو پھر سے واپس لے گیا جوانی کے دور میں۔

چھلا پائی کھڑی میں دوں
نمبردار وڑی داتوں
وِن ڈے غریباں نوں
دے بلا مکھنا!
چھلا ٹوری رکھنا!

اس کی آواز سن کر اور اسے دیوار پر بیٹھا ہوا دیکھ کر عورتیں اور لڑکیاں مارے شرم کے ایک دوسری پر گر گر کر ڈھیر ہوتی گئیں اور ٹھاکر داس نے ہنستے ہنستے سائیں داس کو اپنے بوڑھے مگر مضبوط بازوؤں پر اٹھا کر اپنی طرف اتار لیا۔

❀ ❀ ❀

جوگندر پال

بُو

ڈاکٹر سروپ کے چپراسی چرنجی نے اپنی محتاط نظروں سے ڈاکٹر کے دفتر کے دروازے کی طرف دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے سر سے گاندھی ٹوپی اتارنے لگا۔ اس کے سر سے ایک دم سوسو کے کئی نوٹ فرش پر آ گرے اور وہ گھبرا کر انہیں تیز تیز سمیٹنے لگا۔

اسی اثنا میں ایک بوڑھا بے تحاشہ کمرے میں داخل ہوا۔ ''ڈاکڈر جی — ! ڈاک!''

''ارے باہر جاؤ!'' چرنجی گھبرا کر فرش سے اٹھا اور بوڑھے کو دروازے کے باہر دھکیلنے لگا۔

''ہر کوئی بے دھڑک اندر آ دھمکتا ہے بولتا ہوں کسی کو بلا اجازت اندر مت آنے دیا کریں''۔ اُس کی حیدرآبادی 'کر کے' کی منطق سے ڈاکٹر سروپ اس قدر مرعوب تھا کہ لہجے میں تاثر پیدا کرنے کے خواہش سے اس کے منہ سے بھی 'اس لیے' کی بجائے بے اختیار 'کر کے' ہی نکل جاتا۔

چرنجی نے دروازہ بھیڑ کر اندر سے چٹخنی چڑھا لی اور نوٹ گننے لگا''۔ ایک' دو' تین — چودہ''۔ وہ پھر فرش پر جھک گیا۔ ایک اور کہاں گیا؟

ڈاکٹر سروپ اس کے گنجے سر پر چپکے ہوئے ایک نوٹ کو دیکھ کر ہنسنے لگا: ''ہمارے سر پر اُگیں تو گندے بال اُگتے ہیں مگر معلوم نہیں کیا سوچتے رہتے ہو' جب بھی ٹوپی اُٹھاتے ہو' تمہارے سر پر بڑے بڑے نوٹوں کا جھنڈ کا جھنڈ اُگا ہوتا ہے''۔ ڈاکٹر کو یاد آیا کہ آج اسے اپنے ڈینڈرف کی دوا لے کر گھر جانا ہے۔ اس کی بیوی نے کہا تھا' تمہارے گندے بالوں کی بُو سے کھایا پیا منہ کی طرف پلٹ آتا ہے۔ چرنجی نے نوٹ کو اپنے گنجے سر سے اکھاڑنے کے انداز میں ہاتھ میں لیا اور ایک دفعہ پھر نوٹوں کو گن کر ڈاکٹر سروپ کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ ''پندرہ ہیں' صاحب''

''صرف پندرہ؟''

ڈاکٹر کے ماتھے پر تیوری دیکھ کر چرنجی نے کہا: ''دو ہزار کا ہفتہ طے کر گیا تھا صاحب' مگر چکتائی پر حرام کی اولاد کرنے لگا' اس موسم میں برف نیچے زمین پر کہاں ملتی ہے؟ اسے آسمان سے کھود کر لانا پڑتا ہے۔''

''تو کیا ہوا؟ برف میں تھوڑا کم کما لے اور بھی تو بیسیوں آئٹم ہیں۔''

''کر کے' میں نے بولا تھا صاحب' ٹھیکے کو دو حصوں میں بانٹ دیجئے اور گنگو سے بھی معاملہ کر لیجئے وہ بڑا ایمان دار آدمی ہے۔''

''اس دیال کے بچے کو بھی تو تم ہی لائے تھے۔''

''لایا تو میں ہی تھا مگر کیا بولنا' آج کل سبھی اپنے دھرم ایمان کو بیچے ہوئے ہیں اب اگلے چار ہفتے پندرہ سو پر ہی چلنے دیجئے۔ وہ بولتا ہے چار ہفتوں کے بعد موسم کھل جائے گا' پھر وہ کھل جائے گا' پھر وہ پورے دو ہزار دینا شروع کر دے گا۔ ڈاکٹر نے پانچ نوٹ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا:

''ڈیڑھ سو تمہارا' اور ڈیڑھ سو کیئر ٹیکر کا باقی کے دو سو بڑے بابو کو دے دو۔''

''ٹھیک ہے صاحب'' چرنجی نے نوٹوں کو پھر ٹوپی کے نیچے رکھ لیا اور جانے کے لیے دروازے کی طرف مڑا' مگر دو قدم چل کر رک گیا: ''کیئر ٹیکر صاحب نے کہا تھا صاحب' میرے چپراسی کے لیے بھی ایک سو لایا کرو۔''

ڈاکٹر سروپ نے اسے قریب آنے کا اشارہ کر کے ایک سو کا ایک اور نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ''کر کے دیال سے کم سے کم سولہ سو ہی وصول کر لیتے۔''

چرنجی نے نوٹ کو ویسے ہی اپنی ٹوپی کے نیچے جما لیا۔ ''آج کل آپ جیسے رحمدل افسر کہاں ملتے ہیں صاحب۔ آپ تو اپنی ساری پر جا کے کھیون ہارا ہیں۔''

چرنجی کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے آدھا اٹھ کر پتلون کی پچھلی جیب سے اس کے دیئے ہوئے نوٹ نکالے اور یونہی ان پر نگاہ ٹکا لی اور ریزرو بینک آف انڈیا کے گورنر کی طرف سے ادائیگی کے وعدے کی تحریر پڑھنے لگا — سرکار جو وعدہ کرتی ہے اُسے ہمیشہ پورا کرتی ہے لیکن لوگوں کا یہ حال ہے کہ کسی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا — پورے پانچ سو کم ڈاکٹر دیال پر ابھی تک بہت غصہ آ رہا تھا — خیر اُسے معلوم ہو جائے گا کہ سرکاری معاملوں میں زبان سے پھرنا اتنا آسان نہیں — اس نے نوٹوں کی تہہ جما کر انہیں پھر جیب میں رکھ لیا اور سوچنے لگا کہ ڈائرکٹر چھ سے کم میں نہیں ٹلے گا۔ سارا کام ہم لوگ کرتے ہیں اور وہ بڈھا مفت میں سب سے بڑا حصہ اڑا لے جاتا ہے۔ سالا اکیلا آدمی ہے' اتنے پیسوں سے کرتا کیا ہے؟ آج شام کو گھر لوٹتے ہوئے میں اسکاچ کی بوتل لے جاؤں گا اور سوڈا بھی۔ اسکاچ میں پانی ملانے سے تو بہتر ہے کہ صرف پانی ہی پی لیا جائے۔

''مگر پیاس تو پانی سے ہی بجھتی ہے''۔ اس کی بیوی روشنی اپنے شوہر کی شراب کی لت سے چڑی رہتی تھی۔ ''ہاں' مگر جن کی پیاس پہلے ہی مری پڑی ہو انہیں تو زندہ کرنا ہوتا ہے''۔ روشنی سے جھگڑتے ہوئے اس کا دماغ روشن ہو جاتا۔

''ارے او سروپ' تمہاری بیوی ہے' پھول سی بچی ہے ہم سے تمہاری پیاس زندہ کیوں نہیں ہوتی؟'' پھر ناری کو یکلخت اپنی بے بسی پر غصہ آنے لگتا'' ۔ تم — تم مردوں کے ڈاکٹر ہو۔ روپ' تم کیا

جانو، کسی بےکل روح کی بچی کھچی سانسیں اکٹھی کر کے اسے اپنے پیروں پر کیسے کھڑا کیا جا سکتا ہے؟"

جب ڈاکٹر سروپ کو پیشہ ورانہ نااہلی کے باعث ٹرانسفر پر سرکاری اسپتالوں کی زنجیر کے اس مردہ خانے کا انچارج بنایا گیا تھا تو وہ بہت تلملایا تھا کہ اتنے سالوں کے تجربے کے باوجود اُسے موت کی سندیں لکھنے اور مردوں کی دیکھ بھال پر مامور کر دیا گیا ہے۔

"دل چھوٹا مت کرو ڈاکٹر"۔ اُس کے ایک سنیئر شریکِ کار نے اسے تسلی دینے کے لیے سمجھایا تھا۔ سرکاری ڈاکٹر یہاں ہو، یا وہاں، ایک ہی بات ہے۔ وہاں وہ مریض کو موت کی راہ پر ڈالتا ہے اور یہاں مریض اُس راہ پر چلتے ہوئے اس کے پاس آ پہنچتا ہے"۔ اس نے ہنستے ہوئے ڈاکٹر سروپ کی پیٹھ تھپکی تھی۔ "بڑے آرام دہ ٹھکانے پر آ لگے ہو۔ اب چین کی بانسری بجاؤ"

ڈاکٹر سروپ نے واقعی چین کی بانسری بجاتے ہوئے ہی یہ سارے سال بتا دیئے تھے۔ بہت ہونے پر بھی اس کے چارج میں بیس سے زیادہ مردے نہ ہوتے۔ ان میں سے بیشتر لاوارث ہوتے۔ ڈاکٹر اپنے دفتر سے باہر چوبیس گھنٹے کا نوٹس لگانے کے بعد لاوارث مردوں کو سرکاری تجربہ گاہوں میں کام میں لانے کے لیے بھیج دیتا۔ مردوں کی دیکھ بھال کرتے کرتے وہ زندوں کا علاج کرنا بھول ہی گیا تھا۔ سرکاری رجسٹر میں 'نارمل' کا اندراج کر کے وہ دراصل اس امر کی تصدیق کرتا تھا کہ 'مریض' قطعی طور پر مر چکا ہے۔ ایک دفعہ چرنجی اپنی بیماری کے باعث چھٹی کی درخواست لے کر آیا تو ڈاکٹر سروپ نے اُس سے کہا: "ادھر آؤ تمہاری نبض دیکھوں"۔ اور نبض پر انگلی رکھے چند لمحات وہ اسے نہایت متانت سے محسوس کرتا رہا اور پھر بولا: "تمہیں کوئی تکلیف نہیں، جاؤ کام کرو۔"

"مگر صاحب—"

"کہہ دیا ہے نا، جاؤ، تمہاری نبض بالکل بند ہے۔"

چرنجی کا یہ حال تھا کہ ہنستے ہنستے وہ اپنی بیماری بھول گیا تھا اور ڈاکٹر سروپ کو غصہ آ رہا تھا کہ یہ بدتمیز اس طرح ہنس کیوں رہا ہے۔

چرنجی کا آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔

"ایک بات کہوں صاحب؟" ایک دن وہ ڈاکٹر سے کہنے لگا: "اگر کبھی اچانک میرا دم نکل جائے تو مجھے کہیں ڈاکٹری تجربوں کے لیے مت بھیجئے۔"

"کیوں؟"

آپ تو جانتے ہیں صاحب، میڈیکل کالجوں کے لونڈے چنگوں بھلوں کو کس طرح لوٹاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے گوشت کی گٹھریوں میں ٹوٹی پھوٹی ہڈیاں سی ہوئی ہیں۔"

"اب بھی تو تم ایسے ہی دکھتے ہو۔"

چرنجی نے سر کھجانے کے لیے اپنی ٹوپی اتاری تو اس کے گنجے سر سے دس کا نوٹ نیچے آ گرا۔

''یہ نوٹ کہاں سے مارا ہے؟''

''آپ سے کیا پردہ' صاحب گنگو ٹھیکیدار آیا ہوا تھا۔ انعام دے گیا ہے۔ آپ کو سلام بولنے کو کہہ گیا ہے۔''

''اس سے کہو' صرف سلام بول دینے سے کام نہیں بنتا۔''

بڑا دلدار سیٹھ ہے صاحب۔ آپ اس کی طرف ایک بار نظر بھر کے دیکھیں گے تو وہ اپنے آپ کو بیچ کر بھی آپ کی خدمت کرتا رہے گا۔''

ڈاکٹر سروپ نے خود کو پھر یاد دلایا کہ آج اسکاچ اور سوڈا لے کر گھر جاؤں گا۔

''آج پھر؟''

پچھلے ہفتے تو اس کی بیوی نے چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا تھا اور پھر بلڈ پریشر سے بستر پر چت ہو گئی تھی اور کھلی آنکھوں سے بے ہوش پڑی تھی۔ اُس نے انجانے میں اس کی آنکھیں بند کر دی تھیں اور اس کے دل کی دھڑکن محسوس کر کے ایک دم خوف سے پیچھے ہٹ گیا تھا کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر سروپ نے اچانک سر اٹھایا اور دیکھا کہ کوئی شخص اس کے دفتر کے دروازے کے عین وسط میں اڑا اڑا سا کھڑا اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلے تو ڈاکٹر نے اُسے باہر انتظار کرنے کو کہا اور پھر آنکھیں جھپک کر حیرت اور ہیبت سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا — یہ کیسے ہو سکتا ہے؟

''میں اپنے بھائی کو لینے آیا ہوں''۔ وہ شخص دو چار قدم آفس کے اندر چلا آیا۔ ''میں اُسے دیکھ آیا ہوں شاید وہ وہی تھا۔''

''او — ہ — ہ — !'' ڈاکٹر نے ڈھیلا ہو کر کھلی سانس لی: ''مجھے خیال گزرا تھا تمہارا بھائی خود آپ ہی مردہ خانے سے اٹھ کر چلا آیا ہے۔ پرسوں شام کو اسے یہاں بھیجا گیا تھا۔''

''ہم جڑواں بھائی ہیں'' اُس شخص نے گریاں سی آواز میں ڈاکٹر کو بتایا۔

ڈاکٹر اپنے حواس پر قابو پانے کے لیے ہنسنے لگا: ''میں تو ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ مانو ایک مردے نے دوسرے پر آنکھیں گاڑ رکھی ہوں''۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' وہ ابھی تک اپنی واردات کے طلسم میں گرفتار تھا''۔ مردے بھی ضرور کہیں نہ کہیں ہماری طرح بس جاتے ہوں گے۔ ٹھہرو' بولو نہیں — ! کیا پتہ' کیا پتہ' ہم بھی مردے ہوں۔ میں نے کہیں پڑھ رکھا ہے کہ ہر شخص دراصل اپنی موت سے پہلے ہی مر چکا ہوتا ہے۔ نامعلوم' کب سے — ؟'' وہ گویا اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا تھا: ''مجھے بڑی دھندلی سی یاد آ رہی ہے' میں نے بھی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دی تھی اور پھر مجھے یہاں مردہ خانے میں بھیج دیا گیا تھا' پچھلے پندرہ سال سے میں یہاں گل سڑ رہا ہوں''۔ اس نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر بتایا اس اجنبی کے سامنے کیا رونا رونے لگے ہو۔ نیور مائینڈ!

وہ سر جھٹک کر سیدھا بیٹھ گیا۔ ''میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟''

''میں اپنے بھائی کی لاش لینے آیا ہوں۔''

اب تک ڈاکٹر سروپ اپنے معمول پر آ چکا تھا۔

''لاشیں یونہی ہر آتے جاتے کے حوالے نہیں کی جاتیں۔ پہلے ہمارے آفس کا ایک فارم بھرو۔ نہیں، دو ــــ سمجھے! کسی مجسٹریٹ کا تصدیق شدہ حلف نامہ لاؤ اور ایک اعلان نامہ، جس پر دو گواہوں کے دستخط ہوں اور ان دو میں سے ایک کو ہمارے دفتر کا کوئی آدمی بخوبی جانتا ہو ــــ جاؤ اب!''

نووارد پریشان ہو کر کھڑا ہو گیا: ''کہاں جاؤں؟''

''کہیں بھی، میں کیا بتاؤں؟''

''فارم، اعلان نامہ ــــ''

ساتھ کے دفتر میں بڑے بابو سے ملو۔ وہ تمہیں سمجھا دے گا۔''

وہ شخص جانے کے لیے اٹھنے لگا تو ڈاکٹر سروپ کو شاید اس پر ترس آ گیا۔ ''بیٹھ جاؤ۔ مردے کے مندرجات میرے رجسٹر میں نوٹ کروا کے جاؤ''۔ اس نے ایک رجسٹر کھول لیا ''نام؟''

''امریک سنگھ۔''

''امریک سنگھ کس کا نام ہے تمہارا یا اس کا؟''

''میرا''

''ارے بھائی، اس کا نام بتاؤ جسے تم لینے آئے ہو؟''

''کشن سنگھ''

''عمر؟''

''میری عمر پینتیس برس ہے۔''

''مجھے تمہاری عمر سے کیا غرض؟ لاش کی عمر بتاؤ؟''

''ہم جڑواں بھائی ہیں''

''تو میں کیا کروں؟ لاش کی عمر بتاؤ اور اس کا پتہ؟''

امریک سنگھ چڑ گیا۔ ''میں کیا پتہ بتاؤں؟ وہ تو آپ کے پاس ہی گل سڑ رہی ہے۔''

ڈاکٹر بھی چڑ گیا۔ ''گل سڑ نہیں رہی، ایئر کنڈیشنڈ ڈارمیٹری میں ہے اور وہاں برف میں رکھی ہے۔''

''میں وہیں سے آ رہا ہوں۔ ایئر کنڈیشنر کام نہیں کر رہا اور جتنی بھی تھوڑی سی برف تھی، وہ پگھل چکی تھی۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' ڈاکٹر سروپ نے گھنٹی بجائی جسے سن کر چپڑاسی دوڑتا ہوا آ پہنچا۔

ڈاکٹر نے بو سونگھنے کے لیے ناک سے ایک لمبی سانس لی۔ ''کیا تمہیں بو آ رہی ہے چرنجی؟''
چرنجی نے بھی اسی کے مانند اپنی ناک کو پھڑ پھڑایا۔
''ہاں' بو تو آ رہی ہے صاحب۔''
''تو میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ جاؤ' بڑے بابو سے کہو ایئر کنڈیشن والے کو فوراً بلائے نہیں تو لاشیں اپنی بو کی تاب نہ لا کر ادھر سے ادھر آ نکلیں گی۔ کیئر ٹیکر سے بھی میرے پاس آنے کو کہو' جاؤ!''
چرنجی اپنی ٹوپی اتارنے کے لیے سر کی طرف ہاتھ اٹھانے لگا تو ڈاکٹر سروپ نے چوکنا ہو کر اسے روک دیا۔ ''نہیں' سر کو ڈھنپا رہنے دو''۔ پھر وہ امریک سنگھ سے مخاطب ہوا۔ ''تم بھی بڑے بابو سے مل کر فارم وارم بھر کے اپنی لاش اٹھوالو۔''
''میری لاش؟''
''تو کیا میری؟— جاؤ اٹھوالو۔''
''کسے اٹھواؤں؟ سبھی کے سبھی تو پھول پھول کر ایک جیسے دکھ رہے ہیں۔''
''مگر تم نے بتایا' تم اسے دیکھ آئے ہو۔''
''ہاں' ایک پر مجھے گمان تو ہوا تھا' پر ہوسکتا ہے وہ کوئی اور ہو۔''
''تو کیا ہوا؟ سبھی تمہارے بھائی ہیں۔''
''مگر مجھے صرف اپنے بھائی کو لے جانا ہے۔''
''تمہارا بھائی اب رہ ہی کہاں گیا ہے؟''
''مگر—''
''ڈاکٹر صاحب کی جان کیوں کھا رہے ہو' بھائی؟'' چرنجی نے اپنے افسر کی مدد کے لیے مداخلت کی''۔ کر کے بولتا ہوں صاحب' ہرا یرے غیرے کو اندر مت آنے دیا کریں''۔ پھر وہ امریک سنگھ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھانے لگا۔ ''اپنے بھائی کو تو تم ہی نے پہچاننا ہے ہم نے تو نہیں۔''
ڈاکٹر سروپ اپنے غصے پر قابو پانے کے لیے سگریٹ سلگانے لگا۔ ''کیا زمانہ آ گیا ہے بھائی اپنے بھائی کو بھی نہیں پہچان سکتا۔''
کشن سنگھ منہ لٹکا کر چرنجی کے ساتھ باہر جانے لگا تو ڈاکٹر سروپ کو پھر اس پر ترس آنے لگا۔ ''ٹھہرو' گھبراؤ نہیں' کوشش کرو گے تو پہچان لو گے''۔ سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر اسے خواہش ہونے لگی کہ بے چارے کی مزید مدد کی جائے۔ ''اگر تمہیں کوئی ایسا گواہ نہ ملے جسے ہم جانتے ہوں تو ہمارے اس چپراسی کو ہی اپنا گواہ بنا لو— اور سنو' تمہارے حلف نامہ پر بھی بڑا بابو کسی لوٹری سے دستخط کروا لے گا۔''
''تھینک یو' ڈاکٹر صاحب''

''کوئی بات نہیں''۔ ڈاکٹر سروپ نے مسکراتے ہوئے سوچا کہ بڑا بابو اور چپڑاسی اس سے پچاس روپے تو اینٹھ ہی لیں گے' جن میں سے بیس اپنے لیے کھرے ہو جائیں گے۔ اس نے بدستور مسکراتے ہوئے اپنے سامنے رکھے کورے کاغذ پر آج کی ٹوٹل آمدنی کے ہندسے لکھے ہیں

—400+20—

چپڑاسی اور امریک سنگھ اس کے کمرے سے باہر ہو لیے اور اس نے لاشوں کی بو سونگھنے کے لیے پھر اپنی ناک کو اوپر اٹھا کر ایک بڑی لمبی سانس لی اور بڑبڑایا''۔ بو پہلے سے بڑھ گئی ہے''۔ اس قسم کی بو محسوس کر کے وہ بڑا بے چین ہو جاتا۔ اول تو مردوں کی ڈارمیٹری کا رخ ہی نہ کرتا' یا پھر ادھر جانا بیحد ضروری ہو جاتا تو ہدایت بھیج کر بلڈنگ کے اس ونگ میں خوب دوائیاں چھڑکوا لینا اور اکثر وہاں کیئرٹیکر کے دفتر میں ہی کام نمٹا کر لوٹ آتا۔ پچھلے ہفتے اس کے ڈائرکٹر نے اسے اطلاع دی تھی کہ آئندہ سال سے ہر لاش کے بستر پر ایک فریز رفٹ کرنے کی تجویز منظور ہوگئی ہے۔

''وہ تو ٹھیک ہے سر''۔ اس نے جواب دیا تھا۔ ''مگر اتنے سے پاور میں اب بھی ہماری مشینوں کے تار پھٹ جاتے ہیں اس وقت کیا بنے گا؟''

اس کے افسر نے اسے متنبہ کرنے کے لہجے میں کہا تھا: ''تم ہمیشہ پیچھے کی طرف دیکھتے ہو ینگ مین' آگے کی طرف دیکھا کرو۔''

سالا حرامی! آپ خود تو آگے کی طرف دیکھتا ہے نہ پیچھے کی طرف' بس جہاں بھی دیکھیں' ہم ہی دیکھیں — ڈاکٹر سروپ کو خیال آیا کہ آج ابھی تک مُردوں کی کل تعداد چیک نہیں کی۔ اُس نے سگریٹ بجھا کر متعلقہ رجسٹر اپنے آگے کھول لیا اور کاغذ پر مردے گننے لگا — ''ایک' دو' تین — آٹھ — سولہ — اٹھارہ اور یہ انیس''۔ پھر اس نے کیئرٹیکر کے بھرے ہوئے کالم پر نگاہ دوڑائی تا کہ ایکچیولز بھی دیکھ لے — اٹھارہ — ! ارے ایک کم کیسے ہوگا — ؟ اس نے گھنٹی بجائی اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا اور کوئی نہ آیا تو پھر رجسٹر پر جھک گیا — ایک' دو — انیس! ایک مردہ کہاں غائب ہوگیا — ؟ کہیں واقعی وہ وہی تو نہ تھا۔ اسے کشن سنگھ کا خیال آیا اور وہ بدحواس سی ہنسی ہنس دیا۔ ایک بار پھر اس نے رجسٹر پر نگاہ جمالی — ایک' دو' تین —

''آپ نے گھنٹی بجائی ہے صاحب؟'' چپڑاسی نے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا اور اس کے پیچھے ایک اور آدمی داخل ہوا۔ ''آپ نے یاد کیا ہے؟''

ڈاکٹر سروپ نے نئے آدمی کو گھور کر دیکھا ''تم کون ہو؟''

''میں کیئرٹیکر صاحب کا نیا چپراسی ہوں صاحب' راجو۔''

''ارے ہاں' تم ہی تو ہو۔ میں تمہیں پہچان ہی نہیں پایا''۔ ڈاکٹر نے اس کے منہ کی طرف اشارہ کیا: ''تم نے یہ پھنسیوں کا نقاب جو چڑھا رکھا ہے۔''

''علاج کروا رہا ہوں صاحب۔''

''سوچ سوچ کر کپا بنے ہوئے ہو۔ کیا تمہیں اپنے آپ سے بو نہیں آتی؟''

''کیا کروں صاحب''

''برف' منہ پر برف رکھا کرو''۔ ڈاکٹر نے اچانک اپنے نتھنوں کو پھڑکتا ہوا محسوس کیا ''پھر وہی بو!'' اس نے نتھنوں کے راستے سانس لی۔ ''بڑھ گئی ہے۔''

چرنجی اور راجو نے بھی ویسے ہی سانسیں لیں۔ ''ہاں بو تو آ رہی ہے۔''

''کیئر ٹیکر کہاں ہے؟'' ڈاکٹر کو یاد آیا کہ کیئر ٹیکر نے تو آج اپنے دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس جانے کی اجازت لے رکھی ہے۔ ''کیا تمہارا ائیر کنڈیشنر چل رہا ہے؟''

''میں اتنا بھاگیہ شالی کہاں ہوں صاحب؟'' راجو احمقوں کی طرح کھی کھی کرنے لگا ہے۔ ''یہ نعمت تو مردوں کو ہی نصیب ہے۔''

راجو کی بات ڈاکٹر کے دل کو جا لگی۔ ہاں' اس دنیا کی عجیب ریت ہے۔ یہ نعمت صرف انہیں نصیب ہے جو اس کی زندگی بخش ٹھنڈک میں بھی بے جان پڑے رہتے ہیں — ''ابھی تک کھی کھی کیے جا رہے ہو۔ میری بات کا سیدھا جواب دو — ''

''کر کے بولتا ہوں افسر کے سامنے زیادہ عقل مت بگھارو''۔ چرنجی نے اپنی ٹوپی اتارنا چاہی لیکن ڈاکٹر کی نظر میں ڈانٹ محسوس کر کے اس نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

ڈاکٹر سروپ کو یکبارگی یاد آیا کہ ایک مردے کا حساب نہیں جڑ پا رہا۔ اس نے چرنجی کو حکم دیا کہ وہ بڑے بابو کو بلائے' لیکن پھر اسے جھٹ ہی روک لیا — بڑے بابو کے منہ سے اتنی گندی باس آتی ہے کہ طبیعت متلانے لگتی ہے۔ اس نے راجو سے مردوں کی تعداد کے بارے میں استفسار کیا اور راجو نے اسے فوراً جواب دیا: ''پورے اٹھارہ ہیں صاحب۔''

''کیا تمہیں یقین ہے' اٹھارہ ہیں؟''

''میرا اور کام ہی کیا ہے صاحب؟ دروازے پر بیٹھا انہیں ہی بار بار گنتا رہتا ہوں۔'' اب تو اس کی عادت ہو گئی ہے صاحب' جدھر بھی چند لوگ اکٹھے دکھ جائیں' انہیں گننا شروع کر دیتا ہے۔''

''دیکھو راجو''۔ ڈاکٹر سروپ نے اچانک کچھ فیصلہ کر کے اپنا منہ بڑا پکا کر لیا۔ ''اب میں تم سے صاف صاف پوچھ رہا ہوں' اگر تم لوگوں سے کوئی غلطی ہو گئی ہے تو بتا دو میں تمہیں بچا لوں گا۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا' صاحب۔''

''تمہاری سمجھ میں اتنا تو آ رہا ہے کہ ایک مردہ کالے دھندے میں ہزار پندرہ سو پر اٹھتا ہے۔ اگر تم نے گول مال نہیں کیا تو ایک مردہ کہاں گیا؟ سرکار تو اس کی جگہ مجھے لٹا کر حساب پورا

کرے گی۔ تمہارا کیا جائے گا؟''

''نہیں' صاحب۔''ڈاکٹر کے چہیتے جرنجی نے مداخلت کی''۔ میں راجو کی طرف سے آگ میں ہاتھ ڈال کر کہہ سکتا ہوں' وہ ایسا آدمی نہیں۔''

''تو پھر مردہ کہاں گیا؟ جیسے بھی ہو مجھے اسی قوت اپنا مردہ چاہیے''۔ ڈاکٹر نے ایک بار اور رجسٹر پر اپنی پریشان نگاہ دوڑائی اور ایک خانے میں اس کی آنکھیں لٹک گئیں اور وہ مسرت سے اچھل پڑا۔''مل گیا ـــ یہ دیکھو' بڑے بابو نے یہاں ایک ہی مردے کی تفصیلات غلطی سے دو بار درج کر دی ہیں۔ مردے اٹھارہ ہی ہیں ـــ! جاؤ' بڑے بابو کو بلاؤ''۔ مگر اس کا جی متلانے لگا۔''نہیں رہنے دو ـــ کیا تمہیں بو محسوس نہیں ہو رہی ہے؟'' اسے نامعلوم کیا سوجھی ہے کہ وہ اپنا ہی بدن سونگھنے لگا ہے۔

''نہیں' صاحب' اس وقت تو نہیں آ رہی ہے۔''

لاشوں کے پاس بیٹھ بیٹھ کر تمہاری ناک ٹھیک طرح کام نہیں کرتی۔ میں نے تم سے پوچھا تھا''مردہ خانے کا ایئر کنڈیشنر چل رہا ہے یا بند پڑا ہے۔''

''دس پندرہ منٹ بند رہا صاحب' پھر آپ ہی آپ چلنے لگا۔''

''یہاں سب ہی کچھ آپ ہی آپ چلے تو چلے۔ تم سب لوگ نااہل ہو۔ اگر میں تمہاری حفاظت نہ کروں تو تم سبھوں کو دو دن میں جوتے مار مار کے یہاں سے نکال دیا جائے۔''

''کر کے ہی تو ہم سب آپ کے نام کی مالا جپتے ہیں صاحب۔''

''مگر کچھ کام بھی کیا کرو۔ کیا وہ حرامی پلا پوری برف بھیج رہا ہے؟''

''نہیں' صاحب' پہلے سے آدھی بھی نہیں بھیج رہا۔''

ڈاکٹر اپنی پتلون کی پچھلی جیب کی طرف ہاتھ لے گیا اور دانت پیس کر بولا:''اس سے طے تو یہ ہوا تھا کہ لکھت سے آدھی ضرور بھیجے گا۔ چلو' کم سے کم ایک تہائی ہی بھیج دے مگر بے ایمان سارے وعدے بھول گیا ہے''۔ وہ اپنا بلڈ پریشر بڑھتا ہوا محسوس کر کے سگریٹ سلگانے لگا''۔ گنگو ٹھیکیدار کو کہلوا بھیجو جرنجی' وہ مجھے فوراً ملے۔''

جرنجی بغلیں بجانے لگا:''میں آپ ہی اس کے پاس چلا جاؤں گا صاحب۔''

اسی اثنا میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔

''ہیلو ڈارلنگ''۔ ڈاکٹر کی بیوی کا ٹیلیفون تھا:''کیا؟ فرج میں برف نہیں بن پا رہی؟ بو ـــ؟ـــ کیوں ـــ؟ ہاں مشین ہی بگڑ گئی ہو تو بُو تو آئے گی ہی۔''

❁ ❁ ❁

اقبال متین

شعلہ پوش

کارنیوال میں روشنیاں چاروں طرف یلغار کر رہی تھیں۔ تین روز سے میں نے بچوں سے وعدہ کر رکھا تھا اور پھر انہیں ٹال رہا تھا۔ اے آئی او پر رکارڈنگ کے بعد جیب ذرا بھاری ہوگئی تو کارنیوال کی روشنیاں جو تین روز پہلے میں نے سرِ راہ دیکھ لی تھیں' ساری کی ساری میری آنکھوں میں اتھ آئیں۔ جس سڑک پر میں چل رہا تھا وہاں ابھی ابھی لائٹ آف ہوئی تھی۔ لیکن میری جیب نے فیوز ڈال کر کارنیوال کو سڑکوں پر بکھیر دیا اور میں بچوں کو ساتھ لیے گھوم رہا تھا۔ بیچ بیچ میں یہ خیال ضرور آتا تھا کہ چیک کیش کروانا تھا' بنک کا وقت نہ ہونے کے باوجود مجھے معلوم تھا کہ چیک کچھ گھاٹے سے سہی' کہاں کیش ہوسکتا ہے۔

میں نے جب یہ کام کرلیا تو کارنیوال کی روشنیاں پھر ساتھ ہوگئیں اور ان روشنیوں میں بچے تالیاں بجا کر ناچنے لگے اور میں نے ان کو خوش دیکھ کر اطراف میں پھیلے ہوئے اندھیروں سے منہ موڑ لیا۔

گھر پہنچا تو اپنے فلیٹ کی سیڑھیوں کے پاس ہی ایک شخص پر نظر پڑی جس نے کارنیوال کی روشنیوں کو اپنی مٹھی میں بند کر رکھا تھا۔ اور اس کی آنکھیں ٹارچ کی طرح میری جیب میں پڑی ہوئی نوٹوں پر فوکس تھیں میں نے عمارت کے ایک بڑے سے ستون کی اوٹ میں خود کو چھپا لیا— قمیص کی جیب سے دس روپے کا ایک لخت چھوڑ کر سارے نوٹ بجلی کی سرعت سے پتلون کی جیب میں منتقل کیے اور اس کے مقابل ہو کر اس طرح مسکرایا جیسے اس کے گلے لگ جاؤں یا کھینچ کر اسے گلے لگا لوں گا۔ تنہائیوں میں ڈوبے ڈوبے رہنے والے دل نے میرے ہونٹوں کو کچھ ایسی ٹریننگ دے رکھی تھی کہ ہر جانے پہچانے چہرے کو دیکھ کر وہ جھٹ سے کوئی سنسی خود پر چسپاں کر لیتے اور میرا چہرہ کاغذی پھولوں سے باغ و بہار ہو جاتا۔

کن کانیاں فصلاں پکیاں جا   اہا جی اہا
اہا جی اہا

میں نے گنگناتے ہوئے جھٹ سے دس کا نوٹ سردار جی کے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش

کی — اوئے سداراں — لے بھی دیر کردی ساری پونجی نچھاور کردوں تجھ پر۔

وہ مسکرایا۔ میرے سینے کے اندر جو کھائی تھی اور اس میں جو اتھل پتھل ہو رہی تھی وہ سب اس کی ایک مسکراہٹ سے بالکل شانت ہوگئی۔

میرے سردار جی کی مسکراہٹ کتنی عظیم تھی — وہ میرے ہونٹوں پر چپکی ہوئی مسکراہٹ کو پل بھر میں نوچ کر پھینک بھی سکتی تھی — لیکن سردار اچھے موڈ میں تھا۔

کہنے لگا — کیا خاک فصلاں پکیاں۔ اب کی بار بھی لگتا ہے تو سود پر ٹرخائے گا۔

سیڑھیاں چڑھنے لگا تو میں خوش تھا کاغذی مسکراہٹ ابھی ہونٹوں پر جمی ہوئی تھی۔ قطرہ قطرہ جینے میں لمحہ لمحہ جینے میں کتنی لذت ہے۔ بیکراں سمندر سامنے ہو تو لوگ کس طرح جیتے ہوں گے — مجھے مل جائے تو سراب سے بدل دوں۔ میں نے ایک پل پر فتح پالی تھی۔ سردار کی مٹھی سے ایک لمحہ چھین لیا تھا اور کارنیوال کے اجالے سیڑھیوں پر میرے اطراف پھیل گئے تھے اور ان روشنیوں میں اپنے بچوں کو نہاتا ہوا دیکھ کر میں آنکھیں بھی نہیں جھپکا رہا تھا۔ کیونکہ سردار میرے پپوٹے اپنے ساتھ لے گیا تھا' میری پلکیں اپنے ساتھ لے گیا' صرف کاغذی مسکراہٹ ہونٹوں کے لے چھوڑ دی تھی۔

میں بچوں کو لے کر جب کارنیوال کے احاطے میں پہنچا تو بڑا مطمئن تھا' سب سے پہلے جس چیز پر نظر پڑی وہ ایک بہت ہی نازک تھی چار پہیوں کی بگی تھی جس میں ایک بکری جوتی گئی تھی — اس بکری کو دیکھ کر دنیا بڑی معصوم سی لگتی تھی — بگی کے پاس کھڑے ہر نوجوان' ادھیڑ اور بوڑھے شخص کا بچپن سامنے آکر مجسم ہو جاتا تھا۔ چھوٹے بچے اس بگی کے پیچھے دیوانے ہو رہے تھے۔ گھوڑے اور خچر کی جگہ بکری نے لے لی تھی اور وہ بھی میری طرح مطمئن نظر آتی تھی۔ بگی کو کاغذی پھولوں سے سجایا گیا تھا اور بکری کی پشت پر بھی جھول پڑی تھی۔ بچے بڑے اشتیاق سے اس بگی میں بیٹھ کر سفر کر رہے تھے اور ایک تانتا بندھا ہوا تھا۔ مجھے اپنا بچپن یاد آرہا تھا — میں نے تو سارا بچپن رنگ برنگ خوشبودار پھولوں سے سجی بگی میں سفر کرتے گزارا تھا — اس بگی میں بکری نہیں برق رفتار گھوڑے جوتے جاتے تھے۔ پھولوں سے لدی اس بگی نے ہمیشہ ہواؤں سے باتیں کی تھیں اور اس طرح میرا بچپن اس زمین پر بے آواز بجلیوں کی طرح چمکتا ہوا بیت گیا تھا — بگی کا نوجوان ایک بڑا خاموش طبع اور خشک آدمی تھا۔ لگتا تھا اس پیشے کے لیے بالکل ناموزوں ہے بچوں کو رجھانا دور رہا۔ وہ ان سے مسکرا کر بات کرنا بھی نہیں جانتا تھا — بچے لیکن اس حد تک مگن تھے کہ جلے بھنے گاڑی بان کی انہیں پروا تک نہ تھی — ویسے دیکھنے میں یہ نوجوان ناک نقشے کا سجل تھا اور خوش پوشاک بھی لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر چولہے میں بجھی راکھ کا خیال جانے کیوں مجھے آیا تھا اور اب یہی خیال ذہن میں بس کر رہ گیا تھا۔ گاڑی بان کی طرف نظر کرتا تو لگتا راکھ اس کے چہرے سے اڑ اڑ کر بکھر رہی ہے۔ مجھے بھی بچوں کی طرح یہ نازک سی لگی اور اس میں جتی ہوئی معصوم سی بکری اچھی لگی تھی لیکن ان کا گاڑی بان

ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ بعض اوقات اس کے چہرے کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ اس کا چہرہ میرے دل کی طرح ہے۔ میرے دل میں بھی کہیں راکھ اڑ رہی ہے جو کسی بچے کو نظر نہیں آتی۔

میرے بچوں نے ایک چکر لگانے کے بعد دوسرے چکر کے لیے اصرار کیا تو میں انہیں منا پُھسلا کر آگے بڑھ گیا کہ واپسی میں دوسری ٹرپ ضرور ہوگی۔ بچوں نے اپنی پسند کی تفریحات ختم کر لی تھیں۔ اب اعلان ہونے لگا تھا کہ ٹھیک ساڑھے نو بجے شہاب ثاقب آسمان سے ٹوٹ کر زمین پر گرے گا۔ گنجالے سے کبھی آواز گونجتی کہ اب ایک شعلہ پوش بلندیوں سے زمین کی پنہائیوں میں اترنے والا ہے۔ لوگ جوق در جوق آواز کی سمت بڑھنے لگے۔

بچوں نے چلتے چلتے پیراشوٹ سے اترتی ہوئی گڑیوں کو دیکھا اور رک گئے۔ مہین پلاسٹک کی چھوٹی چھوٹی چھتریوں سے بندھی ہوئی گڑیاں بدوں کے ریکٹس سے فضاؤں میں چھائی جا رہی تھیں۔ پھر ان کی بند چھتریاں کھل رہی تھیں۔ منی تالیاں بجا رہی تھی۔ وہ بھول گئی تھی کہ اس کا آئس فروٹ نیلی سے جدا ہو کر زمین پر پڑا گھل رہا تھا — اس کے ہونٹ اور دہن آئس فروٹ سے سرخ اور ٹھنڈے ہو کر چکٹ ہو گئے تھے — میں نے رومال جیب سے نکال کر اس کا منہ صاف کیا — اس کی نظریں پیراشوٹ سے اترتی ہوئی گڑیوں پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے ناگواری سے میرا ہاتھ ہٹا دیا — پھر کچھ سوچ کر ہاتھ تھام لیا — میں نے سب بچوں کے لیے پیرا شوٹ خرید لیے — جی چاہا بچوں کو ٹریننگ دینے کے بہانے اپنے لیے بھی ایک خرید لوں — لیکن ڈیڑھ روپے نے بڑھ کر میرے پرس کا منہ بند کر دیا۔

شعلہ پوش کو بلندیوں سے زمین کی گہرائیوں میں اترتا ہوا میں نے پہلے بھی دیکھا تھا — لیکن یہ شور و شرابہ، یہ ہنگامہ کبھی نہ سنا تھا۔ مقررہ وقت پر لوگ جمع ہو جاتے تھے اور سب کی آنکھیں جیسے آسمان کی جانب اٹھ جاتی تھیں — لاوڈ اسپیکر پر نہ شہاب ثاقب کی بات ہوتی نہ زمین کی پنہائیوں کا ذکر —

جھکی ہوئی گردنیں اکڑتیں اور لگتا کہ میدان میں جمع سارے کے سارے لوگوں نے ماہ و سال کا بوجھ شانے جھٹک کر اتار پھینکا ہے — ایسے میں نظریں بلندیوں پر شعلہ پوش کی منتظر رہتیں — بے شمار نظریں، بے حساب نظریں جو اسے موت کے منہ میں جاتا ہوا دیکھتیں اور بڑی مطمئن مطمئن سی رہتیں، منٹ دو منٹ کی آواز کے بعد ہی اعلانات اور تشہیر بند ہو چکی تھی دراصل تشہیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والوں میں اطراف کے اسٹالس کے وہ لوگ تھے جو آہنی مینار کے قریب ہی اپنا اسٹال سجائے ہوئے تھے۔ وہ لوگوں کو شعلہ پوش کے نام سے رغبت دلا کر اس رخ پر بلا رہے تھے۔ جس رخ پر وہ خود تھے اور اس طرح شعلہ پوش کی راہ میں پڑے رہنے والوں کا بھلا ہو رہا تھا — اور کارنیوال کے میدان کے چاروں طرف سے لوگ ایک ہی رخ پر جاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ان میں بچوں سے

زیادہ بڑے لوگ تھے — شاید بچوں کو زندگی سے دلچسپی تھی — خواہ وہ دوسری چیزوں میں بھی دلچسپی رکھتے تھے — کبھی کھلونوں کی دکانوں پر ٹھہر جاتے کبھی بڈھی کے گلابی بالوں کے جانب لپکتے۔ کبھی آئس کریم کے اسٹال ان کے پاؤں پکڑ لیتے۔ کبھی بدوں کے ریکٹ سے گولے اوپر پھینک کر پیراشوٹ سے اترتی ہوئی گڑیوں کو وہ شعلہ پوش پکارنے میں ہی مگن رہتے۔ ان کے لیے شاید اس بات میں زیادہ دلچسپی نہ تھی کہ زندگی کو موت سے آنکھیں چار کرتا ہوا دیکھیں اور اپنی تماش بینی سے پریشان بھی ہوں۔

کارنیوال سارے کا سارا قریب و دور سہی لیکن ایک ہی مرکز پر جمع ہو گیا تھا۔

میں نے دیکھا ایک دبلا پتلا چھریرے بدن کا مجہول آدمی آہنی مینار کی اطراف پھر رہا تھا — یوں لگتا تھا جیسے یہ شخص حواس باختہ ہے یا اس نے بہت قیمتی شئے کھودی ہے اور کبھی آہنی مینار کے اطراف کبھی مینار کے سامنے پانی بھرے حوض کے کناروں پر وہ اس قیمتی چیز کو تلاش کر رہا ہے جانے کب سے تلاش کیے جا رہا ہے۔ اطراف پھیلے ہوئے انسانی سروں کے سیاہ سمندر کی اس مجہول شخص کو کوئی پرواہ ہی نہیں تھی۔ وہ تو آہنی مینار کی جڑوں میں کچھ تلاش کر رہا تھا — حوض کے کناروں پر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اس کو نہ شعلہ پوش کا انتظار تھا نہ اس کی آنکھیں مینار کی بلندیوں کی طرف اٹھتی تھیں۔ میرے سوا کچھ ہی لوگ تھے بلکہ شاید کوئی بھی نہ تھا جو اس مجہول شخصیت میں دلچسپی لے رہا تھا۔ سب کے سب شعلہ پوش کے منتظر تھے۔

ٹین کے لال اور ہرے بھونپوں سے نکلی ہوئی آوازیں کانوں سے ٹکرا رہی تھیں — ایک حسینہ جس کا دھڑ مچھلی کا ہے' ایک مچھلی جس کو قدرت نے عورت کا حسین چہرہ لگا دیا ہے صرف چار آنے میں دیدار کیجئے۔

عجیب سی کرخت آواز میں کوئی پکار رہا تھا۔ آپ موٹے اور بے ڈول نہیں ہیں۔ بدصورت اور ٹھینگنے بھی نہیں ہیں — لیکن ہمارے آئینہ خانے میں آپ اپنا چہرہ بھی نہیں پہچان سکیں گے۔ آیئے خود کو تلاش کیجئے صرف چار آنے میں۔ آپ خود کو کھودیں گے۔

اب شعلہ پوش کے انتظار کی بوریت بڑھ رہی تھی۔ بچے تقاضہ کر رہے تھے کہ مچھلی کے دھڑ والی کو دیکھیں — میں انہیں پچکار رہا تھا اور ہم آہنی مینار کے بالکل سامنے پہلی صف میں کھڑے ہیں — ہمارے پیچھے انسانی سروں کا دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے — اب یہاں سے ہٹ جائیں تو پھر پہنچنا ناممکن ہے۔ شعلہ پوش اب آتا ہی ہوگا — مجہول شخص مینار اور حوض کے اطراف کچھوے کی طرح برابر رینگ رہا تھا۔ اس نے مینار کو کس کر زمین سے جوڑنے والے موٹے موٹے تاروں کو چھو کر دیکھا — کسی تار کے پاس رک گیا اور بغور دیکھتا رہا — حوض کے سامنے پڑی ہوئی ریت پر جب وہ چلنے لگا تو اس کا چہرہ روشنی میں واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ یہ مجہول آدمی یقیناً زندہ نہیں تھا — اس پر

موت کی ایسی زردی کھنڈی تھی جو مر جانے کے بعد بہت دیر میں چہرے کا حصہ بنتی ہے۔لیکن وہ اپنے تلوؤں سے ریت کو چھوکر اس کی نرمی کو محسوس کر رہا تھا۔

یکا یک لوگوں میں کچھ کھلبلی سی مچی — لوگ ادھر ادھر کٹ کر جگہ بنا رہے تھے۔شعلہ پوش آ رہا ہے — شعلہ پوش' شعلہ پوش — لیکن مجہول شخص نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا — اس ہل چل سے' اس گہما گہمی سے' اس حرکت اور زندگی سے اس کو جیسے کوئی واسطہ ہی نہیں تھا — وہ تو کبھی حوض میں بھرے پانی کو گھور گھور کر دیکھتا۔کبھی کنوئیں کے اطراف بکھری ہوئی نرم ریت کی ملائمت کو محسوس کرتا — کبھی مینار کو زمین سے کسنے والے تاروں کو اس طرح چھوتا کہ مبادہ اس کے ہاتھ تلوار کی دھار سے زخمی ہو جائیں۔

آدمیوں کی صفوں کو چیر کر بھی شعلہ پوش نہیں آیا — ہل چل تھمی تو تین چار نوجوان احاطے میں داخل ہوئے — احاطے میں کھڑے ہوئے لوگوں کو باہر نکالا۔صفیں درست کیں — بچوں کو ممکنہ طور پر کوشش کر کے آگے کی صفیں دلائیں — لیکن سب بچوں کے لیے یہ ممکن نہ تھا — بعض لوگوں نے چھوٹے بچوں کو کندھوں پر چڑھا لیا — دوسروں نے اعتراض کیا۔یہ سب کچھ ہو رہا تھا لیکن ان چاروں نوجوانوں میں لوگ یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ شعلہ پوش کون ہے — ایک شکیل سے تنومند نوجوان کی طرف لوگوں کی نظریں بار بار اٹھ رہی تھیں جو نوارد چاروں میں سے ایک تھا — ہاں وہ جا رہی تھی اور چاروں تو شعلہ پوش نہیں ہو سکتے — مجہول شخص مبہوت کھڑا تھا — چاروں نوواردوں نے جھک کر مبہوت کھڑے مجہول شخص کی تعظیم کی اور وہ زمین پر اتو کرتا آہنی مینار کی طرف بڑھنے لگا — لوگوں نے اب بھی اس کو نہیں چھوڑا۔یہاں تک کہ وہ مینار کے مقابل ہو گیا — پھر اس نے جھک کر دونوں ہاتھ سینے اور پیشانی سے مسل لیے۔تین بار یہ عمل کرنے کے بعد جب ان سے سیدھے ہو کر پہلی آہنی سلاخ پر قدم رکھا تو لوگوں نے جو سامنے کی صفوں سے اسے دیکھ رہے تھے تالیاں پیٹنی شروع کیں — شعلہ پوش تو یہ رہا — پچھلی صفوں اور اگلی صفوں میں دھکا پیل شروع ہو گئی — کہاں ہے وہ — کون ہے وہ؟

آگے والوں نے پیچھے والوں سے کہا — صبر سے کام لو بھائی وہی شخص تو ہے جو اتنی دیر سے آپ سب کے سامنے کھڑا تھا — اب وہ بلندی پر آ رہا ہے۔

مجہول شخص اوپر چڑھ نہیں رہا تھا۔یوں لگتا تھا جیسے کوئی اس کے جسم کو جبراً اٹھا کر مینار کی بلندی ہوتی ہوئی سلاخوں سے لٹکا تا جا رہا ہے اور بے چوں و چرا ایک سلاخ سے لٹک کر کسی اور سلاخ پر اپنے پیر مضبوطی سے جما رہا ہے — وہ مجہول اور مبہوت شخص تو زمین پر بھی چلنے کی سکت سے عاری تھا — پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اتنی بلندیوں تک پہنچ سکے گا — لیکن یقیناً اس کے جسم کو کوئی اوپر اٹھا رہا تھا — وہ جتنا بلند ہوتا جا رہا تھا' آہنی مینار کا ایک حصہ ہوتا جا رہا تھا۔اس کا جسم سلاخوں سے چمٹا ہوا اس کو اوپر ہی اوپر اس طرح اٹھا رہا تھا جیسے کوئی مضبوط رسی سے باندھ کر اس کو اوپر کھینچ رہا ہو — لیکن

رسی کی مضبوطی کا نہ کھینچنے والے کو یقین ہو نہ کھینچے جانے والے کو۔
لوگ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔
''ہاں مر گیا ہے — اس کا باپ اسی طرح مر گیا ہے''
''باپ نہیں بھائی' استاد — استاد اسی طرح مر گیا ہے''
''استاد ہو کہ باپ ہو — کس طرح مرا بھئی — کس طرح مر گیا''
کسی منچلے نے کہا: '' — صبر کرو — دیکھو بھئی اب یہ کس طرح مرتا ہے''
''دوسرے منچلے نے — اضافہ کیا — ہاں ہاں صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے بھائی''
''اُف' یہ بلندی — اوپر دیکھنے سے بھی چکر آتا محسوس ہوتا ہے۔
''بڑے جان جوکھم کا کام ہے یار''
''پیٹ بڑا بدکار ہے میاں — جان کی سلامتی کے لیے جان ہی سے کھیلتا ہے''
تو کیا مر گیا اس کا استاد؟''

کیسے مر سکتا ہے؟ بھلا یہ بھی کوئی دشوار بات ہے جو سمجھ ہی میں نہ آئے — بھائی' کنویں میں گرنے کے بجائے وہ کنارے پر آ پڑا — اور پرخچے اُڑ گئے اس کے اور یہ پرخچے آگ میں جلتے رہے — کہنے والا اس وثوق اور مسرت سے کہہ رہا تھا جیسے اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

مجہول آدمی آہنی مینار سے چمٹا ہوا۔ مینار کا ایک حصہ بن چکا تھا اور اب اس کو دیکھنے کے لیے لوگ اپنی گردنیں آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے تھے۔ ٹوپیاں ہاتھوں میں آ گئی تھیں جو خال خال تھیں' اب اس مجہول اور دبلے پتلے مریض نما شخص کی صحت بلندی پر اتنے فاصلے تک جا پہنچی تھی کہ پہچانی نہیں جاتی تھی۔ آخر اس نے اپنے جسم کو گھسیٹ کر آہنی مینار کی آخری سرے پر بنی ہوئی ریلنگ سے محصور پلیٹ پر پھینک دیا جہاں اتنی جگہ تھی کہ وہ کھڑا ہو کر ہاتھ پاؤں ہلا سکتا تھا۔ پٹرول اپنی نمدے والی نرم اور دبیز پوشاک پر چھڑک کر آگ لگا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے جسم کو استادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا — لوگوں نے تالیاں پیٹنی شروع کر دیں وہ ریلنگ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا — دبلا پتلا مجہول شخص اور بھی بے جسم و بے جان نڈھال دکھائی دے رہا تھا۔ ایک ہاتھ سے ریلنگ کو تھام کر اس نے دوسرا ہاتھ اوپر اٹھایا اور تالیاں پیٹنے والوں کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اس نے فرکی دبیز پوشاک اپنے جسم سے لپیٹ لی۔ سارا چہرہ ایسی کن ٹوپ سے ڈھانپ لیا جو چشم پوش بھی تھی — پھر اس نے ریلنگ میں لگے ہوئے پٹرول کی شیشی نکال کر اپنے جسم پر پٹرول چھڑک لیا — سر سے لے کر پیر تک ساری پوشاک پٹرول سے تر کی۔ تھوڑا بہت پٹرول زمین پر آتے آتے قطرہ قطرہ بکھر رہا تھا — پانی بھرے حوض یا کنویں میں بھی گر رہا تھا جس کے اطراف ریت تھی اور جس کو آہنی مینار پر چڑھنے سے قبل اس

مجہول مریض نے تلوؤں سے چھو کر محسوس کیا تھا۔

اب وہ محسوسات کی دنیا ہی کی کوئی شے بن گیا تھا — دیا سلائی کھینچ کر اس نے مشعل جلائی — مشعل کے شعلے نے ہوا میں ایک نورانی لکیر سی کھینچی — پھر اس لکیر نے پلک جھپکاتے ہی پٹرول سے بھیگی ہوئی فرغل نما دبیز پوشاک پر چاروں طرف سے نیلی، دہکتی، جھلستی زبانیں پھینک دیں دو شعلے بن کر دہک اٹھیں — اور پھر دیکھتے دیکھتے یہ سارے شعلے ایک دوسرے سے لپٹ کر ایک ہو گئے اور جیسے کسی نے دھکا دے کر اس شعلے کو زمین کی گہرائیوں میں گرا دیا — فضاؤں کو آگ کی لپٹوں سے جھلستا ہوا جب یہ شعلہ پانی سے لبریز کنویں میں گرا تو پانی پر تیرتے ہوئے پٹرول نے بھی آگ پکڑ لی اور سارا کنواں جل اٹھا۔ اس شعلہ پوش کنویں سے کئی شعلے باہر چھلانگ لگا کر ادھر ادھر بکھر گئے۔

لوگ بے چینی سے پیچھے ہٹنے کی کوشش میں ایک دوسرے سے بھی ٹکراتے رہے۔ لیکن چاروں طرف بکھرے ہوئے شعلوں نے فضاؤں ہی میں دم توڑ دیا اور کسی ایک کی بھی بکھرے ہوئے سروں تک رسائی نہ ہوئی۔ آگ کا کنواں دیکھتے ہی دیکھتے پھر سے پانی کا کنواں بن گیا اور کنویں کی مڈیر پر کسی نے اپنا بھاری بھرکم جسم سمیٹ کر جیسے اچھال دیا۔ کنویں کے سامنے بچھی ہوئی ریت پر پانی سے بھیگی ہوئی دبیز پوشاک کئی ہاتھوں نے ایک تن سے جدا کی تالیوں کی آواز ابھی مدھم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ایک دبلا پتلا چھریرا شخص نوچ کر پھینکے ہوئے بھیگے بھیگے دبیز فرغل سے برآمد ہوا — مسکراتا ہوا چہرہ جس پر پھول ہی پھول کھل رہے تھے آگ میں تپ کر، پانی میں بجھ کر جو شخص فرغل سے برآمد ہوا تھا وہ کوئی اور ہی تھا — مجہول شخص شاید موت کو اپنے ساتھ آہنی مینار کی بلندیوں پر لے گیا تھا اور آگ لگا دی تھی اور شعلوں میں لپٹی ہوئی موت کو بڑی صفائی سے دھکا دے کر کنویں میں گرا دیا تھا۔ پھر جانے کب وہ کنویں میں چپکا سا اتر گیا اور اس کی تہوں سے بھیگی ہو فرغل کی پوشاک میں لپیٹ کر کوئی زندگی نکال لایا۔

تالیاں دیر تک بجتی رہیں۔ دور تک سنائی دیتی رہیں لوگ آپس میں کہہ رہے تھے — آہنی میناروں کی بلندی پر پہنچنے والا بیمار مجہول اور مضمحل شخص جانے کہاں مر کھپ گیا ہے۔ فرغل سے برآمد ہونے والا تو کوئی اور ہی تھا۔"

لوگ اب بھی اس کو نہیں پہچان رہے تھے — نہیں پہچاننا چاہتے تھے۔

لوگوں کی باتیں سن سن کر بچے مجھ سے مخاطب ہوئے۔

کیا واقعی وہ مر گیا ہے ابو۔

جی چاہا کہ راز کی بات بتلا ہی دوں کہ نہیں، شاید اب زندہ ہوا ہے۔ پہلے تو یہ شخص مرا ہوا تھا۔

سریندر پرکاش

سرکس

سرکس آنے کی خبر سے قصبے میں ایک چہل پہل سی پیدا ہوگئی تھی ہوسکتا ہے آپ کو لفظ قصبہ پر اعتراض ہو۔ کہ جہاں ریلوے اسٹیشن ہو جس سے ریل گاڑیاں مختلف اطراف جاتی اور آتی ہیں۔ کپڑے بُننے کا کارخانہ ہو' جس میں سینکڑوں مزدور کام کرتے ہیں۔ اسپات بنانے کی بھٹی ہو۔ جس میں دن رات آگ دہکتی ہے اور پھر عدالتیں' پولیس تھانے' کالج' اسکول وغیرہ۔ وغیرہ سب کچھ ہو اُسے بھلا میں نے قصبہ' کیوں کہہ دیا — ؟ بات دراصل یہ ہے کہ ہزاروں برس سے قصبہ میں رہتے' رہتے ذہن بالکل قصباتی ہوگیا ہے۔ اور یہ ساری ترقی جو دھیرے دھیرے ہماری زندگی میں بڑی خاموشی سے شامل ہوگئی ہے۔ اس کا احساس تک نہیں ہوتا۔ کہ ایک طرف دو قدم بڑھتے محسوس ہوتے ہیں تو دوسری طرف رات کو کوئی بھیانک خواب دکھائی دے جاتا ہے کہ نیچے اور نیچے گرے جا رہے ہیں۔ اپنا وزن کھو چکے ہیں۔ زمین میں کششِ ثقل باقی نہیں رہ گئی ہے۔ برف کے گالے سے ہو گئے ہیں گویا — ہاں تو لفظ قصبہ استعمال کرنے پر معذرت چاہتے ہوئے عرض ہے۔ کہ چہل پہل اور گہما گہمی کی فضا سی قائم ہوگئی تھی۔ اور وجہ تھی سرکس کی آمد۔

سرکس میں جانوروں کے کرتبوں کے ساتھ ساتھ انسانوں کے ریاض کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے۔ یہ بات تو آپ کو اور ہم سب کو معلوم ہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کشش کی وجہ وہ عورتیں بھی ہوتی ہیں۔ جو مختصر ترین لباس میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ اور انہیں عورتوں میں سے ایک عورت کا بڑا سا کٹ آؤٹ قصبے' معاف کیجئے گا......شہر کے چوراہے میں بنی ایک بلند عمارت پر لگا دیا گیا تھا۔ یہ واقعہ سرکس کی آمد سے پہلے کا ہے۔ جب گلی محلے کی دیواروں پر پوسٹر چسپاں کیے جا رہے تھے۔ جن میں سرکس کا نام درج تھا اور نام کے ساتھ لفظ گریٹ لگایا گیا تھا۔ سرکس کی خصوصیات اور ان جانوروں کا ذکر تھا جو شاید پہلے اس طرح نہیں دکھائے گئے تھے۔ ایک توپ تھی جس کی نال میں سے بارود کی بجائے ایک خوبصورت جسم والی عورت نکل کر فضا میں اڑتی چلی جاتی تھی۔

مسئلہ یہ بھی زیر غور تھا کہ اس توپ میں گولہ ڈالنے والی جگہ سے عورت داخل کی گئی ہوگی یا کوئی مصالحہ اس قسم کا ڈالا گیا ہوگا جو عورت کی صورت میں برآمد ہوتا ہے اور مسئلہ وہ بڑا سا کٹ آؤٹ

بھی تھا۔ جس کا ذکر خاکسار نے اوپر کیا ہے ـــ یعنی وہ عورت!

پلائی وڈ کا دیو قامت کٹ آوٹ تھا۔ عورت کا جسم بڑا ہی گداز اور سڈول تھا۔ لباس انتہائی مختصر تھا۔ جتنا بھی لباس پینٹر صاحب نے بنایا تھا اس پر چمکی لگا کر جگمگا دیا تھا کہ دھوپ میں آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ عورت کے ہاتھ میں ایک لمبا سا ہنٹر تھا اور قریب ہی ایک ببر شیر دُبکا بیٹھا تھا۔

اب ایسا کون ہو گا' جس کے سینے میں دل بھی دھڑکتا ہو۔ اسے چوراہے سے گزرنے کا اتفاق بھی ہو اور وہ اک ذرا اس عورت پر نظر نہ ڈال بے۔ مقصد یہ کہ بہت ہی خوبصورت عورت بنائی تھی پینٹر صاحب نے ـــ اور شیر ببر کے بارے میں ایک صاحب کا ریمارک قابل غور و ستائش ہے۔

''کتا بنا کے بٹھا رکھا ہے سالے کو۔''

اب ایک راز کی بات بھی سن لیجئے ـــ کہ یہی عورت سرکس کی مالک تھی۔ چوراہے والے بنواری پنواڑی کی دکان پر شام جو محفل جمتی تھی اس میں اس بات کا چرچا تھا کہ پہلے اس گریٹ سرکس کا مالک اس عورت کا باپ تھا۔ اس نے یہ سب جانور اور کلاباز ایک ایک کر کے اکٹھا کیے تھے۔ کہتے ہیں' خود بھی اچھا کلاباز تھا۔ وہ اس سرکس کو لے کر ملکوں' ملکوں گھوما تھا اور جہاں جو بھی جانور اور کلاباز نظر آیا اسے اپنے ساتھ شامل ہونے کی ترغیب دی۔ کچھ عرصہ ہوا ایک جانور کو سدھانے کے دوران حادثہ میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ اور سرکس کا سمبل ـــ یعنی کہ یہ لمبا شاندار ہنٹر اس کی بیٹی نے سنبھال لیا۔ ویسے ہی جیسے کہ کسی وزارت کا بوجھ اٹھانے کو قلمدان سنبھالنا کہتے ہیں۔

بنواری پنواڑی کی دکان دنیا بھر کے مسائل' سیاست اور نیک و بد پر گفتگو کرنے کا ایک سپاٹ ہے ـــ جی ـــ؟ سپاٹ! جی ہاں میں نے یہ لفظ دھبہ کے معنی میں نہیں بلکہ مرکز کے معنی میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ مرکز مجھے کچھ مناسب نہیں لگا۔ کیونکہ سپاٹ میں جو وسعت ہے وہ مرکز کے حدود میں بند ہونے کو تیار نہیں ـــ خیر صاحب ہمیں تو سرکس اور سرکس کو اس شاندار مالکن اور ریاض کے زیور سے آراستہ اس کے کلابازوں اور جانوروں کے بارے میں گفتگو کرنا تھی۔ یہ بیچ میں مقامی کالج کے فلاں خاں صاحب کہاں سے آ گئے جو لفظ' لفظوں اور الفاظ الفاظوں سے سر کھپایا کرتے ہیں۔ بھئی آ بھی سکتے ہیں کہ اس قصبہ میں کالج بھی موجود ہیں ـــ ویسے ان کا سارا وقت......

خیر صاحب میں قبول کرتا ہوں کہ بہک گیا تھا اور معذرت چاہتا ہوں۔ ذکر ہو رہا تھا ہنٹر والی تھی جس کا چرچا زبان زد خاص و عام تھا ـــ کہ اب گویا چند دن تفریح رہے گی۔ اور بنواری پنواڑی کی دکان کے سامنے گفتگو کا سپاٹ تھا اور سب سے اہم بات جو ان دنوں چل رہی تھی وہ یہ کہ آدمی تو خیر ذہن رکھتا ہے۔ اشارے پر کرتب دکھا سکتا ہے سکھانے سے سیکھ سکتا ہے کہ سن سکتا ہے۔ دیکھ سکتا کہ سن سکتا ہے۔ دیکھ سکتا ہے اور اس کے ردِعمل کا پتہ بھی چل سکتا ہے۔ لیکن ان جانوروں کے سدھانا سکھانا اور ان سے کمالات کروا لینا کیسے ممکن ہے؟ اس کے پیچھے کون سا فن اور راز چھپا ہوا ہے؟ مثال کے طور پر

ملاحظہ ہو سامنے اس اونچی عمارت پر لگے بینر کے کٹ آؤٹ میں بھیگی بلی بنا ببر شیر ——!

جہاں بنارسی اور دیسی پان کے پتوں پر ایک سو بیس' 120 ' تین سو 300 ' کشمیر قوام اور بابا چھاپ کے ساتھ' ساتھ کچا اور سنکا ہوا چھالیا چلتا رہتا وہاں یہ بات چیت بھی چلتی رہتی کہ کمال ہے بھائی —— آدمی جو کچھ نہ کرے کم ہے —— اور سائنس نے جس قدر بھی ترقی کی ہے وہ سب آدمی کی حاصل کردہ ہے اور جانور کو جنگل پکڑ کر سدھا کر' پنڈال میں ہزاروں لوگوں کے سامنے کرتب کرنے پر مجبور کرنا بھی آدمی ہی کا کارنامہ ہے۔

لیکن نہ جانے کیوں میری تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔ معاف کیجئے گا۔ اب جو بیانیہ میں' میں وارد ہوا ہوں تو آپ چاہیں گے کہ معلوم تو ہو کہ بھلا میں ہوں کون؟ سب معمے حل ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ معمہ حل نہیں ہو سکتا —— کیونکہ اپنا تعارف کروانے والے کو پہلے خود تو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کون ہے۔ اور ہمارے پاس اپنے بارے میں جو معلومات موجود ہوتی ہیں اور جن کی بنا پر ہم فوراً ہی ہاتھ آگے بڑھا کر کہہ دیتے ہیں کہ خاکسار کو فلاں' فلاں اور فلاں کہتے ہیں۔ تو ہم یہ سب لوگوں کے کہے سنے کی بنا پر کہہ دیتے ہیں؟ لہٰذا —— چونکہ میں اپنے بارے میں بذات خود کچھ نہیں جانتا اس لیے آپ یہی سمجھیں گے کہ غیب سے ایک آواز آرہی ہے جو الفاظ میں ڈھل جاتی ہے اور اس کے پیچھے جو نظر نہ آنے والی شخصیت ہے نا وہ کچھ بھی نہیں' ایک وہم محض ہے۔ اور خود تشکیک کی بیماری میں مبتلا ہے —— اور آپ کو ایک بیمار آدمی سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے کہ آپ ایک صحت مند' توانا سماج کی تشکیل میں مصروف ہیں —— اور بینر والے کٹ آؤٹ میں بنی دلکش اور شاندار عورت کے ہاتھ میں لمبا ہنٹر ہے اور اس کے سامنے ایک ببر شیر دبکا بیٹھا ہے۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ اتنا طاقتور' نڈر اور خوفناک جانور آدمی کے اشاروں پر کرتب دکھانے کے لیے کیونکر رضامند ہو جاتا ہے؟

ایک صاحب نے خیال آرائی کی —— "یہ صدیوں سے ہوتا آیا ہے —— تفریح کے لیے آدمی کو آدمی سے لڑوانا' آدمی کو جنگلی درندے سے لڑوانا یا پھر ایک درندے کو دوسرے درندے سے لڑوانا۔"

دوسرے نے کہا: "بھئی وہ تو ٹھیک ہے کہ یہ سب آدمی اپنی تفریح کے لیے کرتا ہے۔ لیکن آدمی اور درندہ اس کے لیے تیار کیونکر ہو جاتا ہے —— ؟"

لوگوں نے بنواری پنواڑی سے پان لیکر منہ میں رکھے۔ اور اصل سوال کا صحیح جواب دیئے یا پائے بنا ہی اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔

ایک روز سرکس اپنے پورے تام جھام کے ساتھ قصبے میں آپہنچا —— قصبے کی خستہ پرانی فصیل کے باہر جو بڑا سا میدان تھا۔ اس میں کشادہ پنڈال لگ گیا اور —— ایک طرف کئی چھوٹے چھوٹے خیمے ایستادہ کردیئے گئے جن میں جانوروں کی دیکھ بھال کرنے والے رہنے لگے —— اور دوسری طرف پنجروں کی قطاریں کھڑی کردی گئیں جن میں جانور اور درندے بے چینی سے ٹہلتے نظر

آتے — یہ بے چینی کیوں تھی۔ شاید وہ اپنے پنجروں سے باہر نکل کر اپنے کرتب دکھانے کے لیے بے چین ہورہے تھے۔ یا پھر......؟ نہیں بھلا اور کیا بات ہوسکتی ہے! — کلاکاروں اور کلابازوں' آرٹسٹوں اور انتظامیہ کے لوگوں کے لیے قصبے کی سرکاری سرائے اور پنچایتی دھرم شالہ بک کروالی گئی تھی۔ گلی کوچوں اور بازاروں میں سے پوسٹر اٹھائے ہوئے سرکس کے ملازمین گزرتے اور منادی والا تماشے کے اوقات کا اعلان کرتا۔ اس جلوس کے ساتھ سرکس کے کئی جانور بھی ہوتے اور ایک جوکر بھی جانور جوکر کے اشارے پر لوگوں کو سلام کرتے گویا اپنے کمالات دیکھنے کے لیے آنے کی درخواست کررہے ہوں — سرکس کی مالکن کی طرف سے سرکس میں کام کرنے والی عورتوں کو شہر میں نکلنے کی ممانعت تھی لیکن مرد کلاکار اپنے روزمرہ استعمال میں آنے والی چیزوں کی خریدوفروخت کے لیے بازاروں میں نظر آنے لگے۔ شہر کے بچے خاص طور پر انہیں یوں دیکھتے تھے جیسے وہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہوں۔ ایک بھیڑ ان کے گرد جمع ہوجاتی اور پھر وہ جدھر جاتے وہ بھیڑ ان کے پیچھے کھنچی چلی جاتی — کتنی عجیب بات تھی کہ ایک معمولی سا فرق فن یا اختیار ایک آدمی کو دوسرے آدمی سے ممیز یا افضل بنا دیتا ہے۔ اس روز پہلا تماشہ تھا — اس کی رسم افتتاح معمول کے مطابق شہر کے سب سے اعلیٰ افسر کے ہاتھوں ہوئی — خاکسار بھی وہ کھیل دیکھنے گیا۔

میں تمام آئٹمز کی تفصیل بیان کرکے آپ کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا کہ اس شو میں وہ سب کچھ ہوا جو ہر سرکس کے شو میں ہوتا ہے۔ آپ اپنے تصور کی آنکھ سے نیم برہنہ عورتوں کو جھولا جھولتے — اور تنی ہوئی تار پر سائیکل چلاتے دیکھ سکتے ہیں۔ مرد کلاکاروں کو ہر کھیل میں ان کا ساتھ دیتے بھی دیکھ سکتے ہیں — توازن کے مختلف کمالات تصور کرنا بھی مشکل نہیں۔ جانوروں کا مالکن کے چابک کی شڑاپ کی آواز پر حکم کی تعمیل کرنا بھی سوچ سکتے ہیں وغیرہ۔ وغیرہ۔ لیکن اس خاکسار کو جو آئٹم بہت ہی آدبھت لگی — وہ تھی تمام جانوروں اور انسانوں کلابازوں کا ایک بڑی سی میز کے گرد بیٹھ کر اکٹھے کھانا کھانے کا منظر۔ اب ذرا آپ اپنے تصور کی آنکھ چند لمحہ کے لیے اس منظر پر مرکوز رکھیں تو پھر میں آپ کو وہ بات بتانے جارہا ہوں جس نے سب کو حیران و پریشان کررکھا تھا۔ یعنی یہ سب کیسے ہوتا ہے؟ اور اب اُس حیران کرنے والی بات کا جواب اس خاکسار کو مل چکا تھا۔

لیکن اس سے پیشتر کہ خاکسار وہ بات آپ کے گوش گزار کرے چند باتیں آپ ذہن نشین کرلیں کہ سرکس کی مالکن اصل میں پینٹر صاحب کے بنائے ہوئے کٹ آوٹ سے زیادہ پرکشش شاندار اور خوبصورت نہ تھی۔ اور کہ اس کے دو بیٹے تھے دونوں اعلیٰ درجہ کے کلاباز تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ایک بیٹا کرتب دکھانے کے دوران ایک حادثہ کا شکار ہوگیا تھا۔ گویا اس کا حشر بھی کچھ مالکن کے باپ جیسا ہی ہوا تھا — دوسرا بیٹا جوکر تھا اور ہر کرتب کرنے کی کوشش کرتا تھا لیکن اس طرح کی تماشائی ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوجائیں۔ ایک اپاہج کلاباز تھا جو جمناسٹک میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ شکل و

صورت سے اچھا تھا— ٹانگیں فالج زدہ تھیں لیکن بازوؤں میں بلا کی قوت تھی۔ وہ لکڑی کے گھوڑے پر دونوں بازوؤں اور کبھی ایک بازو سے اپنے جسم کو مختلف زاویوں پر لے جانے' جھولنے اور قلابازیاں کھانے کے شاندار کھیل دکھاتا تھا۔ (مقامی کالج کے فلاں صاحب سے معذرت چاہتا ہوں کہ اس سے بیشتر کلا باز کہنے والے ک سے لکھا ہے اور اس بار قینچی والے ق سے قلابازی لکھا ہے)— یا پھر پنڈال کی چھت سے لٹکتے ہوئے دو رنگز کو پکڑ کر اپنے جسم کو عجیب وغریب توازنی زاویوں پر لے جاتا تھا۔

اب یہ اتفاق ہی سمجھے کہ وہ دوسرے آرٹسٹوں کے ساتھ اسی سرائے میں قیام پذیر تھا۔ جس میں خاکسار کئی صدیوں سے رہ رہا تھا۔ صبح سویرے غسل خانہ استعمال کرنے کے سلسلے میں خاکسار کی اس سے 'تو' 'میں' میں ہوگئی۔ اور پھر یہ 'تو' تو۔ میں میں تو ہی تو اور میں ہی میں کے عمل سے گزرتی ہوئی دوستی میں بدل گئی۔ وہ اچھا انسان اور اچھا رہبر ثابت ہوا۔

ہمارا کھانا پینا ایک ساتھ ہوگیا— اس نے اپنے ماضی کو کرید کر اپنے بارے میں مجھے سب کچھ بتایا جو اسے اس کے بارے میں دوسروں نے بتایا تھا۔ کہ اس کا باپ پہلوان تھا۔ ایک شرط ہارنے کی وجہ سے خودکشی کر کے مر گیا۔ ماں نے اسے ہسپتال میں جنم دیا اور راہی ملک عدم ہوئی۔ نرسوں اور ڈاکٹروں کی لاپرواہی کی وجہ سے اس کی ٹانگیں فالج سے ناکارہ ہوگئیں اور اس نے اپنی زندگی خود شروع کی جمناسٹک سیکھ کر اس سرکس میں شامل ہوگیا— مگر میرے پاس بتانے کو تھا ہی کیا جو بتاتا لہٰذا اپنی خاکساری کا اظہار کر کے شرم سے سر جھکا لیا۔

اسی کی وجہ سے میں نے دن کے وقت سرکس کے تمام پنجروں کا طواف کیا مختلف آرٹسٹوں سے متعارف ہوا اور چند حسین عورتوں سے گفتگو کا لطف بھی لیا اور ایک بار سرکس کی شاندار اور پرکشش مالکن اور اس کے جوکر بیٹے سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔

اور پھر موقع پا کر میں نے پوچھ ہی لیا— کہ یہ معجزہ کیا ہے کہ آدمی اور جانور اور درندے اشاروں پر قلابازیاں کھانا قبول کر لیتے ہیں؟ میرا یہ پوچھنا تھا کہ اس کی عجیب کیفیت ہوگئی۔ جیسے اس کے اوپر کے دھڑ کو بھی فالج مار گیا ہو۔ اس کا رنگ فق ہوگیا۔ آنکھیں بے چینی سے تڑپنے لگیں اور چہرے پر ایک عجیب سا کرب چھا گیا— وہ دیر تک خاموش رہا اور میری طرف آنکھیں جھپکے بنا دیکھتا رہا— میں بھی قدرے پریشان و نادم سا ہوا۔ کہ ایسی بات کیا پوچھ لی کہ جو مناسب نہ تھی؟

''کیا بات ہے آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا سینڈو صاحب؟'' (اسے سینڈو صاحب کے نام سے پکارا جاتا تھا) میں نے ہمت کر کے اپنی خفت مٹانے کے لیے کہا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور کہنے لگا— ''لیکن یہ بات پوچھنے کی آپ کو ضرورت کیوں آن پڑی مسٹر خاکسار— ؟''

''دراصل بات یہ ہے کہ صرف میرا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ اس سارے قصبے کے ذی ہوش لوگوں کا مسئلہ ہے۔ سبھی اس بات کا جواب چاہتے ہیں''۔ میں نے جواب دیا۔

''دیکھئے'' اس نے کہا اور پھر رک گیا۔ میں اس کے دوبارہ گویا ہونے کا منتظر رہا۔ کافی دیر کے بعد اس نے کہا— 'یہ بات اتنی دیر تک سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک سرکس کے پورے سیٹ آپ کو نہ سمجھیں— درمیان میں ایک بہت بڑا رنگ ہوتا ہے۔ جس کے گرد کرسیوں اور بنچوں پر تماشائی بیٹھے رہتے ہیں۔ جن کی نظریں کرتب دکھانے والوں پر جمی رہتی ہیں۔ ایک کونے میں ایک کیبن بنایا جاتا ہے جس میں آکسٹرا ہوتا ہے۔ عام طور پر اس میں فوج سے ریٹائر ہونے والے سازندے کام کرتے ہیں۔ ہر کھیل کے ساتھ الگ دھن بجتی ہے۔ ہر کرتب کرنے والے کے ساتھ تین چار جوکر بھی ایرینا میں داخل ہوتے ہیں جو عام طور پر مالکن کے خاص آدمی ہوتے ہیں۔ زرق برق لباس دیکھ کر اور چہروں پر موٹے میک اپ کی تہ سے آرٹسٹ کے اصل حسن کا اندازہ لگانا بالکل مشکل ہے۔ اور پھر مالکن کے ہنٹر کی شڑاپ کی آواز ...... جو ہر کھیل میں موجود رہتی ہے اور ہر آرٹسٹ کو ملنے والی داد خود سر جھکا' جھکا کر مسکراتے ہوئے قبول کرتی ہے— اچھا اب اس منظر پر آتے ہیں— جس میں ایک بڑی میز کے گرد— شیر' بکری' آدمی' بندر' کتا' گھوڑا اور ہاتھی اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں اور یہیں آپ کی بات کا جواب پوشیدہ ہے۔ جو بڑی معمولی سی بات ہے۔ ہر اس بڑی بات کی طرح جو معلوم ہو جانے کے بعد معمولی نظر آنے لگتی ہے اور وہ بات یہ ہے۔ جسے ہر مالک جانتا ہے کہ اگر آدمیوں عورتوں' جانوروں اور درندوں سے کام لینا ہے تو انہیں آدھے پیٹ کھانا دینا چاہیے اور باقی آدھے پیٹ کھانے کا وعدہ......''

سرکس ہمارے شہر معاف کیجئے گا ہمارے قصبے سے اگلے قصبے میں جا چکی ہے۔ سینڈو صاحب بھی جا چکے ہیں۔ لوگوں کے ذہنوں سے اس گہما گہمی اور چہل پہل کے نشانات مٹ چکے ہیں۔ چوراہے کی بلند عمارت پر لگا ہوا سرکس کی ہنٹر والی مالکن کا کٹ آوٹ اتارا جا چکا ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں جب کبھی میں بنواری پنواڑی کی دکان سے ایک سو بیس کا بنارسی پان کھا کر سرائے کی طرف جا رہا ہوتا ہوں۔ تو میرے ذہن میں شڑاپ شڑاپ کی آواز گونجنے لگتی ہے— اور میں خوفزدہ سا ہو جاتا ہوں۔ پس ازاں— کئی دن بعد' آج میں پھر بنواری پنواڑی کی دکان پر کھڑا پان لے رہا ہوں اور سامنے والی: بڑی عمارت کی اس خالی دیوار کو دیکھتا ہوں جس پر کبھی سرکس کی مالکن کا کٹ آوٹ آویزاں تھا۔

اس کے ہنٹر کی شڑاپ شڑاپ کی آواز میرے ذہن کے کسی کونے میں سے ابھرتی ہے۔ لیکن آج مجھے اس آواز سے پہلے جیسا خوف محسوس نہیں ہوا۔ ایکا ایکی میرے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا ہے۔ کہ میری طرح اگر سرکس کے تمام انسانوں اور جانوروں کے ذہن سے بھی ہنٹر کی آواز کا خوف جاتا رہا تو پھر کیا ہو گیا؟

❀ ❀ ❀

بلراج مینرا

وہ

جب اس کی آنکھ کھلی وہ وقت سے بے خبر تھا۔
اس نے دایاں ہاتھ بڑھا کر بیڈ ٹیبل سے سگریٹ اٹھایا اور سگریٹ نکال کر لبوں میں تھام لیا۔
سگریٹ کا پیکٹ پھینک کر اس نے پھر ہاتھ بڑھایا اور ماچس تلاش کی۔
ماچس خالی تھی۔
اس نے خالی ماچس کمرے میں اچھال دی۔
خالی ماچس چھت سے ٹکرائی اور فرش پر آن پڑی۔
اس نے ٹیبل لیمپ روشن کیا۔
بیڈ ٹیبل پر چار پانچ ماچس الٹی پڑی ہوئی تھیں۔
اس نے باری باری سب کو دیکھا۔
سب خالی تھیں۔
اس نے لحاف اتار پھینکا اور کمرے کی بتی روشن کی۔
دو بج رہے تھے۔
فرش برف ہو رہا تھا۔
ابھی دو بجے ہیں، میں وقت سے بے خبر تھا، میں سمجھ رہا تھا صبح ہونے کو ہے۔
آج یہ بے وقت نیند کیسے کھل گئی؟
ایک بار آنکھ کھل جائے تو پھر آنکھ نہیں لگتی۔
اس نے کمرہ چھان مارا۔
کتابوں کی الماری، ویسٹ پیپر باسکٹ، پتلون کی جیبیں، جیکٹ کی جیبیں —— ماچس کہیں نہ ملی۔
کمرے کی بری حالت ہو گئی تھی۔
کتابیں الٹی سیدھی پڑی ہوئی تھیں، کپڑے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے، ٹرنک کھلا ہوا تھا۔
کوئی آ جائے اس سمے؟

رات کے دو بجے — کمرے کی یہ حالت؟
سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔
سلگتے سگریٹ اور دھڑکتے دل میں کتنی مماثلت ہے۔
ماچس کہاں ملے گی؟
ماچس نہ ملی تو کہیں......
تو کہیں......
کہیں میرا دھڑکتا دل خاموش نہ ہو جائے؟
آج بے وقت نیند کیسے کھل گئی؟
میں وقت سے بے خبر تھا — ایک بار آنکھ کھل جائے، پھر آنکھ نہیں لگتی۔
ماچس کہاں ملے گی؟
اس نے چادر کندھوں پر ڈال لی اور کمرے سے باہر آ گیا۔
دسمبر کی سرد رات تھی، سیاہی حکومت اور خاموشی کا پہرہ۔

کسی ایک طرف قدم اٹھانے سے پہلے چند لمحے سڑک کے وسط میں کھڑا رہا۔ جب اس نے قدم اٹھائے وہ راستے سے بے خبر تھا۔

رات کالی تھی، رات خاموش تھی اور دور دور تا حد نظر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ لیمپ پوسٹوں کی مدہم روشنی رات کی سیاہی اور خاموشی کو گہرا کر رہی تھی اور چوراہے پر اس کے قدم رک گئے۔

یہاں تیز روشنی تھی اور دودھیا ٹیوبیں چمک رہی تھیں لیکن خاموشی جوں کی توں تھی کہ ساری دکانیں بند تھیں۔

اس نے حلوائی کی دکان کی جانب قدم بڑھائے۔
ممکن ہے بھٹی میں کوئی کوئلہ مل جائے، دہکتا کوئلہ، دم بہ لب کوئلہ!
حلوائی کی دکان کے چبوترے پر کوئی لحاف میں گٹھڑی بنا سو رہا تھا۔
وہ بھٹی میں جھانکا ہی تھا کہ چبوترے پر بنی گٹھڑی کھل گئی۔
کون ہے؟ کیا کر رہے ہو؟
میں بھٹی میں سلگتا ہوا کوئلہ ڈھونڈ رہا ہوں۔
پاگل ہو گیا؟ بھٹی ٹھنڈی پڑی ہے۔
تو پھر؟
پھر کیا؟ گھر جاؤ۔

ماچس ہے آپ کے پاس؟

ماچس؟

ہاں! مجھے سگریٹ سلگانا ہے۔

تم پاگل ہو! جاؤ میری نیند خراب مت کرو' جاؤ!

تو ماچس نہیں ہے آپ کے پاس؟

ماچس سیٹھ کے پاس ہوتی ہے وہ آئے گا اور بھٹی گرم ہوگی' جاؤ تم۔

وہ پھر سڑک پر آ گیا۔

سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔

اس نے قدم بڑھائے۔

چوراہا پیچھے رہ گیا' تیز روشنی پیچھے رہ گئی۔ کیا کیا کچھ نہ پیچھے رہ گیا۔

اس کے قدم تیزی سے بڑھ رہے تھے۔

لیمپ پوسٹ' لیمپ پوسٹ' لیمپ پوسٹ' ان گنت لیمپ پوسٹ پیچھے رہ گئے — دھیمی روشنیوں والے لیمپ پوسٹ جو رات کی سیاہی اور خاموشی کو گہرا کرتے ہیں۔

یکایک اس کے قدم رک گئے۔

سامنے سے کوئی آ رہا تھا۔

وہ اس کے قریب پہنچ کر رک گیا۔

ماچس ہے آپ کے پاس؟

ماچس؟

مجھے سگریٹ سلگانا ہے۔

نہیں میرے پاس ماچس نہیں ہے' میں اس علت سے بچا ہوا ہوں۔

میں سمجھا۔

کیا سمجھے۔

شاید آپ کے پاس ماچس ہو؟

میرے پاس ماچس نہیں ہے' میں اس علت سے بچا ہوا ہوں اور اپنے گھر جا رہا ہوں — تم بھی اپنے گھر جاؤ۔

اس نے قدم بڑھائے۔

سگریٹ اس کے لبوں میں کانپ رہا تھا۔

وہ دھیمے دھیمے قدم بڑھا رہا تھا کہ تھک گیا۔

وقت سے بے خبر' اس کے تھکے تھکے قدم اٹھ رہے تھے۔
لیمپ پوسٹ آتا' مدہم روشنی پھیلی ہوئی دکھائی دیتی اور پھر سیاہی۔
پھر لیمپ پوسٹ' مدہم روشنی اور پھر سیاہی۔
وہ لبوں میں سگریٹ تھامے' دھیمے دھیمے قدم اٹھا رہا تھا۔
اس میں دور' اندر تک پھیپھڑوں تک دھواں کھینچنے کی طلب شدید ہوگئی تھی۔
اس کا بدن ٹوٹ رہا تھا۔
شب خواب کا لباس اور چادر میں اسے سردی لگ رہی تھی۔
وہ کانپ رہا تھا اور کانپتے قدموں سے دھیمے دھیمے بڑھ رہا تھا' وقت بے خبر' لیمپ پوسٹوں سے بے خبر۔
ایک بار پھر اس کے قدم رک گئے۔
اس کی نظروں کے سامنے خطرے کا نشان تھا۔
سامنے پُل تھا' مرمت طلب پُل۔
حادثوں کی روک تھام کے لیے سرخ کپڑے سے لپٹی ہوئی لالٹین سڑک کے بیچوں بیچ ایک تختے کے ساتھ لٹک رہی تھی۔
اس نے لالٹین کی بتی سے سگریٹ سلگانے کے لیے قدم بڑھائے ہی تھے کہ کون ہے؟
وہ خاموش رہا۔
سیاہی کی ایک انجانی تہہ کھول کر سپاہی کی طرف لپکا۔
کیا کر رہے تھے۔
کچھ نہیں۔
میں کہتا ہوں کیا کر رہے تھے؟
آپ کے پاس ماچس ہے؟
میں پوچھتا ہوں کیا کر رہے تھے اور تم کہتے ہو' ماچس ہے......کون ہو تم؟
مجھے سگریٹ سلگانا ہے آپ کے پاس ماچس ہو تو......
تم یہاں کچھ کر رہے تھے؟
میں لالٹین کی بتی سے سگریٹ سلگانا چاہتا تھا......آپ کے پاس ماچس ہو تو......
تم کون ہو؟ کہاں رہتے ہو؟
میں......
کہاں رہتے ہو؟

ماڈل ٹاؤن۔

اور تمہیں ماچس چاہیے...... ماڈل ٹاؤن میں رہتے ہو...... ماڈل ٹاؤن کہاں ہے؟

اس نے گھوم کر اشارہ کیا۔

دُور دُور، تا حدِ نظر، سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔

چلو میرے ساتھ تھانے تک ...... ماڈل ٹاؤن......؟ ماڈل ٹاؤن یہاں سے دس میل کے فاصلے پر ہے...... ماچس چاہیے نا! تھانے میں مل جائے گی۔

سپاہی نے اس کا بازو تھام لیا۔

وہ سپاہی کے ساتھ چل پڑا۔

تھانہ اسی سڑک پر تھا جو ختم ہونے کو نہ آتی تھی۔

وہ سپاہی کے ساتھ تھانے کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔

کمرے میں کئی آدمی بڑی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔

سگریٹ پی رہے تھے۔

میز پر سگریٹ کے کئی پیکٹ اور کئی ماچسیں پڑی ہوئی تھیں۔

صاحب! یہ شخص پل کے پاس کھڑا تھا۔ کہتا ہے ماڈل ٹاؤن میں رہتا ہوں اور ماچس کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔

کیوں بے؟

اگر آپ اجازت دیں تو آپ کی ماچس استعمال کرلوں ...... مجھے اپنا سگریٹ سلگانا ہے۔

کہاں رہتے ہو؟

ماڈل ٹاؤن! کیا آپ کی ماچس لے سکتا ہوں؟

کون ہو تم؟

میں اجنبی ہوں! کیا میں ماچس......

ماڈل ٹاؤن میں کب سے رہتے ہو؟

تین ماہ سے! ماچس......

ماچس ...... ماچس کا بچہ...... اجنبی ...... جاؤ اپنے گھر...... ورنہ بند کر دوں گا...... ماچس......

جب وہ تھانے سے باہر آیا وہ بری طرح تھک چکا تھا۔

اس نے اس نہ ختم ہونے والی سڑک پر دھیمے دھیمے چلنا شروع کر دیا۔

اس کی ناک سُوں سُوں کرنے لگی تھی اور اس کا بدن ٹوٹنے لگا تھا۔

سگریٹ پینا ایک علت ہے۔

میں نے یہ علت کیوں پال رکھی ہے۔

ماچس کہاں ملے گی؟

نہ ملی تو!

وہ وقت سے بے خبر تھا' لیمپ پوسٹوں سے بے خبر تھا' سڑک سے بے خبر تھا۔ اپنے بدن سے بے خبر تھا۔

وہ گرتا پڑتا بڑھ رہا تھا۔

اس کے لغزش زدہ قدموں میں نشے کی کیفیت تھی۔

پو پھٹی اور وہ دم بھر کو رکا۔

دم بھر کو رُکا اور سنبھلا۔

سنبھلا اور اس نے قدم بڑھانا ہی چاہا کہ —

سامنے سے کوئی آ رہا تھا اور اس کے قدم لغزش کھا رہے تھے۔

وہ اس کے قریب آ کر رکا۔

اس کے لبوں میں سگریٹ کانپ رہا تھا۔

آپ کے پاس ماچس ہے؟

ماچس؟

آپ کے پاس ماچس نہیں ہے؟

ماچس کے لیے تو میں......

وہ اس کی بات سنے بنا ہی آگے بڑھ گیا۔

آگے' جدھر سے وہ خود آیا تھا۔

اس نے قدم بڑھایا۔

آگے' جدھر سے وہ آیا تھا۔

کلام حیدری

سخی

میں زکریا اسٹریٹ کے ایک گندے اور چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھا ہوا ہوں۔ سامنے سیاہ رنگ کے ٹیبل پر چھوٹی سی چائے کی پیالی رکھی ہے جس میں تلخ قسم کی چائے پر بالائی پڑی ہوئی ہے۔ میرے ٹیبل کے سامنے ایک لمبا ٹیبل ہے جس پر کئی دوسرے لوگ بیٹھے ہیں' ان میں سے ایک کو میں پہچانتا ہوں۔ وہ جو شطرنجی ڈیزائن کی لنگی پہنے ہوا ہے اور جس کی گنجی بجائے بٹن کے فیتے سے بند ہونے والی ہے' میں اسے صرف اس وجہ سے پہچانتا ہوں کہ وہ مجھ سے مہینہ میں ایک بار منی آرڈر لکھواتا ہے' کبھی پچاس' کبھی چالیس اور کبھی سو بھی۔

یہ کہاں رہتا ہے' یہ میں نہیں جانتا' یہ کیا کرتا ہے' یہ بھی میں نہیں جانتا' یہ منی آرڈر کہاں بھجواتا ہے' صرف یہ میں جانتا ہوں — بی بی سکینہ معرفت شرافت حسین' بیڑی دکان پورنیہ —

اور میں نے اب چائے کی پیالی اپنے ہونٹوں سے لگا لی ہے اور بالائی ہونٹوں سے الجھ رہی ہے' میں نے پھونک مار کر بالائی کو کچھ ہٹا دیا ہے اور تب پہلے گھونٹ کے ساتھ' ایک میٹھی تلخ دھار حلق سے پیٹ میں اترتی ہوئی محسوس کر رہا ہوں' میں نے پیالی واپس طشتری میں رکھ دی ہے۔

بی بی سکینہ کے بارے میں مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ اس شطرنجی ڈیزائن کی لنگی والے کی بیوی ہے اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کا نام مولا ہے اور منی آرڈر لکھواتے وقت اپنا نام مولا بخش لکھواتا ہے۔ پہلے پہل جب میں نے اس سے منی آرڈر فارم پر لکھنے کے لیے اس کا پتہ پوچھا تھا تو اس نے اپنا نام مولا بخش بتایا اور کہا: ''معرفتی آپ اپنا ہی لکھ دیجئے۔'' چنانچہ میری معرفت روپیہ بھیجنے والے کے پتے سے بھی مجھے ناواقف ہی رہنا پڑا۔

اور میں نے چائے کی پیالی دوبارہ اٹھا لی ہے' اور بالائی کو غور سے دیکھ رہا ہوں جو چائے پینے میں حارج ہوگی۔ میں ایک لمبا گھونٹ لیتا ہوں اور بالائی تھوڑی سی چائے سمیت میرے منہ میں چلی جاتی ہے اور میں منہ چلانے لگتا ہوں۔

بی بی سکینہ کا شوہر پست قد کا گٹھا ہوا سیاہی مائل آدمی ہے' جس کے کان کی لو تھوڑی سی کٹی ہوئی ہے اور گالوں کی دونوں جانب کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ چہرہ بڑا اور محنتی آدمی کا سا معلوم ہوتا

ہے۔ سینہ چکلا اور گردن بھری بھری مگر اوسط درجے کی لمبی ہے آنکھوں میں چمک ہے مگر جیسے وہ دھندلا ہٹوں میں ہو۔ داہنے ہاتھ کی شہادت والی انگلی کا ناخن نکیلا اور لمبا ہے۔

اور میں نے پیالی پھر ہاتھ میں لے لی ہے اور ہوٹل میں آنے والے دو افراد کو دیکھنے لگا ہوں جو دروازے کے پاس ہی رک گئے ہیں اور ہوٹل کا جائزہ لے رہے ہیں ایک کے سر پر ''دلی والوں'' جیسی ٹوپی ہے جو بے میل ہے اور دوسرا ننگے سر ہے اور بال الجھے الجھے ہیں اور دونوں پھر اندر آ جاتے ہیں۔

میں نے چائے کا تیسرا اور آخری گھونٹ لے کر پیالی طشتری پر رکھ دی ہے اور اسے میز کے ایک طرف کھسکا دیا ہے۔

ہوٹل کا ریڈیو چیخ چیخ کر فلمی گانے سنا رہا ہے اچانک وہ زور سے کھڑکھڑاتا ہے اور ہوٹل کا نوجوان مالک جو ٹھڈی ہاتھوں پر رکھے کسی اردو اخبار کو جانے کب سے پڑھ رہا تھا۔ چونک کر ریڈیو کا بٹن گھمانے لگتا ہے۔

اور میں ان دونوں کو دیکھ رہا ہوں جو ابھی اس ہوٹل میں داخل ہو کر بیٹھے ہیں۔ اور دلّی والوں کی ٹوپی پہنے ہوئے شخص نے اپنے ساتھی سے کچھ مشورے کرنے کے بعد دو شیر مال اور دو سیخ کباب کا آرڈر دے دیا ہے اور ہوٹل کا لونڈا اس بڑے سے طاق نما سوراخ کے پاس کھڑا ہوا ہے جہاں سے ہوٹل کے باورچی خانے کا منظر دکھائی دیتا ہے۔

اور مولا بخش ایک کروٹ بیٹھے بیٹھے دوسرا پہلو بدل کر بیٹھ جاتا ہے اور باہر سے نظریں ہٹا کر وہ میری جانب دیکھنے لگتا ہے' جیسے اسے میرے دیر تک بیٹھے رہنے پر تعجب ہو رہا ہو' میں اس کی ٹٹولتی نگاہوں سے بچ کر پہلو بدلتا ہوں۔

اور اب میرے انتظار کا پیمانہ لبریز ہو رہا ہے' جس اخبار کے ایڈیٹر نے مجھ سے یہاں ملاقات کرنے کا وعدہ کیا تھا اس کے آنے کی امید تقریباً ختم ہو چکی ہے اور ساتھ ہی ساتھ امید کی جس کرن کے سہارے میں نے تین روپے ساڑھے چودہ آنے میں پچھلے چار دن گزارے تھے وہ کرن اس ہوٹل میں جیسے گم ہو گئی' اب تک وہ ایڈیٹر نہیں آیا۔ جس نے مجھے ترجمہ کا کام دینے کا وعدہ کیا تھا اور جس سلسلے میں میں نے سوچا تھا کہ کام ٹھیک ہوتے ہی کچھ ایڈوانس مانگوں گا جس سے زکریا اسٹریٹ کے ایسے ہوٹلوں میں کم از کم چند دن کھپ سکوں۔

دلّی والوں کی ٹوپی پہنے ہوئے شخص کے آگے ایک شیر مال رکھی ہوئی ہے' اوپر کا سرخی مائل حصہ بے حد اشتہا انگیز ہے اور کباب سے اٹھتا ہوا ہلکا ہلکا دھواں میں آسانی سے دیکھ سکتا ہوں۔

وہ ایڈیٹر ابھی تک نہیں آیا ہے' اور میں سوچ رہا ہوں' مولا بخش کی بیوی سکینہ کیسی ہوگی؟ اور اس کے کوئی بچہ ہے کہ نہیں اور اس وقت مجھے اچانک لگا کہ میں مولا بخش سے مخاطب ہو کر پوچھوں

کہ اس کے کوئی بچہ ہے یا نہیں۔ میں نے اس سوال کو مہمل اور بے موقع خیال کرتے ہوئے اپنے ذہن سے نکال دیا ہے۔

اور اب وہ دتی والوں کی ٹوپی پہنے شخص اور اُس کا ساتھی آدھی سے زائد شیر مال کھا چکے ہیں اور سیخ کباب سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو اب میں نہیں دیکھ سکتا۔ شاید اب دھواں اٹھ بھی نہیں رہا ہے۔

وہ ایڈیٹر اب نہیں آئے گا' اور میں نے چار دن یوں ہی بے کار گنوا دیئے ورنہ ان چار دنوں میں دوڑ دھوپ کی جا سکتی تھی' کوئی ٹیوشن ہی تلاش کی جا سکتی تھی' مگر چار روز تک اس اطمینان میں بیٹھے رہنے کے بعد ابھی اچانک اس متوقع کام سے مایوسی پر اب آگے چلنے کی جیسے صلاحیت ہی نہ رہی ہو۔

سکینہ کی عمر بیس سال سے زیادہ نہ ہوگی اور بچہ بھی کوئی نہ ہوگا۔ یہ شرافت حسین کون ہوگا' اور تب میں سوچتا ہوں' یہ شرافت حسین مولا بخش کا رشتہ دار وغیرہ ہوگا یا پھر دوست ہوسکتا ہے اور سکینہ ......

اب یہ کیا تک ہے کہ ایڈیٹر وعدہ کے خلاف اب تک نہیں آیا ہے اور مجھے سکینہ کی عمر کی پڑی ہے' شرافت حسین اور سکینہ کی رشتہ داری کی نوعیت کی فکر ہے' مولا بخش اور شرافت حسین کے تعلقات سے مجھے کیا تعلق ہے؟

اور اب وہ دونوں شیر مال کے بعد چائے بھی پی چکے ہیں اور کاؤنٹر پر ہوٹل کا نوجوان مالک ان سے پیسے لے رہا ہے۔

اب تین بج رہے ہیں' گیارہ بجے سے تین بجے تک انتظار کے بعد نڈھال سا ہو رہا ہوں۔

یہ مولا بخش ہر ماہ کی 13 تاریخ کو منی آرڈر ضرور لکھواتا ہے۔ ایک دو روز آگے یا پیچھے مگر پوری پابندی سے لکھواتا ہے۔

اور میں سوچ رہا ہوں' سکینہ ضرور خوبصورت ہوگی' اور یہ جو مولا بخش کی آنکھوں میں چمک ہے وہ اسی جوان محبت کی چمک ہے اور جو یہ چمک کسی قدر دھندلا ہٹوں میں ہے وہ فراقِ یار ہے۔

تین روپے ساڑھے چودہ آنے کے تقریباً جدا ہو جانے کے بعد ایڈیٹر نہیں آیا تو اب کیا ہوگا — سوچ رہا ہوں' یہ جو جیب میں اب فقط ساڑھے چھ آنے ہیں اس سے چھ پیسے یعنی ڈیڑھ آنے بھی جدا ہونے والے ہیں۔

اور میں اس پیالی کو دیکھ رہا ہوں جسے میں کب کا خالی کر چکا ہوں مگر ہوٹل کے نوکر نیا سے ٹیبل سے اٹھایا نہیں ہے' تو یہی وہ پیالی ہے جو مجھے مزید ڈیڑھ آنے سے محروم کر دے گی اور میری جیب

میں پانچ آنے رہ جائیں گے اور کلکتہ شہر' اور یہ زکریا اسٹریٹ' اور یہ دلکشا ہوٹل—

دل سے مانتا ہوگا مولا بخش سکینہ کو جبھی تو—

اور اب مولا بخش اپنی جگہ سے اٹھ چکا ہے اور مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے' اور اب وہ میرے قریب آ گیا ہے اور کہہ رہا ہے: ''ہم کل آئیں گے جی— آپ رہیں گے نا؟—

میں اسے اثبات میں جواب دیتا ہوں اور سوچتا ہوں یہ کل منی آرڈر لکھائے گا اور کل صبح تک میری جیب میں پانچ آنے رہیں گے یا......

میں اس وقت اپنی کوٹھری کی ایک چوکی پر پڑا ہوں' میرے سرہانے دو آنے پیسے تکیہ سے دبے پڑے ہیں' اور میں رات دیر تک جاگنے سے گرانی سے محسوس کر رہا ہوں۔

اس کیلنڈر کی جانب دیکھ رہا ہوں جو ہوا سے پھڑ پھڑا رہا ہے جس پر ایک امریکن عورت ہوائی جہاز کی سیڑھی پکڑے بڑے ہی قاتل انداز میں کھڑی ہے میں امریکن کلینڈر...... میں منہ ہاتھ دھو چکا ہوں' بھوک لگ رہی ہے' بڑی احتیاط سے میں تکیہ ہٹاتا ہوں اور دو آنے اٹھا کر جیب میں رکھ لیتا ہوں' ڈوری پر ٹنگی ہوئی پینٹ پہن لیتا ہوں—

میں سوچ رہا ہوں' ٹیوشن کی تلاش میں نکلنا بہتر ہوگا کچھ سہارا ہو جائے۔ پھر اطمینان سے نوکری تلاش کروں گا' اور تب سوچتا ہوں انگریزی کی جو ڈکشنری پڑی ہے اسے بیچ کر کچھ پیسے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اس خیال سے تقویت محسوس کرتا ہوں—

اور میرے سامنے مولا بخش کھڑا ہے اور میں اب منی آرڈر لکھ رہا ہوں' بی بی سکینہ' معروفت شرافت حسین بیڑی دکان' پورنیہ' مولا بخش...... ساٹھ روپے۔

اب میں منی آرڈر لکھ چکا ہوں اور مولا بخش کے ساتھ ہی ساتھ کوٹھری میں تالا بند کر کے سڑک پر آ گیا ہوں اور مولا بخش مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اسے آج مالک نے جلد ہی بلایا ہے اس لیے وہ آج منی آرڈر نہیں لگا سکے گا اور میں کچھ سوچ کر اس سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے فرصت ہے وہ کہے تو میں منی آرڈر لگا دوں۔

''آپ— ؟'' وہ ہچکچاتا ہے مگر میں اسے ہمت دلاتا ہوں کہ آخر وہ بھی آدمی ہے' ایک کام ہی اُس کا کر دوں گا تو چھوٹا ہو جاؤں گا۔

مولا بخش جا چکا ہے اور میری جیب میں ساٹھ روپے ہیں اور منی آرڈر فارم ہے۔ اور میں ٹیوشن کی تلاش میں جا رہا ہوں۔

ابھی شام ہوگئی ہے اور میں دل کشا ہوٹل میں نہیں ہوں میں پارک سرکس میں ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں بیٹھا ہوں' میری میز پر ابھی ابھی بیرا نے ایک شیر مال' قورمہ اور سیخ کباب لا کر

رکھا ہے اور میں بغور اس شیر مال کو دیکھ رہا ہوں جو بہت ملائم' بے حد لذیذ اور خوب صورت نظر آ رہی ہے۔

میرے ذہن میں اس ایڈیٹر کا خیال نہیں ہے جس نے مجھے ترجمہ کا کام دینے کا وعدہ کیا تھا اور گیارہ بجے سے تین بجے تک اُس کا انتظار کرنے کے بعد بھی وہ نہیں آیا' اور اس وقت زیادہ سے زیادہ سات بجے ہیں اور اس ہوٹل میں رونق بڑھتی جا رہی ہے۔ میں سوچتا ہوں اس ہوٹل تک میرے قدم کیسے آئے' کوئی ٹیوشن نہیں ملی' نوکری نہیں ملی اور دفعتاً مجھے سکینہ کا خیال آتا ہے جس کے پاس اسی پابندی سے منی آرڈر بھیجا گیا ہے مگر جو اس کو نہیں ملے گا' ساٹھ روپے میری جیب میں پڑے ہیں' اور منی آرڈر فارم میں نے کراؤن سینما کے سامنے پڑے ہوئے پیک کے گملے میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے ڈال دیئے ہیں۔

میں شیر مال کھانے لگا ہوں اور مجھے خیال آیا ہے اگر میں مولا بخش سے بیس پچیس روپے مانگ لیتا تو شاید وہ دے دیتا مگر مولا بخش کے سامنے دستِ سوال بڑھانے کے خیال سے مجھے بڑی ذلت محسوس ہو رہی ہے۔

یہ کباب کتنا خوش ذائقہ ہے اور پیاز کے ان تراشوں کے ساتھ تو اس کا لطف ہی نرالا ہے۔

میں ڈلہوزی اسکوائر کے ایک آفس سے نیچے اتر رہا ہوں' پانچویں منزل سے اترتے اترتے پاؤں دُکھنے لگے ہیں اور ایسی کتنی ہی بلڈنگوں سے نامراد لوٹتے اب مجھے ایسا لگتا ہے جیسے نوکری نام کی کوئی چیز اس دنیا میں نہیں ہے۔

ٹرام کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ میں فٹ پاتھ پر کھڑا اپنی تھکن دور کر رہا ہوں۔

میری جیب میں بائیس روپے کچھ آنے ہیں اور سکینہ کو منی آرڈر ابھی تک نہیں ملا ہے۔ بائیس روپے کتنی بڑی طاقت کا مظہر ہیں۔ میں سوچتا ہوں ابھی کچھ روز اور بھی چکر کاٹ سکتا ہوں۔ بائیس روپے اب بھی میرے پاس ہیں۔

اب میں چلنے لگا ہوں اور رخ کولوٹولہ کی طرف کر دیا ہے' چلتے چلتے اس بلڈنگ تک آ گیا ہوں جو جاپانی بمباری کی زد میں آئی تھی۔

میں وہاں پر آ گیا ہوں جہاں اردو رسالوں کی دکان ہے اور میں اس سے آگے بڑھ گیا ہوں۔ سکینہ کا خیال مجھے اس کوٹھی کا خیال آتا ہے جو تھیٹر روڈ میں ہے اور جہاں مجھے ٹیوشن کے لیے آج شام کو بلایا گیا ہے کیا پتہ آج ٹیوشن مل ہی جائے۔

یہ ناخدا مسجد ہے' وہی زکریا اسٹریٹ اس کے دروازے کے باہر ایک لاش اسٹریچر پر پڑی ہوئی ہے' اور ایک نوجوان آواز لگا رہا ہے۔

''ایک غریب مر گیا ہے، کفن دفن کے لیے پیسے دے کر ثواب حاصل کیجئے۔''

میں قریب جاتا ہوں۔ فیتے سے بند ہونے والی گنجی' ایک کان کی کٹی ہوئی لو۔

مولا بخش ۔۔۔؟ میں ہلکے سے اس کا نام لیتا ہوں۔ سکینہ کے پاس منی آرڈر پہنچنے سے پہلے یہ خدا کے یہاں پہنچ گیا۔

میں اس آواز لگانے والے نوجوان سے پوچھتا ہوں یہ کیسے مرا۔ ''ٹرک سے کچل کر۔'' نیچے کے دھڑ سے اس نے چادر ہٹا کر دکھایا۔ مجھے چکر آنے لگا ہے۔ یہ ناخدا مسجد ہے' مولا بخش ہے' جس کے کفن دفن کے لیے ایک آنے دو آنے راہ گیر چادر پر پھینکتے جا رہے ہیں۔

میرا ہاتھ جیب میں جاتا ہے۔ بائیس روپے کچھ آنے اس چادر پر پھینک کر جلدی جلدی جانے لگتا ہوں' وہ نوجوان مجھے غور سے دیکھتا ہے۔

میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ وہ نوجوان مجھے اب بھی غور سے دیکھ رہا ہے ۔۔۔

❁ ❁ ❁

غیاث احمد گدی

دیمک

یہ بھی کوئی جینا ہے۔ جی چاہتا ہے پنجرے کو پھونک کر کھلے آسمانوں کی طرف اڑ جاؤں۔
مگر اس ارادے کی تکمیل اتنی آسان نہیں۔ زندہ رہنے کی تمنا میں آدمی کو کتنی بار خودکشی کرنی پڑتی ہے اور مرنے تک زندہ بھی رہنا پڑتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے' ایک چھوٹی سی شمع جلانے کے لیے سارے گھر کو نذر آتش کر دینا پڑتا ہے۔ پھر بھی شمع نہیں جل پاتی۔ حتیٰ کہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے کوئی غریب خود جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔

''کیا مر گئے وہاں جا کر یا بہرے ہو گئے؟''

میری بیوی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ کتنی کڑوی گولی ہے یہ شادی سے پہلے جس نغمے کے لیے میرے لب ہی نہیں روح تک ترس رہی تھی' شادی کے چند سالوں بعد وہی ''نغمہ'' دل کو جلانے لگا ہے۔ مگر خیر' اچھا ہی ہوا' ورنہ الٹی سیدھی سوچ کر میں باولا ہوا جا رہا تھا۔ ریشم کی جس ڈور کو میں اپنے گلے کے گرد کسنے لگتا ہوں' میری بیوی سعیدہ کی آواز کا تیز چاقو فوراً اسے کاٹ ڈالتا ہے۔

''میں پوچھتی ہوں' آج افیون تو نہیں کھا لی آپ نے؟'' اس بار سعیدہ میرے سر پر ایکدم سوار ہو گئی۔

''اوہ......ہو......آخر کیا ہوا' کچھ کہو بھی تو___؟

''حمیدہ کو پھر بخار آ گیا۔''

''تو میں کیا کروں۔''

میری بیوی سعیدہ رونے لگی۔ خلاف توقع یہ جواب پا کر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ آنکھیں' ہائے وہ سعیدہ کی خوبصورت آنکھیں!

''اب مجھے اللہ موت ہی دے دے تو اچھا ہے۔'' وہ میرے قریب زمین پر بیٹھ گئی۔ ''میں پوچھتی ہوں پیدا کرتے وقت آپ نے یہ نہیں سوچا تھا......''

اس بار میں نے محسوس کیا کہ واقعی بات میں نے سخت کہہ دی ہے۔

بے حیائی سے ہنستے ہوئے میں نے کہا: ''یہ غلط ہے۔ پیدا میں نے نہیں تم نے کیا ہے۔''

اور سعیدہ کی تھوڑی پکڑ لی۔ سعیدہ بھی مسکرا پڑی۔ پتہ نہیں کیوں — پیشانی پر بکھرے ہوئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے بڑی نرمی سے بولی: ''جائیے نا ڈاکٹر کے پاس۔ میری جوان بچی کو جانے کیوں بخار نہیں چھوڑتا۔''

''اچھا جاتا ہوں— ''ایک سو ستر روپے میں چار بچے' ایک بیوی اور ایک اپنا جہنم۔ پھر یہ روز روز کی بیماری......

''دیکھئے'' پلٹ کر دیکھتا ہوں تو سعیدہ کچھ اور کہہ رہی ہے۔

''کیوں؟''

''جلدی سے آجائیے گا۔ بچے اسکول سے آرہے ہوں گے۔ ساتھ ناشتہ کیجئے گا۔''

''اچھا جلدی ہی آجاؤں گا— تمہاری خوبصورت آنکھوں کی قسم۔''

ہنسنے لگی۔ ''آپ میرے کان کے بندے کب لا رہے ہیں؟''

ہت تیری بیٹر یلزم کی تعریف آنکھوں کی کیجئے بات بندے تک پہنچتی ہے۔ جی میں آیا! پوچھ ہی لوں لگے ہاتھوں' یہ آنکھوں میں بندے کب سے پہنے جانے لگے ہیں؟ مگر اس خوبصورت شام کو کیوں خراب کروں۔

رات گئے' بچے تو سو چکے تھے' میں نے یوں ہی سعیدہ کو چھیڑا۔

''سعیدہ تمہاری آنکھیں بھی کیا چیز تھیں۔ اگر اب بھی گال ابھرے ہوں تو یہ قیامت ڈھا سکتی ہیں۔''

''انہیں آنکھوں نے تو آپ کو انتخاب کیا تھا۔ شادی سے پہلے جب میں نے اپنے دروازے پر دیکھا تھا' اسی وقت آپ مجھے پسند آگئے تھے۔''

''مگر اس وقت تم نے بڑی سخت ڈانٹ پلائی تھی۔''

''وہ تو اوپری دل سے' پھر مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ ہی سے میری شادی ہوگی......ہاں تو اُس وقت آپ کتنے بدھولگ رہے تھے۔''

''دراصل اس وقت میں تمہاری پیاری آنکھوں میں غوطہ زن تھا۔''

''اور آج......؟''

''اور آج بھی تم مجھے ہر وقت انہیں میں پا سکتی ہو......''

اور پھر یوں ہی چھیڑ چھاڑ میں آدھی رات ہوگئی۔

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا۔

آتش تو خیر اب بھی جوان ہے۔ مگر جیب میں پیسے نہیں' اس پر چار بچے آنگن میں الگ کھیل رہے ہیں اور سعیدہ کے گالوں کی رونق مفلسی کا بوالہوس کتا لوٹ لے گیا ہے۔

اب تو مجھے سعیدہ کی فکر سے زیادہ اور فکریں کھائے جاتی ہیں۔ گھر لوٹتے ہوئے میں نے سوچا کہ یوں تھک تھکا کر بھاگتے سایوں کے پیچھے دوڑنا کیا معنی۔ اس سے کیا حاصل' پندرہ آنے میں بھی سینما دیکھا جاتا ہے اور مزے سے سیزر کے دھوئیں اڑا اڑا کر دیکھا جاتا ہے۔ لیکن تین دنوں کے بعد جیب میں پیسے آئے' سعیدہ کی آنکھوں میں وہ بات نہیں تھی۔ ایک ڈوبکی لگنے کے بعد انسان دکھوں کو بھول سکے' اس لیے سینما کی طرف آپ سے آپ قدم اٹھ گئے۔ وہاں جو بھیڑ کی موم بتیوں کو دیکھا تو معاً نظر اپنے کپڑوں کی طرف گئی' کپڑے صاف ستھرے تھے گویا دھوبی نے دو آنے لے کر چار آنے کی محنت کی ہو' اس لیے سیکنڈ کلاس کے بجائے تین روپے چار آنے والے درجے کی طرف تا کی۔ لیکن غلط۔ حلیم شرر سے لے کر کرشن چندر تک کو پڑھ آئے۔ سب جھوٹ سراسر لغو' ایک نظر میں مرنا تو دور کی بات ہے' یہاں تو بقول شخصے درجنوں نین بان چلائے گئے' سب بے سود' یہ موم بتیاں خود جلتی ہیں نہ دوسروں کو جلانا جانتی ہیں۔ اس مشینی دور میں جلنے جلانے والی بات سرے سے غلط ہے۔ اور یوں پانچ روپے لٹ گئے۔

گھر آیا تو سعیدہ نے ہتھیلی پھیلا دی۔ ''ایک' دو' تین' چار' پانچ...... تیرہ اور ایک؟''

سوال بڑا ٹیڑھا تھا۔ میرے ہاتھ آپ ہی آپ کنپٹیوں کی طرف گئے۔

''میں پوچھتی ہوں' اور ایک پانچ کا نوٹ کیا ہوا؟''

''گر گیا ایک نوٹ —''

''گر گیا۔ کیسے گر گیا؟ — کہاں گر گیا؟''

''کیسے گر گیا' کہاں گر گیا؟ کوئی سوال ہے؟ نہیں بتاتے ہم تمہارے باپ کے نوکر ہیں۔''

بکھیڑا کون کھڑا کرتا ہے۔ کچھ اور کہہ دوں' سوچتا ہوں' مگر کیا کہوں۔

''ہائے کہاں گرا دیا۔ ایک نوٹ؟ ہائے سانپ سونگھ گیا' کچھ پھوٹے تو۔''

''نہیں بولتے۔ تمہارے باپ کے کوئی نوکر ہیں۔''

''تو کیا میں تمہارے باپ کی نوکر ہوں۔ درجن بھر بچوں کو کیا اپنا کلیجہ کھلا دوں؟''

بھاگنے کی کوئی راہ نہیں ملتی تو آدمی کانٹوں میں بھی چھلانگ لگا دیتا ہے۔ آگ میں بھی کود پڑتا ہے۔ لیکن یہاں تو چاروں طرف سعیدہ ہی سعیدہ تھی۔ راہ فرار بند۔ سعیدہ اور سعیدہ کی ہائے ہائے۔

پھر پل بھر میں کنپٹیاں گرم ہو گئیں۔ انگلیوں میں لرزش ہوئی اور سوکھے رخساروں پر تڑاتڑ تین چار طمانچے پڑ گئے۔

بات ختم ہوئی چلیے اب آرام سے سویئے' گہری نیند آئے گی۔

کوئی اب اس ایک سو ستر روپے ماہوار اور چار پانچ بچوں والے کلرک سے پوچھئے' وہ سینہ تان کر تلسی داس کے دوہے کا ایک بند' کہہ سنائے گا۔ دوہے کا مطلب یہ ہے۔

عورت ڈھول اور جانور ہوتے ہیں اسی لائق کہ انہیں پیٹا جائے۔ پیٹنے سے ہی وہ خوش رہتے ہیں۔

سوچئے تو یہ دلیل بھی کہاں تک درست ہے کہ کھوئی ہوئی بہاروں کی تلاش میں مرد چاہے تو دھول پھانک سکتا ہے، عورت کو اس کی اجازت نہیں، آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ جوان لڑکیوں کو موم بتیاں بنا کر ان کے قریب بیٹھ کر جل مرنے کی سوچ سکتے ہیں اور پندرہ آنے کی جگہ پانچ روپے پھونک سکتے ہیں۔ مگر سعیدہ اب سوال نہیں کر سکتی، پانچ روپے وہ خرچ کر ڈالے تو مجرم۔ کسی جوان لڑکے کے پہلو میں بیٹھنے کی خواہش بھی کرے تو گناہِ عظیم۔

لیکن تیر تو کمان سے نکل چکا، اب اس سے کیا حاصل؟ ضمیر پاجی ہے اسے دھمکیاں دے کر سلا ڈالو یار۔ ایسے وقت میں بھی یہی سوجھتی ہے اسے۔

مگر اس بے چاری سعیدہ کو کیا کروں، جو پہلو والے پلنگ پر پڑی سسک سسک کر رو رہی ہے۔

''سعیدہ؟ اے سعیدہ؟؟''

''جی'' رندھے ہوئے گلے کی آواز کو میں پہچان سکتا ہوں۔

اسی وقت کہیں سے یہ خیال چھلانگ لگاتا ہے، تلسی داس نے سچ ہی کہا ہے شاید، ایسا نہیں سوچتے۔ بیوی آخر بیوی ہے۔ خود تلسی داس کو دیکھو۔ اس نے اپنی بیوی رتنا کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ ان سے ملنے کے لیے دریا کو لاش پر بیٹھ کر عبور کیا۔ سانپ کو رسی سمجھ کر تھاما۔ یہ شاعر لوگ ہمیشہ الٹی سوچنے کے عادی ہوتے ہیں۔

''سعیدہ ذرا اِدھر آنا۔''

سعیدہ چپ میری پائنتی کے قریب آ کھڑی ہوتی ہے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' وہ بیٹھتی نہیں خاموش کھڑی ہے۔

میں نے آہستہ سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے چارپائی پر بٹھا دیا۔ اب کچھ کہنا چاہتا ہوں تو زبان نہیں کھلتی اور چپ رہوں تو دل بھرا بھرا ہے۔ پھر ضمیر کا نٹے الگ چبھو رہا ہے۔ یہ وہ دوراہا ہے جہاں پہنچ کر ہمارے طبقے کے جوان عجیب مصیبت میں پھنس جاتے ہیں۔ ایک طرف صدیوں کا غرور کہ عورت پیروں کی جوتی ہے، کم تر ہے — زیادتی بھی ہو جائے تو وہ زیادتی نہیں، عورت کا حق ہے، جو غرور صدیوں سے گردن کو اکڑائے ہوئے ہے۔ اچانک گردن جھکانے سے وہ ٹوٹتا سا معلوم ہوتا ہے، اور اس کے ساتھ خود گردن ٹوٹنے لگتی ہے۔ دوسری طرف دل کی حالت دگرگوں ہے۔ جی چاہتا ہے، اپنی زیادتی پر سر پیٹ لوں۔ سعیدہ کے قدموں پر گر پڑوں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگوں، چودہ برس سے جس پیار کو دل میں ایک پودے کی طرح بسائے رکھا ہے، اس کی جڑوں میں خراش سی پڑ گئی ہے۔ آخر کیا کروں؟ کچھ نہیں کر پاتا۔ اس کی انگلیوں کی نازک نازک پوروں کو سہلاتا ہوں......

''چھوڑیئے مجھے ۔ پہلے طمانچے اور اب یہ پیار' مجھے پسند نہیں یہ سب ۔ اللہ کرے مر جاؤں۔''

''ایسا نہ کہو۔ ایک میں بے چارہ پھر کس کے سہارے زندہ رہوں گا۔''

''سب بناوٹی باتیں ہیں۔ تھپڑ مارتے وقت کہاں سو گیا تھا یہ بے چارہ۔''

اب میں اس نادان کو کیا بتاؤں کہ یہ تھپڑ میں نے اس کے گالوں پر نہیں بلکہ خود اپنے منہ پر مارا ہے۔

''کیا کروں سعیدہ آج کل طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ سینہ کا درد پھر لوٹ آیا ہے۔ بات بات پر غصہ آتا ہے۔ اپنی مجبوریوں کو سوچ کر۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔''

سعیدہ وہ سب نہیں جانتی۔ وہ شاید یہی سمجھتی ہے کہ دراصل یہی زندگی ہے اور ان مصیبتوں کا چکر جہاں ختم ہوگا' وہ منزل ہوگی موت کی......اُس کے اِدھر اُدھر کچھ نہیں۔ مزے میں سعیدہ ہی ہے جو صرف اتنا ہی سوچتی ہے۔ پڑھ لکھ کر لوگ خواہ مخواہ راستوں میں کانٹے بکھیر لیتے ہیں۔

''کہو——!''

''یہ انگوٹھی دیکھی ہے آپ نے؟'' اس نے اپنی انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی کو میرے ہاتھ سے چھویا۔ اندھیرے میں صرف اتنا ہی اندازہ لگا سکا کہ وہ انگوٹھی ہے۔

''بہت اچھی ہے۔ مگر تم نے کہاں سے پائی؟''

''سعیدہ نے شاید پہلی بات سنی دوسری نہیں۔ جھٹ بولی۔

''ہاں بہت اچھی ہے۔ سونے کی ہے۔ آپ میرے لیے بھی ایک ایسی ہی انگوٹھی بنوا دیجئے نا۔''

''بنوا دوں گا ضرور بنوا دوں گا۔ اس ماہ کو میرا سالانہ بونس ملے گا۔ اس وقت بنوا دوں گا تمہیں ایک اچھی سی انگوٹھی——''

واقعی اس بار میں نے بھی سوچا۔ چودہ سال میں میں نے اسے کون سا زیور دیا ہے؟—— بلکہ اس کی شادی کے زیور بھی میرے ہاتھ بک گئے۔

''لیکن سعیدہ یہ انگوٹھی تمہارے پاس آئی کہاں سے۔'' ذرا تجسس ہوا۔ خواہ مخواہ کی راز جوئی۔

''یہ انگوٹھی پڑوسن والی آمنہ کی ہے۔ وہ کل میکے گئی ہے نا؟''

''تو تمہیں دے گئی؟''

''ہاں کہنے لگی میرے بھائی جان دیکھ لیں گے تو ضرور چھین لیں گے' دیکھئے نا کیا زمانہ آ گیا ہے۔ سگی بہن کو سگے بھائی کا اعتبار نہیں۔''

بات بڑی خوبصورتی سے ایک الگ راستے پر مڑ رہی تھی کہ اچانک سعیدہ کو اپنے کانوں کی بالیاں یاد آ گئیں۔

''ہاں تو ایک کام کیجئے۔ ابھی تو آپ انگوٹھی نہ بنوا سکیں گے۔ مجھے وہ ایرنگ لا دیجئے جس کا آپ نے وعدہ کیا تھا۔''

دوسرے روز دفتر سے واپسی پر صمد خان سے ایک روپیہ سود پر پانچ روپے قرض دے کر ایک نیو امریکن گولڈ کی خوبصورت سی ایر رنگ خرید لی اور اکیلے کمرے میں سعیدہ کے کانوں میں اپنے ہاتھوں سے پہنا دیا— ''جیو میری جان جب تک تمہارا جی چاہے۔''

''میرا کیوں' جب تک آپ کا جی چاہے۔ یوں کہئے۔'' تصحیح کر کے وہ مسکرانے لگی۔

امریکن گولڈ کی ساری خوبصورتی ماند پڑ گئی۔

ابا چائے پی لیجئے— ''میری گیارہ سالہ بچی حمیدہ کی آواز آئی' جسے سن کر سعیدہ نے جلدی سے ایر رنگ اتار کر بکس میں رکھ لیا۔ میں سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ایک افسانہ یاد آ گیا۔ جس میں ایک باپ اپنے بچے کے ندی میں بہہ جانے پر اس لیے مطمئن تھا کہ چلو اچھا ہوا۔ ورنہ دوسری طرح موت ہوتی تو کفن کے پیسے کہاں سے آتے۔

چائے اور ناشتہ آ گیا۔ اتنے میں اسکول سے بھاگتے' لڑتے جھگڑتے بچے بھی آ گئے۔

رات کو سعیدہ نے بڑے پیار اور خلوص سے ایک پیالے میں انڈے کا حلوہ لا کر رکھ دیا۔

''لیجئے اسے کھائیے۔ دو چار دن کھائیے گا۔ چھاتی کا درد ٹھیک ہو جائے گا—''

کون کہتا ہے کہ سعیدہ کو مجھ سے پیار نہیں! وہ مجھے نہیں چاہتی— یہ سونے کے رنگ کا حلوہ تو چکھو۔ دیکھو کتنی محبت سے بنایا ہے۔ ایک ذرا میں نے سینے کے درد کا ذکر کر دیا تھا کہ دوسرے دن حلوہ تیار ہو گیا۔

ابھی حلوہ چکھ ہی رہا تھا کہ تینوں بچوں نے مجھے گھیر لیا— ماں نے انہیں سوتا ہوا سمجھ رکھا تھا اور وہ بڑی دریا دلی اور بے تکلفی سے میرا ہاتھ بٹانے لگے ہیں اور یوں حلوہ ہم پانچ باپ بچوں میں اونٹ کے منہ میں زیرے کی طرح بٹ گیا۔

میں اور سعیدہ دونوں ہنسنے لگے۔ بچے بے چارے کیا سوچتے ہوں گے کہ کس گھر میں جنم لیا ہے' جہاں چھوٹی چھوٹی چیز کو بھی جی ترس جاتا ہے۔ لیکن بچے اتنا ہی سوچتے۔ شکر ہے پروردگار تیرا ورنہ پتہ نہیں تیری دنیا کب کی تباہ ہو گئی ہوتی۔

سعیدہ نے بچوں کو ایک کہانی سنانی شروع کر دی۔

''ایک تھا راجہ' اور ایک تھی رانی......!''

میں نے کہا: ''ٹھہرو جی۔ یہ ہر روز ایک تھا راجہ ایک تھی رانی۔ ایک تھا حنیف اور ایک

سعیدہ کیوں نہیں؟''

''تم اپنا کام کرو جی!......

''ہاں تو......ایک تھا راجہ ایک تھی رانی۔ ان کے سات بچے تھے۔ وہ سب بڑی خوشی رہ رہے تھے۔ ہر طرح کا آرام آسائش تھی۔ کوئی غم نہیں تھا'' ...... اتنا کہہ کر سعیدہ لمحے بھر کے لیے رکی۔ پھر بچوں کی طرف دیکھ کر بولی ـــ ''ہوں کاری دو جب کہوں گی ورنہ میں بھی سوتی ہوں۔''

تینوں بچے بلکہ حمیدہ تک نے بہ یک زبان کہا: ''ہوں ہوں۔

''پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ ان کی راج گدی چھن گئی اور لوگ ایک دم سے کنگال ہو گئے۔ ایسے ہی جیسے ہم ہیں۔''

سعیدہ کوئی داستاں گو نہیں' داستاں طراز نہیں' مگر جب کوئی کہانی' کوئی قصہ سنانے لگتی ہے تو میری توجہ بھی کھینچ لیتی ہے۔ لیکن بیچاری میں تھوڑی کمزوری ہے۔ وہ تشبیہہ و تمثیل دینے میں برابر چوک کرتی ہے۔ راجہ کنگال ہو گیا' ایسے ہی جیسے ہم ہیں...... وہ بے وقوف نہیں جانتی کہ ہاتھی بیٹھ بھی جائے تو گدھے سے اونچا ہی ہوتا ہے۔

''پھر اماں؟'' صفیہ نے پوچھا:

''پھر دن بھر وہ راجہ رانی گلی گلی بھیک مانگتے اور شام کو جب پکا کر کھانے بیٹھتے تو وہ ساتوں بچے سارے کا سارا کھانا کھا جاتے اور راجہ رانی ہر روز کی طرح اس دن بھی جھوٹے برتن چاٹ کر رہ جائے......''

''یہ تم اپنے میکے کا قصہ سنا رہی ہو' جہاں لوگ دن کو بھی چراغ روشن کر کے بازاروں میں گھومنے نکلتے ہیں۔''

''تم چپ رہو جی''۔ سعیدہ کا موڈ اچھا تھا' اس لیے کھل کھلا کر ہنسنے لگی' ورنہ میکے کی برائی بھی کسی عورت نے سسرال میں برداشت کی ہے۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میکے میں سعیدہ کو فاقے کرنے پڑتے تھے اور ذرا ذرا چیز کے لیے ترسنا پڑتا تھا۔

''پھر ایک دن راجہ اور رانی نے ایک ترکیب سوچی۔''

''ارے سوچی ہو گی۔ ہمیں تم سونے دو گی یا امیر حمزہ کی داستان چلتی رہے گی رات بھر؟''

''آپ سوئیے نا۔ آپ کو کون کہتا ہے قصہ سنئے۔''

میں خاموش ہو گیا۔ سعیدہ کے قصے کی کیا' اس کی کوئی تک ہے۔ ابھی تو راجہ رانی کنگال ہو گئے تھے۔ اختتام تک پہنچتے پہنچتے اب سنیں گے' ایک فقیر یا سادھو آیا اور اس نے ایک جادو کی چھڑی گھمائی اور وہ کنگال کنگالن پھر سے راجہ رانی بن گئے' یعنی ابتدا بھی غلط انتہا بھی غلط۔ راجہ سے کوئی کنگال نہیں ہوتا اور کنگال کے یہاں کوئی طلسمی چھڑی والا فقیر نہیں آتا۔

''اس کے بعد؟'' رفو بولا:

''اس کے بعد سوچی ہوئی ترکیب پر راجہ رانی نے عمل کیا اس طرح کیا کہ ایک رات بچوں کو کھلا پلا کر سلا دیا اور دونوں رات کے وقت پھر مانگنے کے لیے نکل پڑے۔ رات گئے واپس آئے تو دیکھا کہ بچے گہری نیند لے رہے ہیں ایک ایک کے قریب پہنچ کر ان کو گھور گھور کر دیکھا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ واقعی بچے سو رہے ہیں تو پوٹلی کھولی اور آٹا گوندھ کر تیار کیا۔ پھر رانی نے راجہ سے آہستہ سے کہا:

''ذرا دیکھنا روٹی پکانے والی چوکی کہاں ہے—؟'' اتنے میں سب سے چھوٹی بچی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''یہ رہی چوکی ماں— ''اور وہ چوکی سامنے لا کر رکھ دی۔ رانی نے اس سے کہا ''چپ چاپ بیٹھی رہ۔ تیری بہنیں اٹھ جائیں گی''۔ دیکھنا تو ذرا بیلن کہاں ہے'' دوسری لڑکی نے بستر پر سے جواب دیا: ''میں لاتی ہوں بیلن۔''

راجہ اور رانی نے اسے بھی خاموش رہنے کو کہا...... اور رب العزت کا شکریہ ادا کیا کہ اور لڑکیاں سو رہی ہیں۔ مگر رانی جیسے جیسے ضرورت کی چیزیں تلاش کرتی گئی بچیاں اٹھتی گئیں۔ حتیٰ کہ ساتوں اٹھ بیٹھی۔

''بہت خوب!'' میں اچھل پڑا' اس لیے نہیں کہ سعیدہ نے کوئی بہت عمدہ کہانی سنا دی بلکہ اس نے پہلی بار کہانی میں حقیقت کا خیال رکھا۔ اس بار کوئی فقیر یا سادھو بیچارہ نہیں آیا۔

''کیا بہت خوب؟''

''یہی کہ اب کنگال اور کنگالن کو تم نے پھر سے راجہ رانی نہیں بنا دیا۔''

اس نے میری باتوں کا جواب نہیں دیا۔ ''تو بچو! اس طرح تم نے بھی آج ایک حرکت کی ہے۔ آج تم نے اپنے ابا کو حلوہ نہیں کھانے دیا' وہ تمہارے ابا کی دوا تھی۔ بری بات ہے تم نیک بچے ہو' ایسی عادت ہرگز مت سیکھو سمجھے۔''

کسی بچے نے ہونکاری نہیں دی سعیدہ نے پلٹ کر دیکھا تو سب کے سب سو رہے تھے وہ ناچار میری طرف متوجہ ہوئی۔

''سن رہے ہیں آپ؟ دیکھئے تو حمیدہ جوان ہو رہی ہے؟''

''تو اچھی بات ہے میں اس کے لیے دولہا تلاش کروں گا......''

''دولہا کو نہیں کہہ رہی ہوں عقل مند صاحب۔ حمیدہ سیانی ہو رہی ہے اسے اب دوپٹہ خریدنا پڑے گا۔''

میں جانتا تھا کہ سعیدہ کیا کہنا چاہتی ہے اور یوں جو میں سعیدہ کے اشارے کا غلط جواب

دے رہا ہوں تو اس میں زندہ رہنے کا ایک نکتہ پوشیدہ ہے یعنی حقیقت سے فرار۔

''اچھا بھئی، دوپٹہ لادوں گا'' میں نے ٹالنا چاہا۔

''لیکن اس طرح تو مہینوں سے ٹال رہے ہیں...... اس طرح بھاگنے سے فائدہ بھاگ کر کہاں جائیے گا؟''

سعیدہ سچ کہتی ہے۔ بھاگ کر آدمی کہاں جائے گا۔ دو پاٹوں کے بیچ سے کوئی ثابت بچا ہے جو میں بچوں گا؟ پھر سعیدہ نے آہستہ سے مجھے ایک بات بتائی کہ کس طرح نکڑ والے پان کی دکان میں بیٹھنے والے چند آوارہ لوگوں نے اس کی لڑکی صفیہ کی طرف کنکری پھینکی اور اسے چھیڑا...... مجھے محسوس ہوا گویا کسی نے تیزاب چھڑک دیا ہو مجھ پر۔

واقعی جینا بہت مشکل ہے۔ بھوکوں مرکر، ننگے رہ کر، ایک ایک چیز کے لیے ترس ترس کر جینا کتنا بڑا کمینہ پن معلوم ہوتا ہے، افلاس کی چکی میں پستے پستے آدمی ایک روز اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے۔ کتنی حسرت سے کہا جاتا ہے کہ روحانی مسرت تو دراصل غریبوں کو حاصل ہے۔ ہم امیر لوگ تو بدنصیب ہیں کہ شراب کی قسمیں اور اس کی تاریخیں یاد کر کے خاک ہو جاتے ہیں۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟''

سوچ رہا ہوں کہ سالے کیسے پکڑے جاتے ہیں۔ میں تو تھک سا گیا ان کے پیچھے بھاگتے بھاگتے۔

بڑی حسرت آمیز نظر سے سعیدہ دیکھتی ہے اور سوپ میں دال لیے پھٹکتی باورچی خانے چلی جاتی ہے شاید وہ نہیں جان پاتی کہ ایک سو ستر روپے میں پہلے ہی گذر مشکل تھی۔ یہ وہ چادر ہے کہ پیر ڈھکیئے تو سر کھل جاتا ہے اور سر چھپایئے تو پاؤں ننگے ہو جاتے ہیں۔ صمد خاں کے ایک سو چالیس روپے ہو گئے ہیں اور تقریباً پچاس روپے مزید بیاج کے پھر بھی دودھ والے کا تین ماہ کا پیسہ چڑھ گیا ہے، دوا نہیں آ پاتی ہے۔ میرے سینے سے میں الگ درد اٹھتا ہے۔ اس پر دوسرے تیسرے ماہ حمیدہ کے لیے پانچ روپے دوپٹے کے لیے چاہئیں۔ یا پھر یہ کیجئے کہ اسے پردے میں بٹھا دیجئے۔ حمیدہ جوان ہو رہی ہے۔ باہر نہیں نکل سکتی بغیر دوپٹے کے۔ دنیا کے اخلاق کا جنازہ نکل گیا ہے۔ گیارہ سال کی بچی کو بری نظر سے تاکتے ہیں۔ لوگوں کی اپنی ماں بہن نہیں یا یہ حمیدہ وقت سے پہلے کیوں جوان ہو رہی ہے۔ فطرت کو کھیل بھی رچتا ہے تو غریبوں سے۔ جی میں آتا ہے کہ آگ لگا دوں ان ساری کتابوں کو جن میں غریبی کو نعمت خداوندی کہا گیا ہے۔ بڑی مشکل ہے، ایک شریف آدمی کو اپنی لاج رکھنی بڑی مشکل ہے۔

بہرحال پانچ سات روپے خرچ کرنے ہی پڑیں گے۔ ڈھائی گز کپڑا حمیدہ کے گلے میں ڈال دیجئے، تو کئی فائدے ہیں۔ نکڑ والی دکان سے سودا سلف آ جائے گا۔ دوپہر کا کھانا پہنچ جائے گا،

نل پر سے ضرورت بھر پانی آ جائے گا اور بھی چھوٹے بڑے بہت کام نکل سکتے ہیں۔ مثلاً ننھے کو لے کر خیراتی اسپتال جانا' کمپنی کے میدان میں خودرو پودوں میں سے ساگ چن کر لے آتی ہے۔ ڈھائی گز کے اس کپڑے کو گلے میں ڈال دیجئے تو واقعی بہت سے کام نکل سکتے ہیں۔ یا اسی کپڑے کو دروازہ پر لٹکا دیجئے تو پھر اندر مزے سے پڑے رہیے' ننگے رہیے' اگھارے رہیے کوئی بات نہیں۔ کسی بات کی شرم نہیں' کوئی پوچھنے والا نہیں' کیوں صاحب آپ کیسے جی رہی ہیں؟'' بلکہ گلیارے گلیارے تعریفیں ہوں گی کہ حنیف میاں نے اپنی لونڈیا کی کتنی کم عمر میں ہی پردے میں بٹھا دیا ہے ایسے ہوتے ہیں شریف آدمی......!!

لیجئے صاحب دیکھ لی نا آپ نے ڈھائی گز کی کرامات؟ یہ پردہ بڑے کام کی چیز ثابت ہوا۔ انسان کی عزت آبرو کا امین بن گیا...... آگے زبان مت کھلوایئے۔ بات شرع کے حدود کو پھاند جائے گی۔ بے پردگی شرعاً ممنوع ہے ٹھیک ہے صاحب! بھوکوں مرنا بھی شرعاً ممنوع ہے...... پھر اس ننگے کے لیے کیا جس کے پاس نہ کھانے کو ہے نہ نچوڑنے کو۔

انسان ہوں' شریف ہوں' غریب ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی شرافت کے ٹانکے ادھیڑنے لگے۔ یہ کیا کم دکھ کی بات ہے کہ آٹھ سال کا بچہ فیس نہ ملنے پر اسکول سے خارج کر دیا جائے' اور اب وہ سگریٹ کے ٹکڑے چن کر پھک پھک دھوئیں اڑاتا پھر رہا ہے۔ اتنا ہی نہیں' آج کسی نے حمیدہ پر کنکری پھینک دی اسے چھیڑا......

یہ پیچ و تاب کھاتا دفتر پہنچا۔ کام کرنے کی بجائے ساتھ کلرکوں سے ہنسی مذاق میں اپنا غم کھونا چاہا۔ فلم اسٹاروں کی جوانیوں کے چرچے کیے' افسانوں کی بات چھیڑی' مطلب ہے بھاگنا چاہا حقیقت سے لیکن سعیدہ سچ کہتی ہے بھاگ کر کہاں جایئے گا۔

واقعی بھاگ کر کہاں جاؤں گا' کہاں جا سکتا ہوں' چاروں طرف گہرے کنوئیں ہیں۔ اندھیرا ہے' تھوڑی سی روشنی کہیں نظر پڑتی ہے تو دوڑ کر پکڑتا ہوں۔ مگر روشنی تو کیا ہاتھ آئے گی' خود ہاتھ جل جاتا ہے۔

واپسی پر گھر میں ایک ہنگامے سے دوچار ہونا پڑا محلے کی کچھ عورتیں' مرد اور بچے میرے دروازے کو گھیرے کھڑے تھے' اور وہ پڑوسن آمنہ جو کل ہی اپنے میکے سے واپس آئی تھی' ہاتھ پھینک پھینک کر مجھے اور میری بیوی کو کوس رہی تھی بات کیا ہوئی کیسا ہنگامہ ہے میرے گھر میں؟

پتہ چلا میکے جاتے وقت آمنہ نے جو انگوٹھی اپنے بھائی کے ڈر سے میری سعیدہ کو دی تھی' وہ سعیدہ سے گم ہوگئی ہے' اور وہ گھر کے سارے کونے کھدرے ڈھونڈ کر تھک ہار گئی تھی اور اب صرف آنسو بہا رہی تھی جس کا آمنہ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ عورت کے آنسو کامیاب ترین حربہ سہی' مگر اس ہتھیار سے اگر عورت ہی پر وار کیا جاتا ہے تو صرف بیکار ثابت نہیں ہوتا ہے بلکہ ذلت کا سامان بھی پیدا

کرتا ہے۔ چنانچہ آمنہ کے کوسنے میں لحہ لحہ تیزی اور گرمی آتی جا رہی تھی' اور وہ بڑی بیبا کی سے ہمارے ایمان پر' ہمارے آباواجداد کی لاشوں پر جھاڑو پھیرے جا رہی ہے۔

بہت دیر کی منت سماجت کی بعد آمنہ اور اس کے شوہر کو اس بات کے لیے راضی کیا کہ آئندہ ماہ جب بونس ملے گا تو میں انہیں پہلی فرصت میں ایک سونے کی انگوٹھی بنوادوں گا۔

خدا خدا کر کے انہیں رخصت کیا۔ اب سعیدہ کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ میں نے بڑی پیار سے اس کی تھوڑی کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا:

''ان آنکھوں سے مجھے زندگی کی چھاؤں والی راحت ملا کرتی ہے۔ انہیں کیوں بہا دینے پر تلی ہو؟'' سعیدہ کچھ نہیں بولتی' بدستور آنکھوں سے آنسو گرانے لگتی ہے۔

آنکھیں' آنکھیں...... ہائے سعیدہ کی آنکھیں۔

لیکن ......لیکن ......

لیکن سعیدہ' صرف آنکھیں ہی تو نہیں وہ ایک دل بھی تو ہے جو بے ایمان بھی ہو سکتا ہے' جو امانت میں خیانت بھی کر سکتا ہے...... میں الجھنے لگتا ہوں۔ حالات انسان کو گرا سکتے ہیں۔ سعیدہ گر بھی سکتی ہے لیکن اس سعیدہ کا کیا قصور۔ رحیم نے ایک دوہے میں سچ ہی کہا ہے کہ دھتورا اور سونا اگرچہ دونوں میں نشہ ہے مگر دھتورے کے پینے کے بعد نشہ چڑھتا ہے تو سونا صرف چھو دینے سے ہی آدمی مدہوش ہو جاتا ہے۔ پھر آج تک میں اس کے اصرار کے باوجود بھی کبھی کوئی زیور لا کر نہیں دیا۔ آخر اس میں سعیدہ کی کیا خطا؟ لیکن ......لیکن ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔ میں خود اپنے آپ کو کمینہ محسوس کرنے لگتا ہوں' کچھ بھی ہو سعیدہ میری بیوی ہے۔ رفیقِ زندگی ہے۔ اپنی رفیقِ زندگی کی ذات سے یہ بے اعتمادی...... پھر میں کس طرح کہہ سکتا ہوں کہ انگوٹھی سعیدہ ہی نے رکھ لی ہے۔ وہ واقعی کھو بھی سکتی ہے...... میں نے اپنے آپ پر جبر کیا۔ وہ خیالات جو دماغ میں دھواں سا پھیلا رہے تھے انہیں دبانا چاہا......

لیکن شام تک وہ انگوٹھی مل گئی۔

خوشی سے جھومتی ہوئی مسکراتی سعیدہ انگوٹھی لیے میرے پاس آئی۔

''دیکھئے انگوٹھی مل گئی۔ صندوق کے دراز کے کونے میں رہ گئی تھی۔''

''مل گئی شکر ہے رب العالمین تیرا'' میں بولا۔

ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد اس نے گردن جھکا کر آہستہ سے کہا:

''میں بھی کتنی گنہگار ہوں۔ سوچ رہی تھی انگوٹھی کہیں آپ نے نہ رکھی لی ہو......''

اقبال مجید

ایک حلفیہ بیان

میں مقدس کتابوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھاتا ہوں کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ سچ سچ بیان کروں گا۔

اُس سچائی میں آپ کو شریک کرلوں گا جو صرف سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔

یہ ایک رات کی بات ہے۔

یہ ایک اندھیری سنسان برسات کی رات کی بات ہے۔

یہ ایک ایسی رات کی بات ہے جب میں اکیلا اپنے بستر پر لیٹا تھا اور دیوار پر ٹیوب لائٹ جل رہی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند تھا' روشن دان کھلا تھا' بارش کا موسم تھا' ٹیوب لائٹ پر بہت چھوٹے چھوٹے کیڑے رینگ رہے تھے۔ یقیناً یہ برساتی کیڑے تھے۔ تب ہی میرے سر کے اوپر سے مسہری اور کمرے کی چھت کے درمیان فضا میں بھنبھناہٹ کی آواز کے ساتھ کسی کے گرنے کی آواز ــــ یہ اتنی واضح تھی کہ میرا دھیان اُس کی طرف چلا گیا۔

کیا گرا تھاــــ؟ آپ ضرور یہ سوال کریں گے؟

اگر میں چاہوں تو اس سوال کا جواب دینے سے آپ کو دوسری باتوں میں کافی دیر الجھائے رکھ سکتا ہوں لیکن آپ خود پہلے سے بہت الجھے ہوئے ہیں اور وقت کم ہے اور صبر و تحمل سے آپ سب گھبراتے ہیں اور فوراً اصل معاملات تک پہنچنے کی آپ میں ظالمانہ حد تک عادت پڑ چکی ہے اور یہ کہ آپ کو جزئیات سے نہیں اصل سے دلچسپی زیادہ ہے اور یہ بھی کہ سچائی کو آپ دوٹوک ہی پسند کرتے ہیں اس لیے......

......اس لیے میں تمام تہذیبوں اور قوموں اور انسانی برادریوں کے تمام تر خداؤں کو حاضر و ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہ آپ کو صحیح اور ٹھیک ٹھیک بتا دوں گا۔

یہ ایک رات کی بات ہے۔

یہ ایک اندھیری سنسان برسات کی رات کی بات ہے۔

یہ ایک ایسی رات کی بات ہے جب میں فرش پر کسی چیز کے گرنے کی آواز سن کر اس کی طرف مخاطب ہو گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مسہری کے قریب بس مشکل سے ایک میٹر دور ایک کالے رنگ کا بدہیئت' بدشکل' بدرو' بدقماش' بدنظر' بدطینت کیڑا پیٹھ کے بل الٹا پڑا ہوا تھا۔ اس کیڑے کے موٹے' بھدے اور گول گول سے چھوٹے سے جسم پر غالباً دو پر بھی تھے چھوٹے سے باریک دو پر۔ ان پروں کی لمبائی اس کے ڈیل ڈول کو دیکھتے ہوئے بہت ہی چھوٹی تھی۔ اس کی کئی ٹانگیں تھیں' چار بھی ہو سکتی تھیں یا چھ بھی انہیں گنا اس لیے نہیں جا سکتا تھا کہ وہ انہیں برابر چلائے جا رہا تھا پیٹھ کے بل فرش پر پڑا ہوا وہ برابر اپنے پیر چلائے جا رہا تھا۔ میں اسے چپ چاپ مسہری پر لیٹے لیٹے دیکھتا رہا۔

چکنا فرش

کیڑے کی پیٹھ بھی شاید چکنی تھی۔

☆☆☆

کیا آپ جانتے ہیں کہ پھر کیا ہوا؟

آپ میں سے بہت سے نہیں بھی جانتے ہوں گے۔

ٹانگیں بیحد باریک' بھدا جسم اور اس پر جسم کا خاصا وزن' بس وہ ٹانگیں چلائے جا رہا تھا۔

دو منٹ' پانچ منٹ' دس منٹ' وہ مستقل اپنے کو پلٹنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

دراصل یہ ایک کوشش کی بات ہے۔

یہ ایک لگاتار' ایک ہی جگہ پڑ کر چکنے فرش سے بے نیاز ہو کر کی جانے والی کوشش کی بات ہے۔

یہ ایک اندھیری بے معنی رات میں ایک بے مقصد کوشش کی بات ہے۔

جب پیٹھ چکنی ہو۔

فرش چکنا ہو۔

پر چھوٹے ہوں

ٹانگیں باریک ہوں

اور ان کی دسترس میں فضا تو ہو زمین نہ ہو۔

(ریپیٹ)

اور ان کی دسترس میں فضا تو ہو زمین نہ ہو۔

اس کے بعد پھر ایک عجیب بات ہوئی۔

کیا بات ہوئی —؟ آپ سوال ضرور کریں گے۔

اگر میں چاہوں تو آپ کے اس سوال کو پس پشت ڈال کر آپ کو بہت دیر تک دیگر

معاملات میں الجھا سکتا ہوں کیونکہ اب مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ کی دلچسپی اس کیڑے میں کچھ بڑھ گئی۔ کیونکہ اس طرح کے کیڑے آپ نے بھی ضرور دیکھے ہوں گے جو ایک بار پیٹھ کے بل الٹ جائیں تو پھر سیدھے نہیں ہو پاتے اس لیے......

اس لیے میں انسان کے خون میں دوڑتے ہوئے ایسے تمام سرچشموں کی قسم کھا کر کہتا ہوں جو اُس میں تجسس' استعجاب' حیرت اور مزکشائی کے لمحات جگاتے ہیں اور میں اُن آسمانی طاقتوں کو حاضر و ناظر جان کر اپنا بیان آگے بڑھاتا ہوں جو طاقتیں ہر ذی روح میں جبر برداشت کرنے کی صلاحیتیں بخشتی ہیں جو اُسے وسوسوں اور اندیشوں کی کالی برسات جیسی راتوں میں چپکا پڑا رہنے پر مجبور کر دیتی ہیں ـــ میں نے دیکھا کہ وہ کیڑا برابر' رُکے بغیر اپنی ٹانگیں فضا میں اُچھال رہا تھا۔ اپنے پروں کو بھی نیچے سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اس کی یہ کوشش دیکھتے ہوئے اب لگ بھگ ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ سب کچھ بھول کر میں اُسے دیکھ رہا تھا کہ یکایک مجھے خیال آیا۔

یہ حرامزادہ بدعقل اور بدروح ہے

یہ کمینہ اپنے آس پاس کی دنیا سے اب بھی واقف نہیں۔

یہ ذلیل یہ بھی نہیں جانتا کہ یہ اس کمرے میں اکیلا نہیں ہے۔

اگر اس خبیث کو یہ احساس ہو جائے کہ یہ غیر محفوظ ہے اور جتنی جلد ممکن ہو اس کو موجودہ صورتحال سے چھٹکارا پا لینا چاہیے تو شاید یہ کچھ اور تدبیر کرے' شاید اپنے کو سیدھا الٹ لینے کے لیے کچھ اور جتن کرے' شاید یہ خوف زدہ ہو کر اپنی کوشش کو اس قدر تیز کر دے کہ اُس کے سیدھے ہو جانے کا کوئی راستہ نکل آئے لیکن یہ تب ہی ممکن تھا جب وہ خائف ہو جائے' اس کو یہ احساس ہو جائے کہ وہاں اس کے قریب یا آس پاس کچھ اور بھی ایسی چیز ہے جس سے اس کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔

یہ سوچ کر میں مسہری پر سے اترا' اس کے قریب گیا اپنا داہنا پیر اُس کے پاس لایا۔

اور پھر اُس کے قریب ہی زمین پر پیر کو دو ایک بار تھپتھپایا۔ تب ہی ایک عجیب بات ہوئی۔

میرا خیال ہے کہ وہ بات مجھے آپ کو بغیر کسی بکواس کے بتا دینا چاہیے اس لیے......

......اس لیے میں دنیا کے تمام کمزور و نحیف لاچار مجبور اور نادار انسانوں کی قسم کھا کر اور انہیں حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے وہ سچ سچ بتاؤں گا۔ میرا سچ نہیں بلکہ آپ کا بھی سچ ہو گا۔ کیونکہ اب جو کچھ میں آپ کو بتانے جا رہا ہوں وہ مجھے پوری امید ہے کہ آپ نے بھی دیکھا ہے اس لیے......

اس لیے میں ان سارے تجربوں' محسوسات اور انسانی تجربوں' محسوسات اور انسانی

رویوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں جو میرے ہی نہیں بلکہ آپ کے بھی تجربے' محسوسات اور رویے ہیں کہ میرے پیر کی دھمک کی آواز سے اُس کیڑے پر ایک عجیب اثر ہوا۔ وہ یکا یک جیسے بے سدھ ہو گیا۔ اُس کی ٹانگیں چلنا بند ہو گئیں اور وہ بالکل بے حرکت اس طرح بن گیا جیسے اُس میں جان ہی نہ ہوں۔

دراصل یہ ایک بے سُدھ اور اپنے کو مردہ ظاہر کر دینے والے کیڑے کی بات ہے۔

کسی باہری خوف کے تحت اپنے کو پرسکوت' پُر امن اور Ineffective ظاہر کر دینے والے ایک وجود کی بات ہے۔

وہ بات جو ایک برسات کی رات سے شروع ہوئی۔

جو ایک اندھیری سنسان رات میں ایک الٹے پڑے ہوئے کیڑے کی کہانی بن گئی۔

جو اس کیڑے کو ذرا سے باہری خوف کے سبب مردہ بن کر پڑے رہنے کا ناٹک سکھا گئی اس لیے......

......اس لیے میں تاریخ کے ان سارے معزول' شکست خوردہ' ہزیمت یافتہ' بدنصیب' پٹے اور ہارے ہوئے ظل سبحانیوں' عالیجاہوں' راجوں مہاراجوں' شمشیر زنوں اور فوجی جرنیلوں کی قبروں اور سمادھیوں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھتا ہوں کہ اُس برساتی کیڑے کا وہ ناٹک دیکھ کر مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے اس کو ایک ٹھوکر ماردی' ٹھوکر سے وہ تقریباً چند فٹ دور پھسلتا چلا گیا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سوڈے کی بوتل کا ڈھکن ہو' اسی طرح بے جان' بے حرکت وہ پڑا رہا جیسے سمجھنا چاہ رہا ہو۔

''یار تم کس چکر میں — میں بھی کوڑا کرکٹ ہوں — اپنا کام کرو یار اپنا کام۔''

وہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اب کمرے کی دیوار اُس سے ایک آدھ فٹ ہی دور تھی۔ میں پھر اُس کے قریب گیا۔ پیر سے اُس کو پھر ادھر ادھر کیا وہ ہر بار اس طرح بے حس و حرکت چپ چاپ ٹھوکر سے اِدھر اُدھر ہوتا رہا۔ آخری کو میں مسہری پر آ کر لیٹ رہا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد مجھے پھر اس کا خیال آیا۔ دیکھا تو پھر جلدی جلدی وہ اپنی ٹانگیں چلا رہا تھا۔

میں نے پھر اُس کو باہری خطرے سے پیر تھپتھپا کر آگاہ کیا۔ وہ پھر مردہ بن گیا۔

ایک گھنٹے بعد وہ پھر پیر چلا رہا تھا۔

میں نے پھر اُس کو احساس دلایا باہر خطرہ ہے' وہ دَم سادھ گیا۔

تو ہوا یہ کہ یا تو اُس کے پیر بہت تیز چلتے تھے یا ساکت ہو جاتے تھے۔ پیٹھ جہاں تھی وہیں تھی اور اس لیے......

...... اس لیے میں دنیا کے ان سارے اداکاروں' اسکار موڑوں' نقالوں' بازیگروں' بہروپیوں' بھانڈوں' نٹوں اور کرتب بازوں کے بین الاقوامی تماشوں' اداکاریوں اور کھیلوں کی قسم کھا کر

کہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور وہی کچھ آپ بھی دیکھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں لیکن اُسے بیان نہیں کر پاتے ہیں' اُس کو بیان کر دوں گا اور ایک لفظ جھوٹ نہیں بولوں گا۔

صبح جب میری آنکھ کھلی' وہ کیڑا مجھ کو اسی جگہ ملا۔ اس کے پیر اسی طرح فضا میں تیزی کے ساتھ چل رہے تھے۔ وہ اُسی طرح پیٹھ کے بل پڑا ہوا تھا۔ پھر اس کے بعد ایک عجیب بات ہوگئی۔

کیا بات ہوئی؟ — میرے خیال میں اب آپ یہ سوال نہیں کریں گے کیونکہ ایسی حالت میں کوئی عجیب بات نہیں ہوسکتی۔

کیونکہ یہ ساری بات ایک اندھیری بے معنی رات میں ایک ایسی بے حصول کوشش کی بات ہے جب کہ پیٹھ چکنی ہو' فرش چکنا ہو' پر چھوٹے ہوں' ٹانگیں باریک ہوں اور ان کی دسترس میں زمین نہ ہو اس لیے ...... اس لیے میں یونان کی عظیم المیہ داستانوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جن میں ظالم بھی اُتنا ہی لائق احترام ہے کہ جتنا مظلوم کیونکہ ٹریجڈی وہی ہے جس میں کسی کے لیے کوئی راہِ فرار نہ ہو۔ جہاں پیٹھ بھی بے قصور ہو اور فرش بھی اس لیے میں ان ساری حکایتوں کی قسم کھاتا ہوں کہ جن میں انسان اپنے درد اور اپنی محرومیوں اور ناکامیوں کو سینے سے لگائے تڑپتا رہا اس لیے کہ میلوڈرا کی گنجائش نہ تھی کیونکہ فرار کی کوئی راہ نہ تھی۔ اس لیے میں صرف اتنا ہی آپ کو بتاؤں گا کہ جو سچ ہے اور سچ کے سوا کچھ نہیں۔

❀ ❀ ❀

جنگل

سرائے میں یہ اس کی آخری رات تھی۔ رات کا تیسرا پہر تھا۔
باہر بارش کا زور ابھی کم نہیں ہوا تھا۔
اندر الاؤ کے گرد ہم سب جمع تھے۔ میں' وہ' مادام مردول اور میگھ دوت
''تو تم کل جا رہے ہو؟'' ہم نے پوچھا۔
''ہاں'' اس نے کہا۔
''لیکن اس کے آگے تم کہاں جاؤ گے؟ آگے تو جنگل ہے۔'' میں نے کہا۔
''اور یہ سرائے اس بستی کی آخری آماجگاہ ہے۔'' میگھ دوت نے کہا۔
''شاید۔'' وہ بولا۔
''اور اس جنگل میں کوئی پگڈنڈی نہیں۔'' میں نے کہا۔
''اور جو بھی اس جنگل میں گیا۔ لوٹ کر واپس نہیں آیا۔'' مادام مردول بولی۔
''لوگ کہتے ہیں بڑا بھیانک جنگل ہے۔''
''کتنا بھیانک؟'' اس نے کہا: ''اس سے بھی زیادہ جو میں پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔''
''تم کس جنگل کی بات کر رہے ہو؟'' میگھ دوت نے پوچھا۔
''جس میں اس درندے نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ اور میں نے اس کی ہتیا کر دی تھی۔''
اس نے ہماری طرف چیرتی ہوئی نگاہ ڈالی۔
''میگھ دوت تم بتاؤ۔ تم یہاں کیوں آئے ہو۔'' اس نے میگھ دوت کی طرف ایسی نگاہ ڈالی۔ جیسے میگھ دوت نہیں کوئی کاغذی پیرہن ہے۔
''ایسے ہی۔ بس یونہی۔'' کوئی فرار نہ کوئی کشش۔''
''فرار تو ہے اور کشش بھی۔'' میگھ دوت نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
''ایسا ہے فقیر علی۔'' میگھ دوت نے کہنا شروع کیا۔ ہم اسے فقیر علی کہتے تھے حالانکہ اس نے اپنا نام رام سرن دوبے بتایا تھا۔

''جب دلّی میں شدید گرمی پڑتی ہے اور میرے اسٹوڈیو میں ماڈل کے برہنہ بدن سے پسینے کی بوندیں ٹپ ٹپ گرنے لگتی ہیں اور میں پیاس سے بے حال ہوجاتا ہوں۔ تم جانتے ہو میرا اسٹوڈیو اندھا مغل میں ہے جہاں بجلی کے پنکھے تو ہیں۔ ایئر کنڈیشنڈ نہیں۔ اور گرمیوں میں دن کو اکثر بجلی چلی جاتی ہے۔'' میگھ دوت کہہ رہا تھا۔

''بس تم گرمی سے بھاگتے ہو۔ یا اس ماڈل سے یا اپنے آپ سے۔'' اس نے میگھ دوت کو پھر تیکھی نظروں سے دیکھا۔

اس نے الاؤ میں ایک لکڑی اور ڈال دی۔ ہلکا سا دھواں اٹھا اور پھر شعلہ سا بھڑکا۔ دیوار پر لپکتے ہوئے شعلوں کے سائے میں ہماری پرچھائیاں کسی چھایا ناٹک کی طرح حرکت میں تھیں۔

میگھ دوت تم شاید گرمی یا اس ماڈل سے بھاگ کر آئے ہو جس کی تصویر کشی کرتے کرتے وہ تمہیں یاد آجاتی ہے۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟

''راگنی!'' میگھ دوت نے کہا۔

''ہاں! راگنی۔ اور تم نے ایک شعر پڑھا تھا۔ بہت دیر تک جسم جلتا رہا' کہ شعلہ سا کچھ اپنی بانہوں میں تھا۔'' پھر راگنی کا کیا ہوا؟ ہاں میں نے بتایا تھا کہ اسے وومن لب لے اڑی۔ اور پھر وہ زمین پر واپس نہیں لوٹی۔'' وہ یعنی رام سرن دوبے عرف فقیر علی لگاتار بولے جارہا تھا۔ ہم سب خاموش تھے۔ میگھ دوت نے اپنے گرد چادر اور پھیلا کر لپیٹ لی تھی۔

''لیکن فقیر علی تم کہہ رہے تھے...... کہ......'' میں نے کہا۔

''ہاں! میں کہہ رہا تھا کہ میں نے اسے قتل کردیا۔ میں مجرم تو نہیں مفرور ضرور ہوں۔'' اس نے کہا۔

''لیکن یہ سب کیسے ہوا؟'' مادام مردول نے پوچھا۔

''بس یونہی! ایک روز بہت رات گئے وہ واپس لوٹا میں بڑی دیر سے اس کا انتظار کررہا تھا۔ جب وہ آیا تو نشے میں دھت تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ قمیص کا کالر کھلا ہوا۔ اور ٹائی کی گرہ ڈھیلی۔ اس نے آتے ہی اسٹیریو چلا دیا۔ ڈسکو سنگیت بہت پرشور تھا۔ باہر لان میں چاندنی ہری ہری گھاس سے لپٹ رہی تھی۔''

''ہاں! ہاں بالکل ایسے ہی تھا۔'' مادام مردول جیسے ایک دم خواب سے چونک پڑی ہو۔'' رات بہت بیت گئی تھی۔ میں نہ جانے کب سے اس کا انتظار کررہی تھی۔ وہ آیا نشے میں ڈوبا ہوا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ قمیص کا کالر کھلا ہوا تھا۔ اور ٹائی کی گرہ ڈھیلی۔ اس نے آتے ہی اسٹیریو آن کردیا۔ ڈسکو سنگیت بہت پرشور تھا۔ باہر چاندنی ہری ہری گھاس سے لپٹ رہی تھی۔''

''اور......اور پھر......'' فقیر علی جنون میں بولا۔

''اور وہ دھڑام سے صوفے پر گرا۔'' مادام مردول نے کہا: ''وہ صوفے کے اندر دھنس گیا۔ جیسے وہ جسم نہیں کپڑے کی کوئی گٹھری ہو بے حس' بے آواز' بے حرکت' بے رنگ' بے بو' بے رس۔''

''اور وہ بے مزہ۔'' وہ چلایا۔

''ہاں اور بے مزہ۔'' مادام مردول نے کہا: ''میں نے روشنی گل کر دی۔ ایک دم اندھیرا ہوا۔ اور پھر ایک دم چاندنی جیسے سیلاب سی کمرے میں اُمڈ آئی ہو۔ اور میرے جسم کو انتر گھٹ تک شرابور کر گئی ہو۔ اتنی شتیل' اتنی نرم' اتنی روشن اور میں اس کمرے سے باہر نکل بھاگی۔ اور ہری ہری گھاس پر ننگے پاؤں چلنے لگی۔ میرے جسم پر شب خوابی کا لباس تھا اور میں نے سوچا کاش یہ بھی نہ ہوتا۔ کاش یہ جسم ہی نہ ہوتا۔'' صرف چاندنی ہوتی'' ......فقیر علی نے کہا...... ''اور......تم۔تم جو چاندنی میں تحلیل ہو چکی تھیں۔''

سرائے والا قہوے کے پیالے رکھ گیا تھا۔ سماور میں پانی ڈال دیا گیا تھا۔ قہوے کا دھواں گالوں کو چھو کر جسم کے مساموں میں داخل ہو رہا تھا۔

''کتنی عجیب بات ہے فقیرے۔'' اس نے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''ایک مادام مردول ہے جو شیتل نرم اور روشن چاندنی میں نہانے یہاں آئی ہے اور ایک میگھ دوت ہے جو شدتِ گرمی کا شکار ہے۔ اور۔

''تم نے میرا نام لیا فقیر علی۔'' میگھ دوت جیسے نیند سے چونک کر جاگ اٹھا ہو۔

''تم کہہ رہے تھے تم نے اس آدمی کا قتل کر دیا۔'' میگھ دوت ابھی وہیں تھا۔ جہاں سے داستان شروع ہوئی تھی۔

''ہاں' ہاں جب بھی اس حادثے کا ذکر آتا ہے تم گول کر جاتے ہو۔'' میں نے کہا: ''کیا تمہیں پولیس کا ڈر ہے؟''

''نہیں یار! ڈر کس بات کا؟ میرے ہاتھ کون سے خون سے رنگے ہیں۔ میں نے تو صرف اس کی ڈھیلی ٹائی کو کس دیا۔ ذرا زیادہ کس گئی۔ سانس رک گئی اور وہ مر گیا۔ یہ بھی کوئی مرنا ہوا۔ اسے تم قتل کہتے ہو۔ وہی جو مادام مردول کہتی تھی بس وہی ہوا۔'' بے حس' بے آواز' بے حرکت' بے رنگ' بے بو' بے رس......''

''اور بے مزہ'' ہم سب یک زبان بولے۔

''ہاں! اور بے مزہ'' اس نے کہنا شروع کیا: ''میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ سب اسکائی اسکریپر ہائی رائز بلڈنگس زمین دوز ہوگئی تھیں۔ سڑکیں بالکل خالی تھیں۔ فراٹے بھرتی ہوئی موٹروں' بسوں کا شور بند' بھاگتے دوڑتے' گرتے پڑتے لوگ جیسے ایک دم ساکت ہو گئے۔ پرندے پہاڑوں کی طرف اڑ گئے۔ ٹریفک جزیرے پر ایک ننگی تلوار الف تھی پتھر کا شہر صحرا میں بدل گیا تھا۔''

میں نے دونوں بانہیں آکاش میں پھیلا دیں اور وہ ناآسودہ ہی واپس لوٹ آئیں۔ میں بالکل تنہا ہوگیا تھا۔ میرا جسم بھی شکستہ ہوکر زمین پر آ گرا— میں نے اپنے آپ کو چھوا۔ یہ میں ہی ہوں نا۔ مجھ سے میرا نام' میرا چہرہ' میری پہچان سب چھن گئی تھی۔ اور جب میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا۔ معلوم ہے کیا دیکھا۔'' وہ تھوڑی دیر رک کر بولا۔

''کیا دیکھا؟'' ہم سب نے ایک آواز ہوکر پوچھا۔

''میرا جسم جنگل بن چکا تھا۔ اس کے اندر جنگل تھا۔ اور— اور— وہ خاموش ہوگیا۔ پھر بولا۔''ہاں میں نے ایک دن اخبار میں پڑھا کہ امریکہ سے آئے ایک ہندوستانی ماہر آثار قدیمہ نے مدھیہ پردیش میں پہاڑ گڑھ کے غاروں میں مصوری کے ایسے نمونے دریافت کیے ہیں جو 23000 قبل مسیح کے بتائے جاتے ہیں۔ ویشنومت' شومت' تانترک' ودیا— سورج کی پرستش کے آٹھوں طریقے۔ سب کچھ ان تصویروں میں موجود ہے۔ ایک ایسا رسم الخط جو تصویر کشی کا رنگ لیے ہوئے ہے اور زبان جس کے اسرار کھلنے ابھی باقی ہیں۔ جانتے ہو یہ غاریں کہاں ہیں؟ اس ندی کے کنارے ایک گاؤں کے پاس گھنے جنگل میں۔ جس کے نزدیک خونخوار ڈاکوؤں کی پناہ گاہیں ہیں۔ غاروں کی دیواروں پر چمکیلے' لال نیلے' ہرے' پیلے' قرمزی رنگوں کی تصویریں ہیں۔ انسان کی شبیہیں' جانوروں کے چہرے پیڑ پودوں کے روپ' سورج اور چاند کی شکلیں۔ لوگ کہتے ہیں یہاں غیر مرئی روحیں اور بھوت پریت اپنے نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ جنہیں تم تصویریں کہتے ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے ان کی آوازیں سنی ہیں۔'' اور جانتے ہو ان غاروں میں آدمی کب سے رہ رہا تھا۔ ایک لاکھ برس قبل مسیح سے۔''

''ایک لاکھ قبل مسیح۔'' ہم چونکے۔

''ہاں ایک لاکھ قبل مسیح۔''

اس کی آواز گہری ہوتی جارہی تھی۔ ہم نے محسوس کیا جیسے وہ بہت دور سے بول رہا ہو۔ بہت دور سے صدیوں کی دوری سے وہ کہہ رہا تھا۔

''میں کب سے سفر میں ہوں۔ ایک انت ہین یاترا میں۔ کئی صدیوں کا فاصلہ طے کر چکا ہوں۔ میں جنگل میں پیدا ہوا تھا۔ وہیں بڑا ہوا' جوان' خوبرو' حساس' وہیں میری موت ہوئی۔ اور جب میں نے دوبارہ جنم لیا' بالغ ہوا تو میں نے خود ایک جنگل بنایا۔ لیکن یہ وہ جنگل نہیں تھا جس میں' میں جوان' خوبرو' حساس ہوا تھا۔ وہ جنگل تھا جس میں' میں روسیاہ اور بے حس ہوگیا۔ اور پھر میں نے۔''

''اور پھر تم نے اس آدمی کی ہتیا کردی۔'' ہم سب نے کہا۔

''یارو! کیا بار بار اس آدمی کی ہتیا کردی۔'' ہم سب نے کہا۔

''یارو! کیا بار بار اس آدمی کی ہتیا کی رامائن چھیڑ دیتے ہو۔ ہتیا ہونی تھی ہوگئی۔'' اس نے

بے پروائی سے کہا۔

ہم سب خاموش خاموش ہوگئے۔ ہم قریب قریب اونگھنے لگے۔ ہم پر نیند طاری ہورہی تھی۔ الاؤ کی آگ مدھم پڑنے لگی۔ بارش شاید تھم گئی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا اور سرائے تھی کہ آسیب زدہ روحوں کا مسکن وہ دھیرے دھیرے بولے جارہا تھا: ''یاروں جنگل کی بھی کیا بات ہے!''

ہم سو گئے۔ جب صبح اٹھے تو وہ نہیں تھا۔ سورج کی ایک ہلکی سی کرن سہمے سہمے قدموں سے کمرے میں داخل ہورہی تھی۔ سرائے والا قہوے کے پیالے ہمارے سرہانے رکھ گیا تھا۔ اور وہ سامنے دیوار پر ایک ٹک دیکھے جارہا تھا۔ سامنے دیوار پر بڑے بڑے حروف میں کوئلے سے لکھا تھا:

''رہے نام اللہ کا——''

❀ ❀ ❀

احمد یوسف

بلب ایک گزرگاہ کا

ایک طرف گلی کوئی چالیس پچاس گز کا سفر طے کرنے کے بعد ایک نسبتاً کشادہ سی گلی میں جا ملتی تھی تو دوسری طرف ساٹھ ستر گز کے فاصلے کے بعد میونسپل کارپوریشن کے لیمپ پوسٹ سے دو چار قدم پرے اس گلی سے کئی ایک گلیاں پھوٹتی تھیں۔

اور جس مقام کا یہ ذکر ہے وہاں رات کو ایسا گہرا اندھیرا چھا جاتا تھا کہ آنے جانے والے کبھی ایک کچے گھر کے آگے بنے چہ بچہ میں گر جاتے' اور کبھی بہت احتیاط سے چلنے کے باوجود اس عقرب نما گڑھے میں پاؤں ڈال دیتے' جس میں نالی کا زائد پانی ہمہ وقت جما رہتا۔ اس عقرب نما گڑھے کو گلی کے لڑکے جھیل کہا کرتے اور اکثر چھوٹے بچے کھیلتے اس میں کاغذ کی ناؤ چھوڑ دیتے۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ ایک عورت کی چپل اس گدلے پانی میں چلی گئی تو اس نے زور زور سے دہائی دی کہ کوئی اللہ کا بندہ اسے روشنی دکھاتا۔

قریب ترین گھر کا مالک کہ خدا ترس آدمی تھا' اس کی آواز سن کر ٹارچ لیے گھر سے باہر نکلا۔ ٹارچ کی روشنی میں عورت نے اپنی چپل برآمد کی' اور پھر اس کے گھر میں جا کر اپنے پاؤں دھوئے' چپل دھوئی اور یوں اسے دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوگئی۔

اس واقعہ کا اس شخص پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے دوسرے ہی دن اپنی دیوار میں چھید کر کے گلی کی سمت بجلی کا تار اور ہولڈر لگایا اور اس میں ایک بلب فٹ کر دیا۔

کچھ دنوں تک وہ بلب ___ روشن بلب راتوں میں خیر جاریہ بنا رہا۔ گلی میں آنے جانے والے اوبڑکھابڑ راستے' نالی' چہ بچہ اور عقرب نما جھیل کے گدلے پانی سے محفوظ رہے۔ اس طرح گلی کے باسیوں اور دوسرے راہگیروں نے سکھ چین کی سانس لی۔

لیکن ایک دن شام ڈھلے جب اس نے گلی کے بلب کا سوئچ آن کیا تو اسے دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ گلی میں روشنی کا کوئی کوندا نہیں لپکا۔

وہ تقریباً دوڑتا ہوا گھر سے باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ ہولڈر کی گردن سے بلب غائب تھا۔ اسے یہ سوچ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اتنی معمولی چیز کون چرا لے گیا۔ لیکن دوسری ہی ساعت اسے

خیال آیا کہ ممکن ہے بلب ہولڈر میں پوری طرح فٹ نہ ہوا ہو اور دن کے کسی اوقات میں نیچے گر کر ٹوٹ گیا ہو۔

اُس نے نیچے جھک کے دیکھا لیکن پھر اپنی نادانی پر خود ہی پشیمان ہوا تھا کہ بلب کے بیشتر اجزاء کو تو آنے جانے والوں کے قدم کب کے روند گئے ہوں گے' ممکن ہے کچھ اجزاء نالی میں بہہ گئے ہوں۔ پھر وہ آخر وہاں کیا ڈھونڈ رہا ہے۔

وہ اس خیال کے آتے ہی انگنائی کا وہ بلب جو ایک فاضل بلب کی حیثیت رکھتا تھا' نکال لایا اور اسے اس نے ہولڈر میں فٹ کر دیا۔

کسی راہ گیر کے استفسار پر جب اس نے بتایا کہ پہلا بلب غالباً گر کر ٹوٹ چکا ہے اور اب وہ دوسرا لگا رہا ہے تو راہگیر نے اس پر ایک تعریفی جملہ اچھال دیا۔

—''بھائی صاحب نیکی کی راہ میں بھی آج کل بڑے جھمیلے ہیں—''

مکان کا مالک آہستہ سے سر ہلا کر اظہار تشکر بجالایا اور یوں گلی میں ایک دوسرے بلب کی روشنی کا دور شروع ہو گیا۔

چلتے چلتے مالک مکان نے بلب کی ہر دو کیل کو اچھی طرح دیکھ لیا' جو ہولڈر کے خانوں میں پوری طرح پیوست تھیں۔ اتنا کچھ دیکھنے بھالنے کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ بلب اب گرنے والا نہیں ہے۔

لوگ راتوں میں بلاخوف وخطر گلی میں آنے جانے لگے۔ روشنی چونکہ روشنی تھی' اس لیے وہ اپنا حصار توڑ کر خاصی دور تک چلی جاتی' اور دونوں رخ کا بڑا علاقہ اپنے قبضے میں لے لیتی۔

آس پاس کے لوگ خوش تھے کہ اس مقام پر بلب لگ جانے سے رات کے وقت گلی کی راہ طے کرنے میں بڑا آرام ہو گیا' ورنہ بلب لگنے سے پہلے آئے دن کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا حادثہ ہوتا ہی رہتا تھا۔

مالک مکان بھی کہ جس نے اپنی دیوار پر بلب آویزاں کیا تھا' بے حد خوش تھا کہ اس کے ایک چھوٹے سے ایثار سے خلق خدا کو آرام ملا اور ایک عرصے سے کوئی واردات سننے میں نہیں آئی۔

اسی دوران بلب ایک بار پھر غائب ہو گیا۔ بلب والے شخص نے سوچا' اس بار تو بلب کے گرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ کیونکہ اس نے اچھی طرح سے بلب کی کیلوں کو چیک کر لیا تھا۔ اس بار تو یقینی بلب چوری ہو گیا ہے۔

یہ سوچ کر وہ اڑوس پڑوس کے لوگوں کے پاس گیا کہ شاید انہیں بلب کا کچھ علم ہو شاید انہوں نے کسی کو چراتے ہوئے دیکھا ہو' لیکن سبھوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

ظاہر ہے چور اتنا دیدہ دلیر تو تھا نہیں کہ محلے والوں کے سامنے سینہ تان کر بلب کی چوری

کرتا— چوری تو اس نے بہرحال رات کے سناٹے ہی میں کی ہوگی۔

تب پڑوسیوں نے اس گلی میں کھڑے کھڑے ایک رسمی سی ملاقات کی اور صورت حال پر غور و خوض کیا۔

دفتر کے ایک بابو کا خیال تھا کہ 'سل'— وہ پورا نام لینا چاہتے تھے کہ ایک صاحب نے اپنے منہ پر شہادت کی انگلی رکھ کر انہیں روک دیا۔

''بھائی صاحب صرف نام کا پہلا حرف استعمال کیجئے۔ محلے کے سبھی لچے لفنگے' لونڈے لپاڑی تو اپنی نظر میں ہیں' پھر کیا ضروری ہے کہ ہم کسی کا نام لے کر اس سے دشمنی مول لیں۔''

کسی نے تجویز پیش کی کہ اس بلب کا نقصان سبھوں کو مل جل کر برداشت کرنا چاہیے۔

لیکن جس شخص نے اپنی دیوار پر بلب نہیں لگایا۔ پڑوس کے ایک صاحب اپنے یہاں سے بلب لاکر لگانا چاہتے تھے تو اس نے انہیں بھی منع کر دیا۔

''رہنے دیجئے بھائی صاحب' جب لوگ اس کی افادیت کو نہیں سمجھتے تو ہمیں اس دردسری کی کیا ضرورت ہے۔''

اس درمیان گلی میں رات کے اوقات میں دو تین چھوٹی موٹی وارداتیں ہوگئیں۔ ایک صاحب عقرب نما جھیل میں پھسل گئے۔ دوسرے صاحب کسی مکان کے زینے سے ایسے ٹکرائے کہ ان کی ایک پاؤں کی ربر کی چپل کا پٹہ ٹوٹ گیا اور انہیں مجبوراً چپل ہاتھ میں لے کر جانا پڑا۔

ان چھوٹے چھوٹے حادثوں کے بعد مالک مکان نے دیوار پر ایک نیا بلب خرید کر لگا دیا' کیونکہ اب اس کے گھر میں کوئی فاضل بلب نہیں تھا۔

بلب کی خریداری کے بعد اس نے گلی والوں کی چھوٹی سی ٹولی کے سامنے اس بات کا انکشاف کیا کہ اب اس پاور کے بلب کی قیمت ساڑھے تین روپے ہوگئی ہے۔

تب یہ فیصلہ ہوا کہ بلب پر پہرہ بٹھا دیا جائے۔

دو دو تین تین افراد کا گروہ گلی میں رات کے وقت دو دو گھنٹے کی ڈیوٹیاں دینے لگا۔

لیکن جلد یہ لوگ اوب گئے اور یہ سلسلہ زیادہ دنوں نہیں چل سکا۔

''بتاؤ کہ ساڑھے تین روپے کے بلب کے لیے ساری ساری رات برباد کی جائے' ہم پر۔''

لیکن ایک صاحب فہم نے بتایا کہ معاملہ بلب کی قیمت کا نہیں اس کی افادیت کا ہے' وہ ہمیں حادثوں سے بچاتا ہے۔

اور تب ایک آسان صورت بلب کی نگہبانی کی یہ نکالی گئی کہ لوگ گھر بیٹھے دروازوں کے دراروں اور کھڑکیوں سے اسے دیکھتے رہیں۔

دو چار دنوں بعد جب اڑوس پڑوس کے لوگوں سے یہ دریافت کیا گیا کہ وہ راتوں میں گھر بیٹھے بلب کی نگہبانی کرتے ہیں؟ تو وہ محض 'ہاں ہوں' میں ٹال گئے۔ ادھر بلب والے نے بھی صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ رات کے دو چار گھنٹے دروازے سے لگ کر بیٹھنا کسی بھی حال میں ممکن نہیں۔

وہ سب اپنے اپنے دفتر جانے کو کھڑے تھے' اس لیے یہ بات اس سے آگے نہیں بڑھی اور یہ طے ہو گیا کہ وہ شام کو دوبارہ مل کر اس مسئلے پر گفتگو کریں گے۔

لیکن شام تک بلب چوری ہو چکا تھا۔

تمام شہادتوں سے پتہ چلا کہ یہ چوری دن دھاڑے ہوئی ہے' کیونکہ ایک صاحب نے بتایا کہ انہیں اچھی طرح یاد ہے کہ صبح دفتر جانے سے پہلے جب وہ لوگ رات کی کارگزاریوں پر غور و خوض کے لیے گلی میں یکجا ہوئے تھے تو بلب دیوار پر لٹک رہا تھا۔

عام خیال یہ تھا کہ بلب دوپہر میں چوری ہوا ہوگا — گھر والے دفتروں میں رہتے ہیں۔ بچے کھا پی کر سو گئے ہوں گے اور گلی سنسان ہو گئی ہوگی۔

سبھوں کے چہرے اتر گئے۔ اب اس کا ایک جواب ہے کہ تم اگر رات کو پہرہ دو گے تو ہم دن کو چوری کریں گے۔

چور کے پاس آپ کی ہر ترکیب کی کاٹ موجود ہے' ایک صاحب نے اظہار خیال کیا۔

تب ہی بلب والے نے دل شکن لہجے میں کہا:

''بھائیو میں اب اس نیک کام سے باز آیا۔''

لیکن شام جب ایک پڑوسی نے اپنے گھر سے بلب لا کر لگانا چاہا تو وہ بگڑ گیا۔

''یہ کیا بات ہوئی صاحب' دیوار میری اور بلب آپ کا۔ یہ نہیں ہو سکتا' یہ میری توہین ہے۔''

چنانچہ اس نے نہ خود بلب لگایا اور نہ کسی دوسرے کو لگانے دیا۔

اُس رات ایک صاحب جو گلی کے جغرافیہ سے خاصی اچھی واقفیت رکھتے تھے' جب نالی' چہ بچہ اور عقرب نما جھیل سے بچ نکلے تو کوڑے کے اس ڈھیر پر چڑھ گئے' جو ادھر ''تین دنوں سے صفائی کے محکمے کی ہڑتال کے سبب گلی میں لگ گیا تھا۔ ان کے پیر میں چپل تھی' جس کی وجہ سے کوڑے کے ڈھیر پر پڑا ایک شیشے کا ٹکڑا ان کی ایڑی کو لہولہان کر گیا۔ ان کے منہ سے زور کی چیخ نکل گئی۔ پڑوس کے ایک صاحب اپنے گھر سے نکلے اور انہوں نے ان کا زخم دھلا کر مرہم پٹی کر دی۔ وہ بیچارے لنگڑاتے ہوئے اپنے گھر کو چل دیئے۔

اس طرح پیر پھسلنے اور نالی میں گرنے کے بھی دو چار چھوٹے چھوٹے واقعات رونما ہوئے۔

بلب والے نے ان وارداتوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

لیکن تیسرے دن جب ایک کمزور سا راہگیر ایک گھر کے زینے سے ٹکرایا تو اس کا توازن کچھ ایسا بگڑا کہ وہ خودعقرب نما جھیل میں جا گرا۔ چپل کہیں اور گئی اور عینک کہیں اور —— وہ آدمی چونکہ پورے وزن کے ساتھ گرا تھا اس لیے بڑے زور کا دھماکہ ہوا۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔

شور سن کر سبھی لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکل آئے۔ دو ایک کے ہاتھ میں ٹارچ بھی تھی۔ اس غریب کو جب یہ خبر ملی کہ اس کی عینک کی دونوں تال ٹوٹ چکی ہے تو وہ اپنا غم بھول گیا اور 'ہائے میری عینک ہائے میری عینک' کہہ کر چلانے لگا۔

لوگوں نے اسے دلاسا دیا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں دھلائے' اسے پانی پلایا' اور چونکہ عام خیال یہ تھا کہ اسے اب کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہوگا' اس لیے ایک صاحب اس کے گھر تک پہنچا آئے۔

لیکن اس واقعہ کے بعد بلب والے نے سبھوں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ وہ اگلے روز اپنی دیوار پہ ایک نیا بلب لگا دے گا۔

چنانچہ دوسرے دن دفتر سے آئے ہوئے وہ ایک نیا بلب خرید لایا اور اپنی دیوار پر آویزاں کر دیا۔ اب کے اس نے گلی والوں کو بتایا کہ اس بلب میں ایک لاک سسٹم لگا ہے جس سے چور بلب کو توڑ تو سکتا ہے پر اُسے نکال نہیں سکتا۔

امن و آشتی کے دن لوٹ آئے۔

دوسرے دن دفتر جانے سے پہلے کی ملاقات میں ایک پڑوسی نے بتایا کہ رات کسی محلے میں ایک بدمعاش نے ایک شریف راہگیر کو چاقو دکھا کر اس کی گھڑی اور بٹوہ چھین لیا۔

اچانک ان کے اپنے دلوں میں کہیں سے ایک چور گھس آیا۔

''کیا یہاں بھی ایسا ہو سکتا ہے؟''——

تب ہی ان میں سے کسی نے کہا: ''لیکن یہاں تو روشنی ہے۔''

نیا بلب کچھ زیادہ دنوں چل گیا' شاید یوں کہ چور لاک سسٹم کی تکنیک سے واقف نہیں تھا۔

لیکن جب وہ اسے کھولنے کی ترکیب جان گیا تو صبح کی سیر سے لوٹتے ہوئے ایک صاحب نے دیکھا کہ بلب اپنی جگہ سے غائب تھا۔ کوئی گھنٹے بھر میں گلی کے ہر شخص کو یہ معلوم ہو گیا کہ لاک سسٹم والا نیا بلب بھی چوری ہو گیا۔

دفتر جانے سے پہلے وہ ملے' تو ان کے دلوں میں آگ سے لگی تھی۔

''بھائی صاحب ڈیڑھ دو روپے میں بیچ دیتا ہوگا۔''

''یہ کام تو کسی لفنگے ہی کا ہے جو اتنے پیسوں میں سنیما کا ایک ٹکٹ خرید لیتا ہوگا۔
''لیکن اب کیا ہوگا۔''
ایک صاحب نے پرانی تجویز دہرائی:
بلب کے لیے چندہ اکٹھا کیا جائے۔صرف بھائی صاحب پر......' اس نے بلب والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا— ''سارا بار ڈالنا مناسب نہیں۔''
تب بلب والے نے وہی بات کہی جو وہ پہلے بھی کئی بار کہہ چکا تھا۔
''میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ دیوار میری ہے تو بلب بھی میرا ہی ہوگا' لیکن دوستو کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اس اندھیرے کے شاہزادے کو اجالے میں لائیں جس نے ہمارا جینا دوبھر کر دیا ہے۔''
''بلب کا کیا ہے وہ تو ایک نہ ایک دن آ ہی جائے گا۔''

❀ ❀ ❀

عابد سہیل

سب سے چھوٹا غم

اس نے تینوں طرف کی جالیوں میں بندھے ہوئے ہزاروں بلکہ لاکھوں دھاگوں کو دیکھا اوران میں دس سوا دس سال قبل اپنے باندھے ہوئے دھاگے کو تلاش کرنے لگی۔

بائیں طرف والی جالی پر، جس کے باہر گیندے کے پیلے پیلے پھول اور ہار ڈھیر تھے اور بہت سے دیے جل رہے تھے، اس نے اپنے دھاگے کو پہچاننے کی کوشش کی۔ اسے خوب اچھی طرح یاد تھا کہ اس طرف جالی کے بالکل کونے میں اس نے دھاگے میں ایک گرہ لگائی تھی اور پھر دوسری گرہ جاوید نے۔ اسے یہ بھی یاد تھا کہ ابھی اس کی انگلیاں پوری طرح گرہ لگا بھی نہ پائی تھیں کہ جاوید کی انگلیاں وہاں پہنچ گئی تھیں اور انگلیوں کے اس لمس کے بعد جاوید اس کی آنکھوں میں جھانک کر مسکرانے لگا تھا اور شرما کر نیچے دیکھنے لگی تھی۔

لیکن ان کا باندھا ہوا دھاگا کون سا تھا، اس لمحے اسے خیال آیا کہ اس وقت اس جگہ شاید بہت زیادہ بھیڑ تھی اور جاوید نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا تھا اور وہ سامنے والی جالی پر چلی گئی تھی۔ یہ سوچ کر اس نے درمیان والی جالی کا رخ کیا لیکن قدم آگے بڑھانے سے قبل اس نے ایک بار پھر اس جالی پر نظر ڈال لی جیسے وہ اپنا باندھا ہوا دھاگا پہچان ہی تو لے گی۔

دوسری جالی پر پہنچتے پہنچتے اسے ایسا لگا پہلی جالی پر جا کر اس نے غلطی کی تھی اور اسے اس کی یادداشت نے دھوکہ دیا تھا۔ دھگا تو اس نے یہیں باندھا تھا بالکل کونے میں لیکن یہاں بھی لاکھوں دھاگے بندھے تھے۔ کسی میں ایک گرہ تھی، کسی میں دو۔ ان میں اس کا اپنا کون سا تھا؟ اس نے کونے کے دھاگوں پر ہاتھ پھیرا، آہستہ آہستہ جیسے جاوید کے ہاتھوں کے لمس سے وہ اپنے دھاگے کو پہچان ہی تو لے گی۔ لیکن کہیں خواہشوں کی گرمی تھی، کہیں آرزوؤں کی نرمی اور کہیں مایوسیوں کی تاریکی اور مصائب کی سختی۔

اس نے دوسری بار اسی کونے کے دھاگوں پر ہاتھ پھیرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ ایک دبلی پتلی، گوری چٹی لمبی سی عورت وہاں آ گئی۔ وہ کچھ دیر تو خاموش کھڑی جالی میں لال دھاگا باندھا، مڑ کر عقیدت سے مزار کی طرف دیکھا اور آنسو پونچھتی ہوئی باہر نکل گئی۔

وہ عورت جوں ہی باہر نکلی اس نے اس کے باندھے ہوئے دھاگے پر انگلی رکھ دی۔ اکتوبر کی ان ابتدائی تاریخوں میں جب دھوپ چھاؤں کے موسم کے باوجود مزار کے باہر وسیع و عریض آنگن کا ایک ایک پتھر تپ رہا تھا ایک سرد لہر اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی' دھاگا سمٹا' پھر پھیلا اور دو آنکھیں بن گیا۔ رحم کی بھیک مانگتی ہوئی آنکھیں' دو لب بن گیا' خواہشوں کو گویائی عطا کرتے ہوئے لب۔ ''اے شیخ! تو نے بادشاہوں کی جھولیاں مرادوں سے بھر دی ہیں میری جھولی میں بھی ایک گلاب ڈال دے۔''

وہ اسی جگہ کھڑے کھڑے کانپ گئی۔ جیسے نیند سے اچانک کوئی کسی کو جگا دے یا کوئی بیحد بھیانک خواب سے جاگ پڑے۔ اس نے اپنے دونوں طرف مسہری پر سوتے ہوئے دونوں بچوں کو ٹٹولنے کے لیے ہاتھ بڑھائے لیکن اس کا بایاں ہاتھ محراب سے اور دایاں نہایت خوبصورت کپڑوں میں ملبوس ایک عورت سے ٹکرا گیا۔ کمر میں سونے کی کردھنی' کانوں میں سونے کے بندے جن میں ہیرے چمک رہے تھے' گویا خواب سے جاگنے کے بعد حقیقت سے اس کا پہلا ٹکراؤ تھا۔ کھلتا ہوا گندمی بلکہ شائد گورا رنگ جس کو خوشحالی' خوشیوں بھری زندگی نے اور بھی حسین بنا دیا تھا' بلکہ چمکا دیا تھا۔

اس عورت کو بھی بھلا کوئی غم ہوسکتا ہے؟ اس نے بالائی کی رنگت والے ملائم اور گداز ہاتھوں کو دیکھا۔ نظریں جھکا کر دونوں چھوٹے چھوٹے پیروں کو دیکھا' ایسے چھوٹے چھوٹے خوبصورت پیر جیسے انہیں بچپن میں لوہے کے جوتے پہنا کر رکھا گیا ہو' پھر سر اٹھا کر کنکھیوں سے ان بڑی بڑی آنکھوں کی طرف دیکھا جو تھوڑی دیر قبل اس کو ایسی لگی تھیں جیسے کسی نے گلاب کے کٹورے بھر دیے ہوں۔

لیکن اب یہ گلاب کے کٹورے چھلکنے ہی کو تھے اور آنسوؤں کے دو قطرے دونوں کٹوروں کے کونوں سے ٹپک پڑنے کے لیے پر تول رہے تھے۔

اس عورت کو بھلا کیا غم ہوسکتا ہے؟ اس نے سوچا' غریب اور مفلسی تو اس نے دیکھی ہی نہیں۔ اولادیں یقیناً ہیں ورنہ اس قدر خوش بھلا رہ سکتی تھی۔ مانگ کا سیندور اور چوڑیاں اور بندے' چھی چھی کیسا برا خیال آیا تھا اس کے دل میں خدا اسے سدا سہاگن رکھے اور اس کے پتی کی عمر دراز کرے۔ لیکن کوئی زخم تو ضرور تھا' جسے نہ دولت' نہ شوہر' نہ آل' نہ اولاد' نہ خوبصورت کپڑے' نہ قیمتی زیور' غرض کوئی نہ بھر پایا تھا اور وہ یہاں چلی آئی تھی۔

اس نے ساڑی جس طرح باندھ رکھی تھی اسی طرح ساڑی باندھنا جاوید کو بھی پسند تھا لیکن وہ اس طرح ساڑی باندھ ہی نہ پاتی تھی اسے اس بات سے ایک اور بات یاد آگئی اور اس کی اداس اور غمگین آنکھوں میں بھی ہنسی کی ایک چمک پیدا ہوگئی۔

جاوید نے جب تاج محل میں ایک خوبصورت لڑکی کو بار بار پلٹ کر دیکھا تو وہ اداس ہوگئی

تھی۔ شادی کو ابھی چند ہی دن تو ہوئے تھے اور خلوتوں میں پیار و محبت لٹانے والا جاوید جلوت میں' اور وہ بھی اس کی موجودگی میں اس طرح ہرجائی ہوا جا رہا تھا۔ ویسے اس نے خود کو سمجھایا بھی تھا کہ ہر پرکشش اور خوبصورت چیز کی طرف نظریں خود بخود اٹھ جاتی ہیں لیکن بار بار مڑ کر دیکھنا بلا ارادہ تو نہیں ہوسکتا؟ اس نے کئی بار پلٹ پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا اور تاج محل کی پشت پر جمنا کے کنارے۔ جب وہ عورت مسجد کی طرف کھڑی تھی تو دریا کے اس پار قلعہ کی طرف دیکھتے ہوئے بھی اس نے نظریں چرا کر اس عورت کی طرف دیکھ لیا تھا۔

لیکن جاوید کے گفتگو کے انداز' برتاؤ' مسکراہٹ' ہنسی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد تاج محل کے حسن کے پہلو کی طرف اس کی توجہ دلاتے ہوئے اس کے ہاتھ کو دھیرے سے چھو دینے کی اس کی عادت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ پھر یہ بات تو اسے ایک دن خود بخود سمجھ میں آ گئی تھی کہ اس دن جاوید اس عورت کو نہیں بلکہ اس ساڑھی کو دیکھ رہا تھا جو وہ عورت ایک خاص طریقہ سے باندھے ہوئے تھی۔

کہیں اس عورت کو ایسا کوئی وہم' کوئی بے نام غم تو نہیں؟ بے نام غموں کے تو ہم عورتوں کے پاس خزانے ہوتے ہیں جنہیں ہم لٹاتے نہیں بٹور بٹور کر رکھتے ہیں۔ خوشیوں کے لمحوں کو بوجھل بنانے کے لیے بے محابہ' بے ساختہ قہقہوں کو شائستہ بنانے کے لیے' انتہاؤں کو زندگی کے آداب سکھانے کے لیے لیکن ایسے بے نام غموں کے لیے کوئی اتنی دور تو نہیں چلا آتا۔

وہ عورت جالی پر دھاگا باندھنے لگی تو اس نے کنکھیوں سے اس کے چہرے کا ایک بار پھر جائزہ لیا۔ اداسی کا ایک پردہ تو ضرور تھا' آنکھیں اب بھی بھیگی ہوئی تھیں لیکن چہرے کا میک اپ اسی طرح قائم تھا جیسے بیوٹی سیلون سے نکل کر سیدھے یہیں چلی آئی ہو۔ گرد و غبار کا ایک بھی نشان نہ تھا' ساڑھی پر ایک بھی شکن نہ تھی۔ اس عورت نے دھاگے میں گرہ لگائی تو اس کی نظریں قدرتی رنگ میں رنگے ہوئے اس کے لمبے لمبے ناخنوں پر پڑیں جن کا یہ حسن' یہ چمک دیکھ ریکھ اور گھرداری کے کاموں سے بے نیازی کے بغیر ممکن نہ تھا۔

دھاگے میں گرہ لگانے کے بعد اس نے ذرا سا جھک کر دونوں ہاتھ باندھ کر جیسے جالی ہی کو پرنام کیا۔ پھر مڑی اور مزار کے قریب جا کر کھڑے ہی کھڑے تقریباً دہری ہوگئی اور ایسے پھوٹ پھوٹ کر روئی کہ سارے بندھ ٹوٹ گئے بلکہ بہہ گئے۔ لیکن ان آنسوؤں نے اسے اور بھی خوبصورت' اور بھی معصوم بنا دیا تھا۔ جب وہ باہر نکلی تو وہ بھی تجسس کے مارے مزار کے سرہانے تک آ گئی۔ اس نے پرس کھولا' دو بڑے بڑے نوٹ نکالے' پھر اور نوٹ نکالے اور درگاہ کے چندے کے بکس میں ڈال دیئے اور الائچی دانے لینے کے لیے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اسی طرح پھیلائے پھیلائے ہاتھ اوپر اٹھائے اور اپنا سر ہاتھوں پر ٹکا دیا۔ پھر دھیرے دھیرے سر اٹھایا' الائچی دانے ساڑھی کے پلو میں

ڈال کر پرس میں احتیاط سے رکھ لیے اور چلی گئی۔ چند قدم بعد اس نے پلٹ کر مزار کی طرف ایک بار پھر دیکھا اور سر جھکائے بلند دروازے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی۔

اب وہ اسی جالی کے پاس آ گئی جہاں تھوڑی دیر قبل اس عورت نے دھاگا باندھا تھا لیکن رنگ برنگے دھاگوں کے جنگل میں وہ اس کا دھاگا پہچان نہ سکی' اس کے غم کے راز تک نہ پہنچ سکی۔

اسی درمیان سیاحوں کا ایک ریلا درگاہ میں داخل ہوتو گائیڈ نے رٹے رٹائے جملے دہرائے ''شیخ سلیم چشتی کی دعا سے اکبر کو جہانگیر نصیب ہوا۔ یہاں لوگ آتے اور دامنِ مراد بھر لے جاتے ہیں۔''

مزار کے باہر کی جالی پر ایک سیاح نے ہاتھ رکھا تو گائیڈ نے نہایت آہستگی سے وہ ہاتھ ہٹا دیا اور کہا: ''اس مزار کی جالی دنیا کے سارے مزارروں کی جالیوں سے خوبصورت ہے۔ کچھوے کی ہڈی پر سیپ کے کام کی یہ دنیا میں اپنی آپ مثال ہے''۔ یہ کہہ کر اُس نے دیا سلائی جلائی تو مزار کی بیرونی دیوار کا وہ حصہ جس پر روشنی پڑ رہی تھی چمک اٹھا' جھلمل کرنے لگا۔

سیاحوں کا ریلا چلا گیا تو وہ پھر تقریباً تنہا رہ گئی۔ اب ایک بار پھر اس نے مزار کے قدموں کے سامنے کی جالی پر بندھے ہوئے دھاگوں پر ہاتھ پھیرا تو جاوید دروازہ کھول کر کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ نشے میں دھت' ٹائی کی گرہ ڈھیلی' بال بکھرے ہوئے' سوٹ شکن آلود' آنکھیں سرخ اور دہاڑتا ہوا: ''میں کہتا ہوں یہ میرا گھر ہے یا کسی اور کا۔ دو دو گھنٹہ چلاؤ تب کہیں جا کر دروازہ کھلتا ہے۔ نہ آیا کروں' کہیں اور سو رہا کروں؟''

''ذرا آنکھ لگ گئی تھی' تھوڑی دیر پہلے تو جاگ رہی تھی''۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور ٹائی کی گرہ کھولنے لگی۔

لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور کوٹ نرم نرم ہاتھوں سے اتار دیا اور ہاتھ کا سہارا دے کر اسے بستر پر لٹا دیا' پھر جوتوں کی ڈوری کھولی' جوتے اتارے' موزے اتارے اور بستر پر اس کی ٹانگیں پھیلا دیں۔

اب یہ بات ہر رات کا معمول بن گئی تھی۔ ویسے اسے دن میں سب کچھ حاصل ہوتا۔ عزت' دولت' کار' ملازم' اولادیں' لیکن یہ سب کچھ ایک باریک دھاگے سے لٹکا ہوا معلوم ہوتا تھا' اگر اس کے خدشات صحیح ثابت ہوئے تو وہ کیا کرے گی۔ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود دس بارہ برس تک اس طرح کی زندگی گزارنے کے بعد کیا وہ نئے سرے سے بالکل دوسری طرح کی زندگی شروع کر سکے گی۔

سوالیہ نشان پھیلا اور پھیلتا ہی گیا کہ ایک بوڑھی سی عورت نے دوسری عورت کی گود سے ایک بالکل چھوٹا سا بچہ لے کر مزار کے قدموں میں ڈال دیا۔ دونوں عورتوں نے جن کے چہرے خوشی

سے تمتما رہے تھے اسی جگہ بیٹھ کر سر کو اتنا جھکایا' اتنا جھکایا کہ سجدے کا گمان ہونے لگا۔ بوڑھی عورت اٹھی اور اس نے جالی کے پاس جا کر ایک دھاگے کی گرہ کھول دی۔ بچے کو گود میں اٹھا لیا' دونوں نے ایک بار عقیدت سے مزار کی طرف گردنیں جھکائیں اور مزار سے باہر نکل گئیں۔

اسی لمحہ اس کی نظر ماں کی گود میں مسکراتے ہوئے بچے پر پڑی اور وہ خود بھی مسکرا دی۔

لیکن اس کی یہ مسکراہٹ عارضی تھی۔ ساری جالیوں پر محرومیوں' تمناؤں' ناکامیوں کے آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے لاکھوں لاکھ دھاگوں کے درمیان ایک پھول کب تک اپنی شادابی برقرار رکھ سکتا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ کی مٹھی کھولی تو سرخ دھاگا پسینے میں بھیگ چکا تھا۔ اب وہ جالی کے کسی ایسے کونے کو تلاش کرنے لگی جہاں اس سے قبل کسی نے دھاگا نہ باندھا ہو۔ لیکن ایسی کوئی جگہ نہ تھی۔ ہر جگہ ایک دو نہیں درجنوں دھاگے بندھے ہوئے اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے آنسو بہا رہے تھے۔ آنسوؤں کے اس سیلاب میں اس کے ایک قطرے کی بھلا کیا اہمیت' گہرے زخم' غم و اندوہ کے پہاڑ اور مصائب کے طوفان خیز دھارے جن کی یہ دھاگے علامت تھے اسے اپنے غم کے مقابلے میں بیحد بڑے اور عظیم معلوم ہوئے۔

اس نے ایک بڑا دھاگا لیا اور جالی کے چاروں کونوں پر باندھ دیا' پوری جالی کو گھیر کر' سارے غموں' دکھوں اور تمناؤں کا احاطہ کیے ہوئے۔ اب وہ رو پڑی اس کی آنکھیں سمندر بن گئیں۔ اس نے آنسو پونچھنے کی کوشش کی اور رندھے ہوئے گلے سے بولی:

''شیخ' ان سب کی مرادیں بر آئیں تو میرا غم بھی ہلکا ہو جائے گا۔ اتنے بہت سے دکھوں کے بیچ میں کیسے خوش رہ سکوں گی۔''

باہر صحن کے پتھر اب بھی اتنے ہی گرم تھے' سورج اب بھی آگ برسا رہا تھا لیکن ان کا احساس کیے بغیر' خاموش' گردن جھکائے وہ اس طرح باہر نکل آئی جیسے اس کے دل کا سارا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔

❁ ❁ ❁

سلام بن رزاق

ندی

ندی بہت بڑی تھی۔ کسی زمانے میں اس کا پاٹ کافی چوڑا رہا ہوگا۔ مگر اب تو بے چاری سوکھ ساکھ کر اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا جب اس کے دونوں کناروں پر تاڑ اور ناریل کے آسماں گیر درخت اُگے ہوئے تھے جن کے گھنے سائے ندی کے گہرے، شانت اور شفاف پانی میں یوں ایستادہ نظر آتے جیسے کسی پر جلال بادشاہ کے دربار میں مصاحب سر نیوڑھائے کھڑے ہوں۔ مگر اب درختوں کی ساری شادابی لٹ چکی تھی اور ان کے ٹنڈ مُنڈ خشک صورت تنے کسی قحط زدہ علاقے کے بھوکے کنگال لوگوں کی طرح بے رونق اور نادار لگ رہے تھے۔

ندی بہت بڑی تھی اور اس کا پاٹ اب بھی اپنی گزری ہوئی عظمت اور وسعت کی غمازی کرتا نظر آتا۔ مگر اب اس طرح خشک ہوگئی تھی کہ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے بے ڈھنگے ٹاپو اُبھر آئے تھے۔ حد نظر تک چھوٹے بڑے بے شمار ٹاپو۔

اب اُن ٹاپوؤں پر کہیں کہیں خودرو گھاس اور جنگلی جھاڑیاں بھی اُگ آئی تھیں۔ جن میں ہزاروں لاکھوں ٹڈے اور جھینگر شب و روز پھدکتے رہتے۔ گھاس کے نیچے کیچڑ میں لاکھوں کیڑے رینگتے کلبلاتے رہتے اور جب دوپہر کی تپا دینے والی دھوپ میں کم کم گدلا بدبودار پانی تپنے لگتا تو ندی کی مچھلیاں اس طرح اِدھر اُدھر منہ چھپاتی پھرتیں جیسے کسی پردہ دار گھرانے کی بہو بیٹیاں بھرے بازار میں بے نقاب کردی گئی ہوں۔

مچھلیوں کی تعداد دن بہ دن کم ہوتی جارہی تھی اور ٹڈے، جھینگر، کیڑے مکوڑوں اور مینڈکوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ دوپہر ڈھلے ندی کے نیم گرم، گدلے پانی سے چھوٹے بڑے بے شمار مینڈک نکلتے اور اُن ٹاپوؤں پر بیٹھ کرٹرآتے رہتے۔

''میں اس ندی کا وارث ہوں۔'' بڑا مینڈک۔

''ہاں، آپ اس ندی کے وارث ہیں۔'' چھوٹے مینڈک۔

''اس ندی کے ایک ایک ٹاپو پر میرا اختیار ہے۔''

''اس ندی کے ایک ایک ٹاپو پر آپ کا اختیار ہے۔''

''میں — میں — چاہوں تو۔''

بڑا مینڈک مناسب دعوے کے لیے آنکھیں مٹکا مٹکا کر اِدھر اُدھر دیکھتا اور ذرا سے توقف کے بعد کہتا:

''میں چاہوں تو ایک جست میں اس چمکتے سورج کو آسمان سے نوچ کر پاتال میں پھینک دوں۔''

''آپ چاہیں تو......'' چھوٹے مینڈک دھوپ سے اپنی آنکھوں کو مچمچاتے ہوئے حسبِ عادت بڑے مینڈک کی تائید کرتے کہ بڑے مینڈک کی خوشنودی ان کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔

پھر پاس ہی کے کسی ٹاپو سے ایک موٹے پیٹ اور پتلی ٹانگوں والا کوئی بڑا مینڈک گمبھیر آواز میں اپنے کسی مقصد سے پوچھتا۔

''کون ہے یہ؟ کون ہے یہ احمق؟''

ایک طرار مینڈک پھدک کر کہتا۔

''وہی ہمارا ذلیل پڑوسی ہے۔ جس کے اجداد حضور کے کفش بردار رہ چکے ہیں۔''

''اوہو' اس نمک حرام سے کہو کہ سورج پر کمند ڈالنے سے پہلے ہمارے قدم چومے کہ خورشید ہمارے نقش کف پا کے سوا کچھ نہیں۔''

اس کی لن ترانی کے جواب میں کسی تیسرے ٹاپو سے آواز آتی۔

''یہ کون گستاخ ہے۔ اسے آگاہ کردو' اپنی زبان کو قابو میں رکھے کہ ہم زبان درازوں کی زبانیں یوں کھینچ لیتے ہیں جیسے ملک الموت جسم سے روح۔''

''خاموش' خاموش اس ندی کا ایک ایک ٹاپو ہماری زد میں ہے۔''

اس کے بعد ہر ٹاپو سے ایک نئی آواز بلند ہونے لگتی۔ ہر آواز پہلی آواز سے زیادہ تیز ہر دعویٰ پہلے دعوے سے زیادہ بلند و ارفع۔ ایسا شور مچتا کہ بے چاری مچھلیاں خوفزدہ ہوکر چہ بچوں کی تہوں میں جا چھپتیں۔

درختوں کی شاخوں پر بیٹھے پرند پھڑ پھڑا کر اڑتے اور جدھر جس کا سینگ سماتا چلا جاتا۔ ٹرا ٹرا کر مینڈکوں کے گلے رندھ جاتے' پھول پھول کر پیٹ پھٹ جاتے' اور بیسیوں مینڈک اپنے ہی بلند بانگ دعوؤں کے وزن تلے دب دب کر کچل جاتے۔ اور پھر دھیرے دھیرے تمام ٹاپوؤں پر ایک خوفناک سکوت طاری ہوجاتا نہ کسی مینڈک کی ٹرٹر نہ کسی جھینگر کی جھائیں جھائیں۔ مگر یہ سکوت ایک مختصر سے وقفے کے لیے ہوتا۔

دوسرے دن پھر مینڈک اپنے اپنے ٹاپوؤں پر جمع ہوتے اور پھر وہی لاف گزاف ایک دن اسی طرح بڑے چھوٹے مینڈک اپنے اپنے ٹاپوؤں سے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے' ایک

دوسرے پر کیچڑ اچھال رہے تھے۔ ایک دوسرے کو ذلیل کر رہے تھے' گالیاں بک رہے تھے۔ مچھلیاں چھوٹے چھوٹے چہ بچوں میں اوپری سطح پر تیرتی اس لڑائی کو خوف اور حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑے گھاس اور پودوں کی جڑوں میں دُبک گئے تھے۔ ندی کے کنارے پھدکتی چڑیاں دم بخود اس بحث کو سن رہی تھیں۔

تبھی ندی کے ایک گوشے میں کچھ ہلچل سی ہوئی۔ پہلے تو سطح آب پر بڑے بڑے بلبلے پیدا ہوئے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے کوئی پانی کی سطح پر نمودار ہوا۔ یہ ایک بے حد بوڑھا مگرمچھ تھا۔ اتنا بوڑھا کہ اس کی کیچلیاں جھڑ چکی تھیں۔ دُم کے دانتے کند پڑ گئے تھے اور اس کی پشت پر باریک باریک سبزہ اُگ آیا تھا۔

اُس نے اپنی پوری قوت سے دُم کو اس کیچڑ آلود پانی کی سطح پر دے مارا۔ ایک زور کا چھپاکا ہوا اور پانی کے چھینٹے اڑ کر دور دور تک پہنچے۔ مختلف ٹاپوؤں پر شور مچاتے مینڈک یک بیک چپ ہوگئے۔ سب اپنی پچھلی ٹانگوں پر اُچک اُچک کر اس آواز کی سمت دیکھنے لگے۔ آخر سبھوں نے بوڑھے مگرمچھ کو دیکھ لیا۔

سبھی مینڈک بوڑھے مگرمچھ کا بے حد احترام کرتے تھے بلکہ بعض اس سے خوفزدہ بھی رہتے تھے کیونکہ اُن کے آباؤاجداد کے مطابق بوڑھا مگرمچھ اس ندی کی بدلتی ہوئی تاریخ کا چشمِ دید گواہ تھا۔

اس کی عمر کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اس کی ہستی صدیوں کے دوش پر قرنوں کا فاصلہ طے کر چکی تھی۔

تمام مینڈکوں نے ٹراٹرا کر بوڑھے مگرمچھ کی جے جے کار کی۔ بوڑھے مگرمچھ نے اپنی بھاری دُم ٹیک کر اور اپنا لمبا چوڑا جبڑا کھول کر خوشی کا اظہار کیا۔ پھر رینگتا ہوا ایک اونچی چٹان پر چڑھ گیا۔ چٹان پر پہنچ کر اس نے ندی کے اطراف نگاہ ڈالی۔ اب ندی— ندی کہاں تھی؟ وہ تو بس چند ٹاپوؤں اور چہ بچوں کا مجموعہ ہوکر رہ گئی تھی۔

جگہ جگہ ریت کے خشک تودے اُبھر آئے تھے۔ کہیں کہیں گڈھوں میں پانی کے بجائے صرف کیچڑ تھا۔ ندی کے دونوں کناروں پر خودرو گھاس ضرور اُگی ہوئی تھی مگر پانی کی کمی کے کارن گھاس کا رنگ بھی زرد پڑتا جارہا تھا۔ ناریل' سپاری اور تاڑ کے درخت بانس کے جنگل کی طرح خشک اور ویران لگ رہے تھے۔

ندی کی اس بدلی ہوئی کیفیت کو دیکھ کر مگرمچھ کا دل بھر آیا۔ قریب تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے بہہ نکلتے۔ اس نے کمالِ ضبط سے اُن آنسوؤں کو روکا۔ مبادا ندی کے یہ بے ضمیر باسی انہیں حسبِ روایت مگرمچھ کے آنسو کہہ کر ان کی تضحیک نہ کریں پھر اس نے اپنے دیدے

گھما کر اِدھراُدھر ٹاپوؤں پر بیٹھے مینڈکوں کو دیکھا۔ سارے مینڈک دم سادھے بیٹھے تھے۔ مگرمچھ نے پھنکار کر گلا صاف کیا' بھر بھرائی آواز میں بولا:

''اے ندی کے باسیو! کبھی تم نے اس بلند چٹان سے ندی کو دیکھا ہے؟''

تمام مینڈک ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر سبھوں نے بیک زباں اعتراف کیا۔

''نہیں۔ ہم نے اس بلند چٹان سے کبھی ندی کو نہیں دیکھا۔''

''دیکھو! یہاں سے ندی کو دیکھو تو تم پر تمہارے بے بضاعت ٹاپوؤں کی حقیقت آشکار ہو جائے گی۔''

''مگر ہم وہاں سے ندی کو کیوں دیکھیں کہ ندی تو ہمارے لہو میں جاری وساری ہے۔''

''عریاں حقیقتوں کو سیمابی لفظوں کا لباس نہ پہناؤ کہ الفاظ جذبے کے اظہار کا بہت ادنیٰ ذریعہ ہیں۔ خود تسلی' عارضی اطمینان کی سبیل ضرور ہے مگر یہی اطمینان مکمل تباہی کا پہلا بگل بھی ہے۔''

تبھی ایک کونے سے ایک پستہ قد زرد فام مینڈک نے ٹرا کر کہا:

''میں دیکھ سکتا ہوں۔ بلندی سے میں ندی کا نظارا کر سکتا ہوں۔''

''تمام مینڈک اُس زرد فام مینڈک کی طرف مڑے۔ وہ پندرہ بیس مینڈکوں کے کاندھوں پر چڑھا سینہ پھلائے نہایت حقارت سے اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے مگرمچھ سے مخاطب ہو کر کہا:

''اے دانائے راز! کیا میں ان تمام سفالی ہستیوں سے سربلند نہیں ہوں کہ یہ ندی کراں تا کراں میری نگاہ کی زد میں ہے۔''

ابھی اس کے الفاظ فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ مینڈکوں کا اہرام لرزا اور ایک دوسرے کے کاندھوں پر چڑھے ہوئے مینڈک دھپ دھپ نیچے لڑھک گئے۔

دو چار کمزور مینڈکوں کی تو آنتیں نکل آئیں۔ بعض وہیں ڈھیر ہو گئے۔ اردگرد کے ٹاپوؤں کے مینڈک بے تحاشا قہقہے لگانے لگے۔ ہنسی' قہقہے' فقرے بازی اور شور وغوغا سے تھوڑی دیر تک کان پڑی آواز سنائی نہیں دی۔

آخر مگرمچھ کو مداخلت کرنی پڑی۔

''خاموش' خاموش اے ندی کے باسیو! خاموش' یہ جائے مسرت نہیں مقام عبرت ہے کہ تمہاری چھوٹی چھوٹی نفرتوں نے تمہارے قد گھٹا دیئے ہیں۔ اور تم ــــ تم سب اپنی ہی لاشوں پر قہقہے لگانے کے لیے زندہ ہو۔''

''اے صاحبِ عقل و دانش! کیا ہمیں اپنے دشمن کی مات پر خوش ہونے کا حق نہیں۔ یہ فتنۂ حرام عرصۂ دراز سے دوسروں کے کاندھوں پر چڑھ کر ہمیں دھمکاتا رہتا تھا۔''

"دشمن!" مگرمچھ نے ایک گہری سانس کھینچی۔

"تم نہیں جانتے کہ بعض اوقات دشمنی بھی تمہارے ظروف کا پیمانہ بن جاتی ہے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو، مرنے والی کی صورت میں تمہیں اپنی صورت دکھائی دے گی۔ کان کھول کر سنو۔ اس کی آواز میں تمہیں اپنی آواز سنائی دے گی۔ دشمن کی شناخت مشکل ہے اس لیے کہ دوست کی شناخت مشکل ہے۔"

"اے مدبر وقت! تو ہی ہمیں کوئی تدبیر بتا کہ ہمارے دل نفرتوں کے غبار سے دھل جائیں اور ہمارے سینے محبتوں کے نور سے معمور ہو جائیں۔ تجھے ہم عقل وفہم کا پتلا اور تجربات کا مرقع جانتے ہیں۔"

"اگر ماحول سازگار نہ ہو تو تدبر تضحیک کا نشانہ اور تجربہ تہمت کا بہانہ بن جاتا ہے یاد رکھو گھورے پر کبھی گلاب نہیں کھلتے۔ تم نے نفرت بوئی تھی نفرت ہی کاٹو گے......"

مگر تیرے سوا کون ہماری رہنمائی کر سکتا ہے کہ ہم بالاتفاق رائے تجھے اپنا مربی سمجھتے ہیں۔"

ایک چتکبرا مینڈک پھدک کر مگرمچھ کے قریب ہوتا ہوا مکھن چپڑے لہجے میں بولا۔ اور پھر اس انداز سے چاروں طرف دیدے گھمائے جیسے اپنے ہم جلیسوں سے کہہ رہا ہو۔ میرا کاٹا کبھی بھولے سے نہ پانی مانگے۔

بوڑھا مگرمچھ اس چالاک مینڈک کی نیت بھانپ گیا۔ ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی اور پھر دوسرے مینڈکوں سے مخاطب ہوا۔

"مربی ایک ایسے بدطینت شخص کو کہتے ہیں جو زیردستوں کی دست گیری محض اس لیے کرتا ہے کہ وہ تاحیات اس کی غلامی کا دم بھرتے رہیں۔"

مگرمچھ کے اس کرارے جواب نے مختلف ٹاپوؤں میں ایک غلغلہ ڈال دیا۔ دیر تک مینڈک ٹراتے اور قہقہے لگاتے رہے اور وہ چتکبرا مینڈک غصے اور ندامت سے پیچ و تاب کھانے لگا۔ جب شور ذرا کم ہوا تو چتکبرا مینڈک ہوا میں قلابازی کھاتا ہوا چیخا۔

"اَنا — اے ناصح نامہربان، تیری تلخ نوائی نے میری اَنا کو لہولہان کر دیا ہے۔ اپنی اَنا کی حفاظت میری زندگی کا مقصدِ اعلیٰ ہے۔ میں تلوار کا گھاؤ سہہ سکتا ہوں۔ اپنی اَنا پر ضرب نہیں سہہ سکتا۔"

"اَنا" — مگرمچھ نے اس چھوٹے سے مینڈک کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے حقارت سے کہا۔

"چیونٹی اپنے منہ میں شکر کا دانہ لیے چلتی ہے تو اپنی دانست میں سات پہاڑوں کا بوجھ اس پر لدا ہوتا ہے۔ تم اپنی ڈیڑھ انچ کی انانیت کو آخر اس قدر اہمیت کیوں دیتے ہو جو پانی کے ایک ریلے سے بہہ جاتی ہے، ہوا کے ایک معمولی جھونکے سے اڑ جاتی ہے۔ جب تک تمہاری انانیت

تمہارے وجود کا حصہ نہیں بنتی' وہ چھپکلی کی کٹی دُم کی مانند بے حقیقت اور حقیر ہے۔ تمہاری مشکل یہ ہے کہ تم سب چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بٹے ہو اور ہر کوئی اپنے جزیرے کو کرۂ ارض کے برابر سمجھتا ہے۔''

مگرمچھ کا یہ وار بہت صاف اور تیکھا تھا۔ شدید تکلیف سے ان کے لہو میں گرہیں پڑ گئیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ غصہ' ذلت اور ندامت نے ان کی عجیب کیفیت کردی تھی۔ انہیں لگ رہا تھا کہ کوئی انہیں رسی کی طرح بٹتا جارہا ہے۔ مگر وہ کیا کرسکتے تھے کہ ان کے پاس نہ سانپ کا سا پھن تھا' نہ بچھو کا سا ڈنک۔

البتہ وہ چیخ سکتے تھے کہ اب ان کی چیخ ہی اُن کے وجود کی گواہی بن سکتی تھی۔ لہٰذا ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بیک زبان ٹرانے لگے۔ اپنی ہستی کی انتہائی بنیادوں سے ٹرانے لگے۔ مگرمچھ ضبط وتحمل سے ان کی ٹراہٹ سنتا رہا۔ اور خاموشی سے ان کے گلوں کی پھولتی پچکتی جھلیوں کو دیکھتا رہا۔ جب ٹراتے ٹراتے ان کی گردنوں کی جھلیاں لٹک گئیں' پیٹ پچک گئے۔

تب مگرمچھ نے آہستہ سے گردن اٹھائی۔ یہاں سے وہاں تک بکھرے ہوئے مینڈکوں پر ایک متاسفانہ نگاہ ڈالی' چھوٹے بڑے' نیلے پیلے' کالے' سفید' دُبلے پتلے' موٹے تگڑے' سارے کے سارے مینڈک منہ کھولے' گردنیں ڈالے گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔ اب اُن کی آخری چیخ بھی ان کے سینے کی لحد میں سوچکی تھی۔ آخر ایک طویل وقفے کے بعد مگرمچھ گویا ہوا۔

''اے ندی کے باسیو! تم میں سے ہر کوئی خودغرضی کے محور پر پھیرکی کی طرح گھوم رہا ہے۔ تمہاری نظروں میں سارے رنگ یوں گڈمڈ ہوگئے ہیں کہ اب رنگوں کی تمیز ممکن نہیں۔ لہٰذا اب میرے پاس تم سب کے لیے ایک سفاک دعا کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں دعا مانگتا ہوں۔ دعا کے اختتام پر باآواز بلند ''آمین'' کہنا۔ یہی تمہاری نجات کا آخری حیلہ ہے۔''

مینڈکوں نے مگرمچھ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اپنے کرچی کرچی وجود کے ساتھ ٹکرٹکر اسے گھورتے رہے۔ اب اجالے کے پر سمٹنے لگے تھے۔

سورج ایک کیکر کے دوشاخے میں پھنسا پھڑپھڑا رہا تھا۔ اُس کے خون کی لالی قطرہ قطرہ ندی کے چہ بچوں میں سونا گھول رہی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی دل کو مسوس دینے والی اُداسی بس گئی تھی۔ تبھی مگرمچھ نے آسمان کی طرف منہ اٹھایا۔ آنکھیں بند کرلیں اور دعا مانگنے لگا۔

''اے بحروبر کے مالک! اے خشکی کو تری اور تری کو خشکی میں بدلنے والے۔ زمانہ بیت گیا یہ ندی سوکھتی جارہی ہے اور ہم کو جنہیں ایک ہی ندی کے باسی کہلانا تھا' الگ الگ ٹاپوؤں میں بٹ گئے ہیں۔ اے قطرے سے دریا بہانے والے اور ندیوں کو سمندر سے ملانے والے ہمارے رب! ہماری اس سوکھی ندی میں کسی صورت باڑھ کا سامان پیدا کر' تاکہ ہم جوان چھوٹے چھوٹے ٹاپوؤں

میں تقسیم ہو گئے ہیں پھر اسی ندی میں گھل مل جائیں اور اس کے وسیع دامن میں جذب ہو کر اسی کا ایک حصہ بن جائیں!

"سیلاب! صرف ایک تند و تیز سیلاب!!"

مگر مچھ دعا ختم کر کے تھوڑی دیر تک آنکھیں موندے مینڈکوں کے 'آمین' کہنے کا منتظر رہا۔ مگر جب کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی کہیں سے 'آمین' کی صدا بلند نہیں ہوئی تب اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اردگرد کے ٹاپو خالی پڑے تھے۔ تمام مینڈک ندی کے کم کم' گدلے اور بدبودار پانی میں ڈبکیاں لگا چکے تھے۔

❁ ❁ ❁

الیاس احمد گدی

ٹام جیفرسن کے پنجرے

نوجوان لڑکا طوطے کو گالی سکھا رہا تھا۔

''بول مٹھو......سالا......!''

سالا......سالا......سالا......

طوطا خوش دلی سے دہرانے لگا — بڈھے ٹام نے گردن موڑ کر لڑکے کو دیکھا۔

''کیا کرتے ہو — ؟ میرے بچوں کو خراب کر رہے ہو — ؟''

نوجوان ٹام کی بات نظرانداز کر کے اور اس کی طرف شوخی سے دیکھ کر پھر طوطے کو سکھانے لگا۔

''بول مٹھو حرامی......حرامی......''

طوطا جیسے لڑکے کو خوش کرنے پر آمادہ تھا۔ زور سے چیخا:

''حرامی — !''

بڈھے ٹام نے چھڑی اٹھائی — ''تم بھاگو گے کہ نہیں' میں ابھی تمہارے باپ کے پاس جاتا ہوں۔''

اس کے چھڑی اٹھانے پر بڑے پنجرے میں بند' بندروں کے پریوار کا کھیا کھوکھیایا۔ بڈھے ٹام نے اس کو ڈانٹا۔

''حرامی کی اولاد' تم کیوں دانت نکوس رہے ہو۔ میں تو اس لڑکے کو پیٹنے جا رہا ہوں جس نے میرے تمام بچوں کی عادتیں خراب کر دی ہیں۔

لڑکا برآمدے میں طوطے کے پاس کھڑا تھا۔ بڈھے ٹام کو چھڑی لے کر آتا دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا اور بھاگتے ہوئے بولا:

''انکل! تمہارے بچے میرے دوست ہیں۔ وہ تم سے زیادہ میری بات مانتے ہیں۔''

ایک بندر اور ایک بندریا تھی اور اس کے دو بچے تھے۔ آٹھ خرگوش تھے۔ سفید براق' ریشم جیسے۔ ان کی لال لال خوبصورت آنکھوں میں خوف ہمیشہ جھانکا کرتا۔ وہ ذرا سی آواز پر چونک پڑتے۔ ایک لمحہ کے لیے پلٹ کر دیکھتے پھر بھاگ جاتے۔ پنجرے ان کے بھی تھے مگر وہ زیادہ تر کھلے رہتے۔

لڑکے دوڑتے تو بھاگنے کی بجائے جھٹ زمین پکڑ کر بیٹھ جاتے۔ اس سے لڑکوں کو انہیں پکڑنے میں آسانی ہوتی۔ پھر وہ انہیں اپنی گود میں لیے پھرتے۔ ان کو چھوڑتے دوڑاتے' پھر پکڑتے' پھر چھوڑ دیتے۔ کبھی کبھی بیٹھ کر اپنی جانگھوں پر رکھ کر ان کی پشت سہلاتے تو وہ اپنی سرخ خوبصورت آنکھوں کو بند کر کے آنند کی کسی دوسری دنیا میں کھو جاتے۔

عورتوں کو زیادہ دلچسپی بندروں سے تھی۔ وہ جب ایک دوسرے کی جوئیں نکال نکال کر کھاتے تو عورتیں بہت ہنستیں۔ کبھی کبھی کوئی ذرا زیادہ جرأت مند عورت اپنا سر ان کے حوالے کر دیتی تو وہ نہایت مستعدی سے اس کی جوئیں نکالنا شروع کر دیتے۔ وہ عورت دینے کو تو اپنا سر دے دیتی مگر بے انتہا خائف رہتی کیونکہ ایک بار ایک عورت نے سر دینے کے بعد فوراً ڈر سے سر ہٹانا چاہا تھا تو بندر نے ایک تھپڑ جڑ دیا تھا دوسری عورتیں بندر کے غصہ ہونے اور بندریا کے خوف کھانے سے کافی محظوظ ہوئیں۔ ان کا ایک خاندان میں مل کر رہنا بھی اچھا لگتا تھا۔ بندر کے دونوں بچوں کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں باپ کا بار بار کھوکھیانا اور ماں کی ممتا یہ سب کچھ مل ملا کر ایک دم گھریلو سا ہو جاتا۔

عورتیں ان بندروں کے لیے مونگ پھلیاں' اور پھل بھی لائیں۔ دن کا بچا کھچا کھانا اور باسی سوکھی ہوئی روٹیاں بھی بوڑھے ٹام کے ان بے زبان بچوں کے لیے بھیج دی جاتیں۔ فصلوں کے موقعے پر اناج باندھ دیا گیا تھا۔ مرد کبھی کبھی بوڑھے ٹام کی پیسوں سے مدد کر دیا کرتے تھے۔

ٹام کا گھر قصبے کا چڑیا گھر تھا۔ قصبے کے بھولے بھالے معصوم لوگ عام طور پر شام کو بیوی بچوں کے ساتھ گھومنے بڈھے ٹام کے گھر آ جاتے۔ بڈھا ٹام ہر آدمی کا استقبال ٹوپی سر سے اٹھا کر کرتا جس کو وہ پتا نہیں کب سے پہنتا آ رہا تھا۔ گھر تو چھوٹا تھا مگر سامنے کھلی ہوئی کافی زمین تھی جس کے گرد مہندی کی باڑھ کھڑی کر کے احاطے بنا دیا تھا۔ اس کھلی جگہ میں بیٹھنے کے لیے بنچ وغیرہ نہیں تھے۔ مگر فرش پر ہمیشہ نرم ملائم دوب کا قالین بچھا رہتا جس پر مرد اور عورتیں بلاتکلف بیٹھ جاتے۔ لڑکے دوڑیں لگاتے۔ گھاس پر لڑھکتے اور اِدھر اُدھر بھاگ رہے خرگوشوں کو پکڑتے۔

ٹام انہیں خوش ہنستا بولتا دیکھ کر ایک دم آسودہ ہو جاتا جیسے اس سے آگے زندگی میں اور کچھ نہ ہو۔

ٹام کی زندگی میں تو واقعی اس سے آگے کچھ نہیں تھا۔ چوالیس سال پہلے جنگ کی ہولنا کیوں سے بچتا بارود کے دھوئیں میں کھانستا دشمنوں کے لہو میں شرابور وہ یہاں پہنچا تھا۔ برما کے محاذ پر ٹریگر پر انگلیاں رکھے رکھے اور بندوق کا گھوڑا دباتے دباتے اس کی انگلیاں زخمی ہو گئی تھیں۔ اسے انگلیوں کے علاج کے لیے ایسٹرن کمانڈ کے ہیڈ آفس رانچی کے مضافات میں ایک آرمی ہسپتال میں لایا گیا تھا۔

لوگ کہتے ہیں ہندوستان کی ہوائیں بڑی ساحر ہیں آدمی کی مت مار دیتی ہیں۔ سبز ے

سے ڈھکی ہوئی وادی کا جادو' بے حد پر سکون نرم رو زندگی کا جادو' بھولے بھالے معصوم بے ریا آدی واسیوں کی چاہتوں کا جادو' وہ کتنے جادوؤں سے اپنے آپ کو آزاد کرتا' سو وہ بے بس ہوگیا' موہ میں آ گیا۔

جنگ ختم ہوگئی۔ اپنی دو انگلیاں کٹوا کر وہ انگلینڈ چلا گیا۔ کتنا زمانہ بیت گیا' اس وقت کے بچے جوان ہوگئے۔ کہ اچانک ایک دن وہ اپنا بوسیدہ جنگلی تھیلا پیٹھ پر لٹکائے اسی وادی میں لوٹ آیا۔ جنگ اس نے جیت لی تھی مگر دل ہار گیا تھا۔ ایک چھوٹی سی پہاڑی پر کھڑے ہو کر اس نے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی بے پناہ حسین وادی کو دیکھا۔ ہواؤں کی آغوش میں مچلتی سبزے کی خوشبو کو اپنے اندر اتر جانے دیا۔ اور تب اس نے جانا کہ دھوئیں اور بارود کی شامہ کو مجروح کر دینے والی مہک کے علاوہ بھی کوئی خوشبو ہے۔ جو صرف پھیپھڑوں تک محدود نہیں رہتی بلکہ رگ و پے میں اتر جاتی ہے' سرشار کر دیتی ہے' اور بتاتی ہے کہ زندہ رہنے کے لیے پرشور' تیز رفتار اور آسائشوں سے پر زندگی ضروری نہیں ہے۔ اگر مہاتما بدھ کو یہیں کہیں نروان ملا تھا تو اسے بھی یہیں پہلی بار زندگی کا مطلب سمجھ میں آیا۔

کچھ لوگوں کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ ٹام جیفرسن کے مائی گریشن کے پیچھے دراصل ایک کالی لڑکی ہے' جن دنوں وہ آرمی ہسپتال میں زیر علاج تھا اس کی ملاقات ایک آدی باسی لڑکی سے ہوئی تھی۔ وہ اسپتال کی سوئپر تھی۔ اور بہت چپکے سے مشرق نے مغرب کے دل کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ اور جب مغرب نے دروازہ کھولا تو اپنے سامنے مشرق کے بے پناہ حسن کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا۔ اے بلیک روز' اے پیس آف بلیک جوئیل......

اگر ٹام جیفرسن سے اس سلسلے میں کوئی بات کرتا ہے تو وہ ہنستا ہے اور ایک الگ کہانی سناتا ہے۔

میں روبوٹوں کے بیچ نہیں رہنا چاہتا تھا۔ میں انسان تھا انسانوں کے بیچ رہنا چاہتا تھا۔ زندہ اور گرم انسانوں کے بیچ۔ وہاں ہر انسانی آواز مشینوں میں کھو گئی ہے' آدمی کا ہنسنا' آدمی کا رونا' آدمی کا بولنا' آدمی کا چیخنا سب مشینوں کے شور میں غائب ہو گیا ہے' سارے انسانی رشتے ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں' سرد بے حس مشینوں کی طرح جسم لمس کی لذت سے محروم ہو گئے ہیں۔ آدمی صرف اپنی پہچان نہیں کھو رہا ہے' اپنا وجود کھو رہا ہے۔ اور ایک روبوٹ کی طرح جی رہا ہے۔ اس قصبے میں اس کی بات سمجھنے والا کوئی نہیں ہے' اس لیے لوگ اس کو جھکی سمجھتے ہیں۔ ٹھیک بات ہے' اگر وہ جھکی نہیں ہے تو اپنا اتنا بڑا خوبصورت دیش چھوڑ کر اس جنگل میں کیوں آ بسا ہے' جانوروں کے بیچ اس کا یہ پاگل پن بستی والوں کے لیے بہت اہم ہے۔ اسی لیے وہ اس کو اپنے سے بہت اونچا کوئی مافوق الفطرت شخص مانتے ہیں۔ اسی لیے اس کی عزت بھی کرتے ہیں۔

مگر طوطا اس کی ایک نہیں سنتا۔ وہ ایک دم شوخ ہو گیا ہے۔ جب ٹام کو اس کی خوراک

دینے میں دیر ہو جاتی ہے تب وہ گالی بکنا شروع کرتا ہے۔

بیٹا، بیٹا، بیٹا......!

حرامی، حرامی......!

سالا......!

اس کو یہ گالیاں مالکم کجور کے بیٹے جوکھیم کجور نے سکھائی ہیں۔ جوکھیم بستی کا سب سے بدمعاش لڑکا ہے مگر سب سے تیز بھی ہے۔ رانچی کے کسی مشن اسکول میں پڑھتا ہے۔ اس کے باپ نے اس کو ایک سائیکل خرید دی ہے اسی سائیکل پر وہ روزانہ اسکول جاتا ہے۔ اور روزانہ اسکول جاتے ہوئے اور اسکول سے واپس آتے ہوئے سائیکل کی گھنٹی زور زور سے بجاتا ہے۔ طوطا گھنٹی کی ہر آواز پر ایک گالی اچھالتا ہے۔ اور ٹام اپنی چھڑی لہرا کر طوطے کو دھمکاتا ہے۔ طوطا اس سے نہیں ڈرتا جیسے جوکھیم نہیں ڈرتا۔ جس دن اسکول میں چھٹی ہوتی ہے اس دن جوکھیم سارا دن ٹام کا بھیجا چاٹتا ہے۔

''آپ کو اکیلے ڈر نہیں لگتا—؟''

''میں اکیلا کب رہتا ہوں یہ جو میرے ساتھ رہتے ہیں—!'' وہ جانوروں کی طرف اشارہ کرتا۔

''یہ آدمی ہیں—؟'' وہ تعجب سے پوچھتا۔

''یہ آدمیوں سے اچھے ہیں—!''

''مگر آدمی کو آدمیوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔'' لڑکا عقلمندی کا اظہار کرتا۔

''آدمی جب روبوٹ ہو جائیں تو یہ جانور ہی بھلے—!''

جوکھیم دسویں کا طالب علم ہے، وہ روبوٹ کے معنی جانتا ہے مگر یہ نہیں جانتا کہ آدمی کب روبوٹ بن جاتا ہے۔ اس لیے وہ ٹام کو اگر پورا نہیں تو آدھا پاگل ضرور سمجھتا ہے۔ پھر وہ اپنی بات پلٹتا ہے۔ ''تمہیں تمہارا گھر نہیں یاد آتا؟— تمہارے بچے......؟''

ٹام کو کیا یاد آتا ہے کیا یاد نہیں آتا یہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ کسی کو بتاتا بھی نہیں۔ اس سے بارہا یہ سوال کیا گیا ہے بارہا لوگوں نے وہ وجہ جاننے کی بھی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے اس نے اپنا ملک چھوڑا۔ لوگ یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ کیا وہ یہاں خوش ہے— وہ سارے سوالوں کے جواب دے سکتا ہے مگر دیتا نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر وہ اس سلسلے میں کچھ بولے گا تو لوگ اس کو اور پاگل سمجھیں گے۔ مگر جوکھیم کو وہ بہت خوش دلی سے بتاتا ہے۔

''میرا گھر یہیں ہے۔ میں پچھلے جنم میں یہیں پیدا ہوا تھا—!''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ آپ پچھلے جنم میں یہیں پیدا ہوئے تھے—؟''

''مجھے معلوم ہے، یہاں ہمارا گھر تھا ایک، چھوٹا سا، مٹی کا۔ اور اس میں تمہاری آنٹی رہتی

تھی—!''

''آنٹی—؟'' جوکھیم تعجب سے پوچھتا ''آنٹی بھی کیا آپ ہی کی طرح گوری تھی—؟''

وہ خوب ہنستا پھر بتاتا:

''نہیں کالی تھی' ایک دم کالی' جیسے تم لوگ ہو۔اے بلیک جوئیل......''

''پھر—؟'' وہ آگے جاننے کے لیے بے چین ہو جاتا۔

''پھر آگے مجھے کچھ یاد نہیں آتا—!''

جوکھیم پوچھ پوچھ کر مایوس ہو جاتا تو طوطے کے پاس چلا جاتا۔

''بول مٹھو' آنٹی کالی تھی—''

طوطا پورا حملہ نہیں بول سکتا اس لیے بار بار دہراتا ہے۔

''کالی تھی......کالی تھی......کالی تھی......''

ٹام بہت پیار سے طوطے کو اور پھر اسی پیار سے جوکھیم کو دیکھتا ہے۔کہیں اندر تاریک گوشوں سے روشنی کی پھوہار سی گرنے لگتی ہے۔

رانچی شہر کے مضافات میں بسا ہوا یہ ایک آدی باسی قصبہ اتنا پرسکون ہے کہ لگتا ہے اس دور کی تہذیب کے مکار ہاتھوں نے اسے ابھی چھوا تک نہیں ہے حالانکہ شہر سے فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ بہت سے مرد شہر میں کام کرتے ہیں۔ بہت سی عورتیں بھی اپنی روزی روٹی اسی شہر سے حاصل کرتی ہیں۔ کتنے ہی بچے شہر کے اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ آنا جانا لگا رہتا ہے۔کبھی کبھی کیتھولک چرچ کے پادری بھی وعظ دینے آ جاتے ہیں۔ مگر جیسے ہر موج چڑھتی ہے اور اتر جاتی ہے' نہ کچھ دے جاتی ہے نہ کچھ لے جاتی ہے' سب کچھ ویسے کا ویسا ہی رہتا ہے۔تہواروں میں لوگ چاول سے کشید کی جانے والی شراب ''راسی'' پیتے ہیں۔عورتیں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کچھ ناچ ناچتی ہیں۔ ڈھول اور مردنگ بجتے ہیں۔ اور عام طور پر یہ سب کچھ ٹام صاحب کے احاطے میں ہوتا ہے۔ اس دن ٹام صاحب اپنا اکلوتا سوٹ نکال کر پہنتا ہے جو دھلائی اور پریس نہ ہونے کی وجہ سے ایک دم بدرنگ اور بدوضع ہو گیا ہے۔ اس دن وہ چاول سے کشید کی جانے والی شراب بھی پیتا ہے اور ناچ کے دوران اور لوگوں کے ساتھ ساتھ تالی بھی پیٹتا ہے— زندگی یہاں ایک ندی کی طرح پرشور نہیں بلکہ ایک جھیل کی طرح پرسکون ہے' پرسکون' گہری اور ناقابل تبدیل۔

مگر یہ ٹام صاحب کا بھرم تھا کہ یہاں کچھ بھی تبدیل نہیں ہو سکتا۔ بہت آہستہ آہستہ' بہت زیریں سطح میں ایک تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ لوگوں کی بات چیت میں الفاظ میں' گانوں کے بول میں' لباس میں اور خیالوں میں بھی۔ ٹام جیفرسن جو اپنے احاطے سے کبھی باہر نہیں نکلتا اس کو کیا معلوم کہ سارا آدی واسی علاقہ آہستہ آہستہ کروٹ لے رہا ہے' مگر نیند ٹوٹنے کی وہ کیفیت جب رفتہ رفتہ حواس

مجتمع ہونا شروع ہوتے ہیں اور دھیرے دھیرے ادراک پیدا ہونے لگتا ہے' تقریباً صاف دکھائی دے رہا ہے۔

اس بات کا احساس ٹام جیفرسن کو اس دن ہوا جس دن قصبے سے شہر کام کرنے گئی تین لڑکیوں کا اغوا کرلیا گیا۔ جب اندھیرا ہونے کے بعد بھی لڑکیاں واپس نہیں آئیں تو گاؤں میں عام بے چینی پھیل گئی۔ لوگ جو اندھیرا گہرا ہونے کے فوراً بعد اپنے گھروں میں بند ہوجانے کے عادی تھے باہر جگہ جگہ دو دو چار چار کی ٹولیوں میں جمع ہوکر باتیں کرنے لگے۔ پھر نوجوانوں کی ایک ٹولی شہر پتا لگانے کے لیے بھیجی گئی۔ ساری رات بستی میں کوئی نہیں سویا۔

صبح کو معلوم ہوا کہ تین لڑکیوں میں ایک کا قتل ہوگیا ہے۔ دو لڑکیاں بے ہوش پائی گئیں۔ ڈاکٹری جانچ کے مطابق ان تینوں لڑکیوں کے ساتھ کئی آدمیوں نے ریپ کیا تھا۔ ریپ کرنے والے کون تھے اس کا بھی ایک حد تک پتا چل گیا۔ یہ شہر کے کچھ ایسے بااثر لوگ تھے جن پر ہاتھ ڈالنے میں پولیس آنا کانی کررہی تھی۔ ایسی کوشش کی جارہی تھی کہ معاملہ کو رفع دفع کردیا جائے۔ تبھی کالج کے آدی باسی لڑکوں نے تھانے کا گھراؤ کرلیا۔ اور مشتعل ہوکر پتھر برسانے لگے۔ جواب میں پولیس نے لاٹھی چارج کیا جس میں کئی لڑکوں کو چوٹیں آئیں۔

یہ ساری خبریں بستی والوں کے لیے انتہائی حیرت انگیز تھیں۔ پہلے تو کسی کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیا ہوا۔ پھر جیسے دھیرے دھیرے آگ سلگنے لگی۔ دھواں اٹھنے لگا گرمی بڑھنے لگی۔ لوگوں کے دل و دماغ دھکنے لگے۔ سائیکلیں قصبے سے شہر اور شہر سے قصبے دوڑنے لگیں۔

دوسرے دن سارا رانچی شہر بند ہوگیا۔ بند کا اعلان جھارکھنڈ اسٹوڈنٹ فیڈریشن نے کیا تھا طے ہوا کہ اسی دن قصبے سے ایک جلوس نکال کر رانچی ڈپٹی کمشنر کے اجلاس میں احتجاج کے لیے لے جایا جائے صبح سے آس پاس کے دیہاتوں سے' بلکہ دور دراز کی بستیوں سے پیدل اور بیل گاڑیوں میں لوگ آنا شروع ہوئے۔ جنگل کے انتہائی اندرونی علاقوں سے بھی لوگ پہنچے تھے۔ شانوں پر کمان سجائے' پیچھے پشت پر ٹنگے بانس کے ترکش میں تیروں کا گچھا لیے ڈھول بجاتے نگاڑے پیٹتے۔

دوپہر سے پہلے پہلے ساری بستی اجنبی انجان لوگوں کی بھیڑ سے بھر گئی تھی۔ کہیں ذرا سی جگہ نہیں بچی تھی۔ ٹام جیفرسن کا احاطہ کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ پھر جیپوں اور کرائے کی ٹیکسیوں پر لیڈروں کی آمد شروع ہوئی۔ نعروں کی گرج سے جیسے سارا ارض و سما بھر گیا۔

جھارکھنڈ راج — زندہ باد' زندہ باد
خون کا بدلہ — خون سے لیں گے
ہتیاروں کو — پھانسی دو

پھر ساری بھیڑ قصبے سے نکلنے والے راستے پر یوں بہنے لگی جیسے پانی کسی جھیل کا کنارہ توڑ

کر نکلا ہو۔

جب جلوس دور چلا گیا اور سارا قصبہ تقریباً خالی ہو گیا تب ٹام جیفرسن نے بند دروازے سے جھانک کر، آ کر اس نے ایک دم ویران احاطے کو دیکھا۔ سنسان قصبے پر نظر ڈالی اور پہلی بار گالی دی۔

''حرامی—!''

طوطا زور زور سے چیخنے لگا۔

''حرامی، حرامی، حرامی......''

بندر تیز آواز میں کھوکھیائے۔ ان کے بچوں نے بھی دانت نکوسے ٹام کو سالہا سال کے بعد پہلی بار غصہ آیا۔ اس نے چھڑی اٹھائی اور سچ مچ بندروں پر برسانے لگا۔ بندر جو اس فن کے ماہر ہوتے ہیں، ہر وار بچا جاتے۔ جب وہ تھک کر پسینے پسینے ہو گیا تو اس نے چھڑی پھینک دی۔

''سالے حرام زادے......''

طوطا چلانے لگا:

''سالے، سالے، سالے......''

ٹام اس کی طرف لپکا— ''آج میں تمہاری گردن مروڑ دوں گا— ''طوطا سہم کر پنجرے کے آخری سرے میں سمٹ گیا۔

وہ برآمدے سے نیچے اترا۔ احاطے میں بہت سی غیر ضروری چیزیں پڑی تھیں۔ پکوڑیاں کھا کر پھینکے گئے پتے، پاؤ روٹی کا رنگین ریپر، سگریٹ کا ایک آدھ خالی پیکٹ، اینٹیں اور چھوٹے پتھر جن کو لوگوں نے بیٹھنے کے لیے استعمال کیا تھا۔ روندی ہوئی گھاس اور ایک خاموش پراسرار سناٹا۔ وہ لٹا لٹا سا کھڑا رہا۔

برسوں بیت گئے اسی طرح کے ہنگاموں میں، قصبے کی آہستہ خرام زندگی اچانک اتنی تیز ہو گئی کہ رفتار کی رو میں آس پاس کی چیزیں دکھائی بھی نہ دیتیں۔ ایسی ہی قریب کی چیزوں میں ٹام جیفرسن کا احاطہ بھی تھا۔ اب اس احاطے میں محفلیں نہیں جمتی تھیں۔ عورتوں اور بچوں کی ٹولیاں اب اتوار کے دن بھی اس کے جانوروں کے ساتھ چہلیں کرنے نہ آتیں۔ عورتوں نے بچے ہوئے کھانے اور مردوں نے وقتاً فوقتاً کی جانے والی مالی مدد بھی بند کر دی تھی۔ اب انہیں پارٹی کے لیے طرح طرح کے چندے دینے پڑتے تھے۔

جو کھیم کجور کو ایک دن اچانک خیال آیا کہ اس کو ٹام جیفرسن کے پاس چلنا چاہیے۔ اس کو شہر میں، ایک لاٹھی چارج میں چوٹ لگی تھی۔ پاؤں کی ہڈی ٹوٹی تو نہیں تھی مگر اس چوٹ نے اس کو ہفتوں کے لیے بیکار کر دیا تھا۔ انہی بیکاری کے دنوں میں ایک دن وہ چھڑی ٹیکتا ہوا ٹام کے احاطے

میں جا پہنچا۔اس کو یہ دیکھ کر افسوس سا ہوا کہ احاطے کی رونق ہی ختم ہوگئی ہے' اس نے سب سے پہلے طوطے کا پنجرہ ہلایا۔

''بول مٹھو حرامی......''

طوطا کچھ بولنے کی بجائے ایک طرف کو سمٹ گیا اور خائف نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔اس کو بڑی حیرت ہوئی پھر اس نے بندروں اور خرگوشوں کے پنجروں پر نظر کی تو چونک گیا۔ بندر کے دونوں بچے غائب تھے اور خرگوشوں میں صرف چار خرگوش تھے اور وہ بھی پنجرے میں بند' جبکہ ہمیشہ کھلے رہتے تھے۔''بندر کیا ہوئے انکل—؟'' اس نے ٹام سے پوچھا جو اس کو دیکھ کر اندر سے باہر نکل رہا تھا۔

''بیچ دیے—!''

''بیچ دیے—؟ کیوں—؟''

''کیا کرتا'' کہاں سے کھلاتا انہیں؟ لوگوں نے یہاں آنا بند کر دیا۔کوئی پیسوں کی مدد بھی نہیں کرتا۔لوگوں کو ان سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی۔اب وہ لیڈری کرتے ہیں۔نعرے لگاتے ہیں۔ بندوں کا اہوان اور پہیہ جام مظاہرے اور احتجاج۔وہ چھوٹا ناگپور کی آزادی لیں گے۔جھاڑ کھنڈ......''

ٹام جیفرسن کے الفاظ میں نہیں لہجے میں کچھ تھا۔حقارت' یا کوئی ایسی چیز جس نے جوکھیم کو برافروختہ کر دیا شاید وہ الجھ پڑتا۔مگر اب وہ بڑا ہو گیا تھا۔کالج میں پڑھتا تھا۔تاریخ کی کتابوں نے اس کی عمر ہزاروں سال لمبی کر دی ہے۔چنانچہ وہ خوش دلی سے بولا:

''آزادی—؟ یہ لفظ تو ہم نے چھوٹا ناگپور کے جنگلی درختوں کے ایک ایک پتے پر لکھ دیا ہے۔''

ٹام جیفرسن کی نیلی آنکھیں ایک دم چھوٹی ہوگئیں۔ہونٹ کھنچ گئے۔اس نے ایسے پوچھا جیسے انگلینڈ ہندوستان سے پوچھ رہا ہو:''تم آزادی کا مطلب جانتے ہو؟''

''جوکھیم نے مسکرا کر جواب دیا— ''ہم آزادی کا مطلب جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں مگر غلامی کا مطلب ضرور جانتے۔ان کی طرح—!'' اس نے پنجروں کے جانوروں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ غلام ہیں—؟ میں برسوں سے مختلف خطرات سے بچاتے ہوئے ان کی پرورش کر رہا ہوں۔یہ تو میرے بچے ہیں—!'' جوکھیم ہنس دیا۔''اس طرح کے جملے تاریخ میں بار بار دہرائے گئے ہیں— میری پرجا......میری رعایا......میری اولاد......مگر ان سب کے پیچھے ہمیشہ ایک جذبہ حکمرانی پوشیدہ رہا یا پھر خوف۔سب کچھ تیاگ کر جنگل میں آ بسنے والا سنت بھی اس جذبے کو نکال نہ سکا—!''

''تمہارا مطلب ہے......؟''

"ہاں وہی مطلب ہے میرا......"

تھوڑی دیر کے لیے ایک دل آزار خاموشی چھا گئی۔ جوکھیم اٹھا' جانے کی اجازت چاہی پھر جاتے جاتے پلٹ کر بولا: "جب طوطے بولنا چھوڑ دیں' بندر کھو کھیانا بند کر دیں اور خرگوش بھاگنا تو سمجھنا چاہیے کہ......"

اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اور چھڑی کے سہارے لنگڑاتا ہوا قدم قدم چل کر احاطے کے باہر ہو گیا۔ چار دنوں کے بعد یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ ٹام جیفرسن مر گیا ہے۔ جوکھیم وہاں لنگڑاتا ہوا پہنچا تو اس سے پہلے بہت سے لوگ وہاں پہنچ چکے تھے۔ ٹام جیفرسن کی لاش کو فرش سے اٹھا کر اس کی ٹیم کھاٹ پر لٹا دیا گیا تھا اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور منہ کھلا ہوا تھا۔ جوکھیم کو دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ٹام جیفرسن کے پنجروں کے سارے پٹ کھلے تھے اور سارے جانور غائب......اب یہ کہنا مشکل ہے کہ ٹام جیفرسن نے ان پنجروں کے پٹ کھول دیے تھے' یا خود جانور نکل بھاگے۔

❀ ❀ ❀

آمنہ ابوالحسن

لحاف

کام کرتے کرتے مہر کی نگاہ اچانک دھوپ میں پھیلے ہوئے لحاف پر پڑی تو اُسے بڑی شرمندگی سی محسوس ہوئی۔ لحاف بہت میلا ہو چکا تھا اور جہاں جہاں سے ادھڑ گیا تھا سیا ہوا تھا۔ جب یہ لحاف نیا تھا تو اس کا ''کلر کامبینیشن اور ڈیزائن دیکھ دیکھ کر مہر بہت خوش ہوا کرتی تھی۔ کیسے روشن روشن رنگ اور کتنے نازک بیل بوٹے! ہر صبح جب وہ بستر صاف کیا کرتی تو بہت ہلکے ہاتھوں سے لحاف کو جھٹکتی۔ اس کی شکنیں نکالتی تب ایسی احتیاط اور سلیقے سے اس کی تہہ لگاتی جیسے اس کے ہاتھوں میں لحاف نہیں کوئی زندہ چیز ہو۔

مہینوں وہ اسی نازک ذہنی سے اس کی حفاظت کرتی رہی مگر شکیل لحاف کو کوئی جاندار چیز نہیں سمجھتا تھا بلکہ صرف استعمال کی ایک چیز۔ جب تک لحاف بہت نیا تھا وہ ذرا محتاط رہا مگر پھر جیسے جیسے دن گزرنے لگے اس کی احتیاط ختم ہوتی گئی۔ اس کی ابتدا کی عادت تھی کہ لحاف کو اپنے اطراف غلاف کی طرح لپیٹ کر سویا کرتا اور اتنا کس لیتا کہ لحاف خود اس کی جان کا ایک حصہ بن جاتا۔ کچھ عرصے تک لحاف نے شکیل کا کساؤ بڑے استقلال سے برداشت کیا۔ مگر پھر احتجاج کے طور پر اس کے ٹانکے جگہ جگہ سے ٹوٹنے لگے اور روئی کی جمی ہوئی پرتیں اکھڑ اکھڑ کر چھوٹی چھوٹی گیندوں کی شکل اختیار کرنے لگیں۔ جب مہر شکیل کو ایسی بداحتیاطی کے لیے ٹوکتی تو وہ سن کر کہتا۔

''ارے لحاف ہی تو ہے جان۔ کتنا بھی نیا ہو کبھی نہ کبھی تو پرانا ہو ہی جائے گا اور پھر استعمال کی چیز کو نمائشی طور پر برتنا مناسب بھی تو نہیں۔ مجھے تو بس ایک ہی چیز کی حفاظت اچھی لگتی ہے وہ صرف تم ہو۔ بقیہ سب تو......

وہ اپنی بات یہیں ختم کر کے جب مہر کو اپنی مضبوط بانہوں میں کس لیتا تو مہر لحاف سے بے دردی کا غم بھول کر محبت بھرے لمس کے بے پناہ اور خوابناک جزیرے میں اتر جاتی اور پھر اس جزیرے کے سوا اسے کچھ اور یاد نہ رہ جاتا۔

دو جاڑے اسی لحاف میں شکیل اور مہر نے بخیر و خوبی گزار دیئے مگر تیسرے جاڑے میں چونکہ افشاں بھی ان کی زندگی میں شامل ہوگئی لہٰذا مہر نے شکیل کے لیے نیا لحاف خرید لیا اور پرانے

لحاف کے ٹوٹے ہوئے ٹانکے ٹھیک کر کے اسے اپنے اور افشاں کے استعمال میں لے لیا۔ افشاں کافی صحت مند تھی۔ اُس کی سبھی عادتیں صحیح تھیں مگر ایک کمزوری یہ تھی کہ رات میں کئی بار بستر گیلا کر دیتی۔ اگرچہ مہر نے لحاف کو گیلا ہونے سے بچانے کی خاطر ایک ہلکی سی دلائی بھی لحاف کے اندر استعمال کرنا شروع کر دی مگر اس احتیاط کے باوجود سوتے میں کروٹیں بدلنے سے ہلکی دلائی اِدھر اُدھر سرک جاتی اور لحاف گیلا ہوئے بغیر نہ رہتا۔

شروع شروع میں مہر کو بہت جھلاہٹ اور کوفت ہوئی مگر پھر افشاں کی محبت کے آگے اُسے اس بات کی زیادہ پرواہ نہ رہی۔ پھر تو یہ معمول ہو گیا کہ ہر صبح مہر اس لحاف کو دھوپ میں پھیلا دیتی کہ ہر روز اس کا دھلنا ممکن نہ تھا۔ دن بھر کی دھوپ کھا کر ایک تو لحاف سوکھ جاتا دوسرے پیشاب کی بدبو مر جاتی یا کم از کم مہر کو محسوس نہ ہوتا مگر جب شکیل افشاں کے قریب لیٹتا تو ناک سکوڑ کے لحاف کو پرے سرکا دیتا اور مہر سے کہتا:

''افوہ! اتنا بدبودار لحاف کس طرح اوڑھ لیتی ہو اور غضب کہ افشاں کو بھی اڑھاتی ہو۔ اس سے صحت پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔ کیوں نہیں ایک نیا لحاف خرید لیتیں؟''

مہر مسکرائی۔

''نیا لحاف؟ خیال تو اچھا ہے مگر افشاں فوراً ہی اس کا بھی یہی حال کر دے گی۔ جب تک وہ بڑی نہیں ہو جاتی یا بستر گیلا کرنا چھوڑ نہیں دیتی نیا لحاف خریدنا بیکار ہے۔''

شکیل ہونٹ سکوڑ کر رہ جاتا۔ ''تم جانو'' اور پیشاب کی بدبو کو دبانے کے لیے ہر رات سونے سے پہلے مہر لحاف پر ہلکا ہلکا عطر مل دیتی مگر عطر کی خوشبو جلد ہی پیشاب کی بدبو سے مات کھا جاتی۔ کچھ عرصے کے بعد مہر نے عطر ملنا بھی چھوڑ دیا۔ وہ بدبو کی عادی ہو گئی اور افشاں کے ساتھ اسی لحاف میں مست نیند سونے لگی۔

اگرچہ سردی اور گزر گئی۔ افشاں نے بستر گیلا کرنا بھی چھوڑ دیا پھر بھی لحاف کو دھوپ کھلانا مہر کی عادت بن گئی تھی حالانکہ اُس کے بیل بوٹے اور رنگ دھوپ کھا کھا کر مدھم ہو چکے تھے۔ گیلا پن اور کثرت استعمال کی وجہ سے کناروں پر سے کہیں کہیں غائب بھی ہو چکے تھے پھر بھی مہر کی پسندیدگی اور وابستگی کی نظروں میں اب تک جوں کے توں محفوظ تھے۔

مصروفیات کی زیادتی کی وجہ سے اُس نے مدت سے نظر جما کر لحاف کو نہیں دیکھا تھا مگر جب افشاں اسکول جانے لگی تو اُسے اتنی فرصت ملی گئی کہ درہم برہم چیزوں کا جائزہ لے کر انہیں حسبِ ضرورت سدھار لے ایسے میں اس کی نگاہ دیر بعد لحاف پر پڑی تو اسے کافی شرمندگی ہوئی۔ ان کی معاشی حالت اب ایسی گئی گذری تو نہیں کہ اتنا ناصاف' میلا' پرانا لحاف ضروری استعمال کیا جائے۔ یہ تو شکیل کے سماجی وقار کے منافی بات ہوئی چنانچہ وہ فوراً اُسی روز جا کر ایک نیا لحاف خرید

لائی۔

شکیل نے جب نیا لحاف دیکھا تو خوش ہو کر بولا: ''ولڈن' یہ ہوئی نا بات کچھ۔ چیزوں کے استعمال کی بھی ایک حد ہوا کرتی ہے جانِ من جس کے بعد انہیں خیر باد کہہ دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ دیر سے سہی مگر تم نے اسے رخصت تو کیا۔ شکریہ!''

اس رات بھی اپنا لحاف چھوڑ کر نئے لحاف میں مہر اور افشاں کے ساتھ خوب مزے سے سویا۔ لیکن اگلی رات مہر کو بالکل نیند نہیں آئی۔ رات بھر وہ بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہی اور بار بار اُس ڈھیر کو دیکھتی رہتی جہاں فاصل غیر ضروری بستروں کے ساتھ پرانا لحاف بھی پڑا ہوا تھا۔ اُسے عجیب بے قرار محسوس ہوئی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ نئے لحاف کی ملائم روئی جمی ہوئی دبیز پرتوں کی خوشگواری کو قبول کرے۔ اس کے دل آویز رنگ روپ اور نئے پن کی دمک سے لطف اندوز ہو مگر خوبصورت یادوں کی مسرت اور گزری زندگی کے لطیف ترین لمحات جو نہایت پرانے لحاف سے وابستہ تھی وہ ہر روز چاہنے پر بھی لحاف کی راحت نہ بن سکی۔ وہ اس کے بیاہ کا لحاف تھا جس میں اس کی سہاگ رات محفوظ تھی شکیل کی جیتی جیتی مردانہ خوشبو اب بھی کہیں نہ کہیں دبی سانسیں لے رہی تھی۔ خود اس کی اپنی بھرپور نسائیت کا افتخار شکیل سے افشاں کا حاصل کرنا اور افشاں کے چھٹپن کی معصوم بھینی مہک اور مٹھاس!

بڑے غرور سے مسکرا کر یکایک وہ اٹھی۔ نیا لحاف اس نے افشاں کو اڑھایا اور خود کو پرانے لحاف سے ڈھک لیا۔ روٹھی ہوئی نیند اُس کی آنکھوں میں آ گئی۔

صبح شکیل نے جاگ کر دیکھا تو برا سا منہ بنا کر بولا:

''یہ کیا' پھر یہ میلا لحاف؟ اسے پھنکوا کیوں نہیں دیتیں اب؟''

مگر بغیر کہے نہایت خاموشی اور سکون سے اٹھ کر مہر نے اسے ہمیشہ کی طرح دھوپ میں پھیلا دیا اس شرمندگی سے بالکل بے نیاز کہ آنے جانے والے یا پاس پڑوس اس لحاف کو دیکھ کر ان کے سماجی مقام کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے......

❁❁❁

سلطان سبحانی

زیریں دُنیا کی نگاہیں

آخری بیڈ پر وہ سانولی سلونی عورت اور اُس کی آنکھیں —
ایسی آنکھیں کہ جیسے چمکتے ہوئے آئینے میں خنجروں کا عکس!
خنجروں کا عکس یا کوندتی ہوئی بجلیاں؟
نہ جانے اُن آنکھوں میں کون سی برساتیں ہیں' کون سا طلسم ہے کہ انہیں دیکھ کر مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی ہے......''

وہ اس عورت کی طرف سے توجہ ہٹا کر اِدھر اُدھر دیکھتی ہے اور سوچتی ہے''۔ اسپیشل وارڈ میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ جسے محفل اور تنہائی یا جیسے تہ خانہ اور برآمدہ — اسپیشل وارڈ میں انسان صرف اپنے آپ کو یا صرف اپنے ملنے والوں کو دیکھ سکتا ہے لیکن جنرل وارڈ میں پوری دنیا دکھائی دیتی ہے۔ ہر طرح کے لوگ...... ہر طرح کے مریض...... ایک بہت بڑا خاندان — میں اس وارڈ میں آکر خوش ہوں لیکن کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے یہ ہسپتال گورستان کا کوئی حصہ ہے۔ یہاں سے کوئی خفیہ' کوئی پراسرار یا کوئی چور راستہ قبرستان کے اندر تک پہنچ گیا ہے۔ ان پندرہ دنوں میں پانچ چھ مریض اس طرف پہنچ گئے افسوس......''

وہ اپنے بیڈ سے اٹھ کر بہت آہستہ آہستہ ایک ایک قدم اور اس کے ساتھ اپنا توازن سنبھالتی ہوئی کھڑکی تک جاتی ہے اور باہر دور تک دیکھتی ہے۔ پرشور مین روڈ پر کاروں' بسوں' اسکوٹروں اور آنے جانے والوں کی بھیڑ اور بھیڑ میں ہلچل — وہ گھوم کر دیوار گھڑی کی طرف دیکھتی ہے۔

''ساڑھے چار بج چکے ہیں — بس ابھی کچھ دیر بعد ہسپتال کا گیٹ کھل جائے گا۔ اُف پاؤں میں درد ہونے لگا ہے۔''

وہ واپس آکر بیڈ پر نیم دراز ہو جاتی ہے۔ وارڈ میں ڈاکٹر اور دو تین نرسیں موجود ہیں۔ اس کی نگاہیں آخری بیڈ پر جاتی ہیں۔ سانولی عورت گم صم دیوار گھڑی کی طرف دیکھتی ہوئی نظر آتی ہے۔

وہ پھر سوچنے لگتی ہے۔ ''شاید اسے کسی کا انتظار ہے' لیکن اس عورت کے چہرے پر انجماد سا کیوں ہے۔ تمام نقوش منجمد' کون سا مرض ہے اسے وارڈ میں آئے ہوئے کئی دن ہو چکے ہیں مگر ایک بار بھی اس کی آواز سنائی نہیں دی۔ ایک بار بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں آئی اور نہ ہی کوئی کراہ ابھری۔ اس کا جسم کتنا بھرا بھرا ہے' سانولا' مخروطی' جیسے پتھر کا کوئی مجسمہ' شاید کوئی محنت کش عورت ہے۔ میں نے ایسی آنکھیں کہیں نہیں دیکھیں جنہیں پڑھنا تو درکنار سمجھنا بھی مشکل ہو' اُف' پانچ بج گئے......''

وہ نگاہیں گھما کر دروازے کی طرف دیکھنے لگتی ہے۔

دروازے پر شور ہوتا ہے اور عیادت کرنے والے رشتے داروں اور شناساؤں کی ایک زبردست موج اندر گھس آتی ہے۔ وارڈ میں طرح طرح کے چہروں اور لباسوں کا میلہ لگ جاتا ہے۔ مُتاسف' سنجیدہ اور مسکراتے ہوئے چہرے۔ بیحد متضاد سماں' جیسے گلدان میں ستارے اور گھاس—— مزاج پرسی' تسلی' گپ شپ' بچوں کا شور اور اِدھر اُدھر کی خبریں۔

شیلف میں دودھ کی دو بوتلیں' دوائیاں' ٹفن اور فروٹ سج جاتے ہیں۔ ہر بیڈ کے پاس کچھ چہرے موجود' لیکن سب سے زیادہ بھیڑ اس کے پاس ہوتی ہے۔ پھولوں کے گچھے' طرح طرح کے پھل' مسکراتے ہوئے دور و نزدیک کے شناسا' رشتے دار اور اس کے دو تین اسٹوڈنٹس —— وہ ان سے گفتگو میں محو ہو جاتی ہے۔

''لگتا ہے اب آپ ٹھیک ہیں۔''

''ہاں' میں اب ٹھیک ہوں۔ آہستہ آہستہ چلنے لگی ہوں۔ چند روز بعد پاؤں کا پلاسٹر بھی کھل جائے گا لیکن فریکچر کا اثر تو مدتوں رہے گا۔'' اتنا کہہ کر وہ ہنسنے لگتی ہے۔ ''کالج گھر سے قریب ہی ہے مگر اب شاید رکشے پر جانا پڑے گا۔''

''بیٹی!'' ایک بزرگ کہتے ہیں: ''اس وارڈ میں کتنا شور ہے۔ تم اسپیشل وارڈ سے اس جنرل وارڈ میں کیوں آ گئیں؟''

''چچا—— وہاں زندگی کے آثار نہیں تھے۔ تنہائی' گھٹن اور خاموشی سے میں اکتا گئی تھی ایسا لگتا تھا جیسے قید ہوں۔ مگر یہاں آ کر لگ رہا ہے جیسے بھری پری دنیا میں واپس آ گئی ہوں یہاں ہر وقت کچھ انسانوں کے چہرے سامنے رہتے ہیں۔ وہ لوگ دل کے کتنے سخت ہوتے ہیں جو بیماری کے دنوں میں بھی اسپیشل وارڈ لیتے ہیں۔''

بزرگ مسکراتے ہیں: تمہارے خیالات بہت اونچے ہیں بیٹی۔ ہسپتال ایسی جگہ ہے جہاں آنے کے بعد انسان خودغرض ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے دکھ اور اپنی تندرستی کے سوا کچھ نہیں سوچتا وہ چاہتا ہے کہ ڈاکٹروں اور نرسوں کی ساری توجہ اور مہربانیاں اُس کے نام محفوظ ہو جائیں اُسے دوسرے

مریضوں سے ہمدردی نہیں رہتی۔''

وہ مسکرا کر دائیں سمت دیکھتی ہے لیکن — آخر بیڈ پر نگاہ پڑتے ہی کچھ لرز سی جاتی ہے۔ اس کی آنکھیں سانولی عورت کی آنکھوں سے ٹکرا جاتی ہیں اور محسوس ہوتا ہے جیسے ان کی باتیں وہ اپنی آنکھوں سے سن رہی ہے......

وارڈ میں چاروں سمت گفتگو جاری رہتی ہے۔

''بدری پرشاد! تم نے آنگن میں انار کے جو پودے لگائے تھے انہیں بکریاں چر گئیں۔''

''یہ ہسپتال ہے یا چوروں کا اڈا۔ کل یہاں سے کوئی میری لٹیا چرا لے گیا۔''

''میں کہتی ہوں سنو جی! بہو نے بیٹے پر جادو کر دیا۔ خوب سینما دیکھ رہے ہیں دونوں۔''

''دیدی یہ جو ہیڈ نرس ہے نا بہت ہی نک چڑھی ہے اور جو گوری سی ہے نا ذرا اس کا کاجل دیکھو۔''

''ماں ڈاکٹر نے جو پرچی دی ہے اس میں لکھی ہوئی دوائیوں کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ اب اپنا بچھڑا بھی بیچنا پڑے گا۔''

''خالہ آج محلے میں خوب جھگڑا ہوا' نل پر پانی بھرتے وقت' ہم نے تو آج سمدھن کی دال ہی بگھار کر رکھ دی۔''

''بھئی ہارون' یہ وارڈ بوائے چہرے سے بالکل میرا سالا لگتا ہے لیکن جسامت کی لحاظ سے ہو بہو میرا سسر' عجیب مجموعہ ہے یہ۔''

''ہوئے سردار جی۔ تم یہاں کیسے ٹپک پڑے؟''

''میاں خدا پر بھروسہ رکھو۔ تم بہت جلد صحت یاب ہو جاؤ گے۔ ہمت مت ہارو!''

''اوم نمشوائے......''

کچھ لمحوں بعد وہ پھر آخری بیڈ کی طرف دیکھتی ہے۔ سانولی عورت ایک ٹک دروازے کی طرف دیکھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اچانک محسوس ہوتا ہے کہ اس کی نگاہوں کا زاویہ بدل گیا ہے اور وہ اس کی طرف مسلسل دیکھنے لگی ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ اس کی نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی وہ سوچنے لگتی ہے۔

''آخر وہ عورت ہے کون' اسے کس کا انتظار ہے اور میں اس اجنبی عورت کے بارے میں اتنا کیوں سوچنے لگی ہوں اس کا میرا تعلق ہی کیا ہے۔

وہ مجھ سے اور میں اس سے بہت دور ہوں۔ درمیان میں سات بیڈ حائل ہیں۔ یہ سات بیڈ جیسے سات ندیاں ہیں' سات دریا ہیں' سات سمندر ہیں لیکن اس کے باوجود اس کے اور میرے درمیان فاصلہ کیوں نہیں ہے۔ کہاں گیا فاصلہ؟ شاید میں بہت زیادہ حساس ہو گئی ہوں۔ یا شاید کمزور

ہوگئی ہوں۔ اس کی نگاہوں کی تاب لانے سے آخر معذور کیوں ہوں کیا وہ عورت جادو جانتی ہے۔ دھت یہ سب بکواس ہے لیکن کوئی بات ضرور ہے۔ اس کی ساری قوت اس کی آنکھوں میں کیوں ہے؟''

رات میں وہ کافی دیر تک اس بارے میں سوچتی ہے— آج شام بھی اس سے ملنے کے لیے کوئی نہیں آیا۔ ممکن ہے اس کا کوئی نہ ہو۔ جس دن اسے یہاں ایڈمٹ کیا گیا تھا۔ کچھ لوگ آئے تھے۔ شاید اس کے پڑوسی تھے مگر بعد میں وہ پھر کبھی نہیں نظر آئے ان کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جنرل وارڈ میں بھی وہ بیحد تنہا ہے۔ تعجب کی بات ہے اتنے بڑے وارڈ بھی تنہائی؟ یہ وارڈ تو ایک ننھے منے جہان کی حیثیت رکھتا ہے۔ روزانہ صبح اور شام کے وقت گونج اٹھتا ہے۔ ایک چھوٹی سی دنیا اور آتی ہے یہاں۔ میں نے اسپیشل وارڈ کی بجائے جنرل وارڈ اسی باعث تو لیا ہے۔ اچانک یہ تضاد کہاں سے آ گیا۔ اس عورت نے تو ایک عجیب سی الجھن پیدا کر دی ہے۔ نہیں! میں اس کی نگاہوں سے مرعوب' خائف یا متاثر ہرگز نہیں ہوں۔

دوسرے دن دوپہر میں جب لیڈی ڈاکٹر اس کے پاس آتی ہے تو وہ اس سے پوچھتی ہے۔

''ڈاکٹر! وہ آخری بیڈ پر جو سانولی عورت ہے اسے کیا مرض ہے؟''

''کون وہ؟''— ڈاکٹر گھوم کر ادھر دیکھتی ہے: ''اس کی رپورٹ آج ہی آئی ہے۔ افسوس اسے بلڈ کینسر ہے۔''

''بلڈ کینسر؟'' وہ چونک پڑتی ہے۔

''ہاں''۔ ڈاکٹر کا چہرہ بہت سادہ نظر آتا ہے۔

وہ کسی سوچ میں کھو جاتی ہے۔ بہت گہری سوچ میں۔ پھر اسے محسوس ہوتا ہے کہ پاؤں میں درد کچھ زیادہ ہونے لگا ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بستر پر لیٹ جاتی ہے۔ بند آنکھوں میں بھی دو آنکھیں نظر آتی ہیں۔ کوندتی ہوئی بجلیاں ''کینسر'' وہ بڑبڑاتی ہے۔

شام میں پورا وارڈ گونج اٹھتا ہے۔ اس کے پاس تازہ پھولوں کے بہت سے گچھے آجاتے ہیں اور بہت سے ہمدرد چہرے تپائی پر بھی پھول...... بیڈ پر بھی پھول...... حال احوال......مزاج پرسی...... ادھر ادھر کی باتیں۔ وہ جیسے ایک خوشنما جال میں الجھ جاتی ہے لیکن اس کی نگاہیں اس جال کے اندر سے بھی آخری بیڈ پر مرکوز رہتی ہیں۔ جو حسبِ معمول سنسان نظر آتا ہے اور ہسپتال کا گیٹ بند ہونے تک وہاں اس عورت کے سوا اور کوئی دکھائی نہیں دیتا۔

رات میں وہ ایک نرس سے پوچھتی ہے ''وہ آخری بیڈ کی جو مریضہ ہے' کیا اس کا کوئی نہیں؟''

''یعنی؟''— نرس اس کی طرف دیکھتی ہے۔

''یعنی کہ...... رشتے دار وغیرہ۔''

''ہاں شاید اس کی ساس اور ایک جوان بیٹا ہے۔ ویسے مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔''

اُس کا جی چاہتا ہے کہ اٹھ کر وہاں تک جائے۔ اس سے کچھ باتیں کر کے اپنے دل و دماغ کا بوجھ ہلکا کرے مگر خیال آتا ہے— ''ان آنکھوں کے قریب جانا بے حد مشکل ہے۔ کوئی نامعلوم سا احساس دل میں پناہ گزین ہو گیا ہے۔ نہیں، بلکہ تیشہ بردار ہے جس کے باعث میں ان سے متاثر ہو گئی ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں نے اس عورت کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو۔ اس کی حق تلفی کی ہو جیسے مجھ سے کوئی لغزش ہوئی ہو یا جیسے...... نہیں! بہت مشکل ہے اصل وجہ کو چھونا۔ کاش احساس کا بھی جسم ہوتا، لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ ان نگاہوں کا مجھ سے ضرور کوئی واسطہ ہے۔ نگاہوں کی زبان بہت مشکل ہوتی ہے مگر میں انہیں پڑھنے کی کوشش کروں گی۔ آخر میں بھی نگاہیں رکھتی ہوں کل میں وہاں تک ضرور پہنچوں گی۔

دوسرے دن دوپہر کے وقت وہ اپنے احساسات کا سمندر اٹھائے اور خود اپنا توازن سنبھالے وہاں تک پہنچتی ہے۔ اسے دیکھ کر سانولی عورت کی آنکھیں حیرت سے پھیل جاتی ہیں اور وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں بہت ساری پرچھائیاں نظر آتی ہیں۔ تعجب تجسس— تذبذب......

''میں کئی دنوں سے تم سے ملنا چاہتی تھی''۔ وہ مسکرا کر قریب رکھا ہوا اسٹول کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ جاتی ہے۔ ''کیسی طبیعت ہے؟''

''کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں کیسی طبیعت ہے۔ ہاں آپ بتائیے، آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' اس کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔

''میں ٹھیک ہوں''۔ وہ اس کی آنکھوں کو نظر انداز کر کے گفتگو کے دروازے کو خفیف سی جنبش دیتی ہے۔ جنبش ہوتی ہے تو دروازہ کھلتا ہی چلا جاتا ہے۔ اور پورے کھلے ہوئے دروازے سے اندر کے بہت سارے مناظر سامنے آجاتے ہیں۔ وہ ایک گھنٹے تک اس سے گفتگو میں محو رہتی ہے۔ اس ایک گھنٹے میں ایسا لگتا ہے کہ جیسے اس نے ایک دوسری دنیا کی دریافت کر لی ہے۔ ایک زیریں دنیا جو بظاہر روپوش ہے اور کسی کو نظر نہیں آتی مگر جہاں احساسات جسم بن کر چلتے ہیں اور لاشیں بولتی ہیں۔

وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے واپس آ کر اپنے بیڈ پر نیم دراز ہو جاتی ہے۔ سوچ کا ایک زبردست سیلاب دماغ میں شور مچاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ پورے جسم میں لہریں سی چلنے لگتی ہیں۔ آنکھیں چھت پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور وہ جیسے اپنی آنکھوں سے علیحدہ ہو کر سیلاب کے ہمراہ ہو لیتی

ہے۔

''ان آنکھوں کا مطلب اب سمجھ میں آیا۔ میں صحیح سوچتی تھی کہ یہاں سے کوئی خفیہ' کوئی پراسرار یا چور راستہ قبرستان کے اندر تک پہنچ گیا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس جنرل وارڈ میں کوئی اتنا تنہا ہے کہ اس کا پورا وجود مسمار ہو چکا ہے۔ اس کی حیثیت یوں ہے کہ جیسے وہ اپنے وطن میں اجنبی ہو۔ اس دنیا میں ہم نے قدم قدم پر امتیازات کے جال بچھا رکھے ہیں۔ جس کے باعث بہت ساری آنکھیں اتنی حسرتناک ہوگئی ہیں کہ ان میں زندگی کا پورا المیہ کھینچ کر چمک اٹھا ہے۔ وہ عورت...... وہ سانولی سی عورت...... وہ آخری بیڈ پر نیم دراز کینسر کی مریضہ' پوری علامت ہے اس حسرتناک زیریں دنیا کی جو ہماری امتیازات سے وجود میں آئی اور میں یقیناً قابل ملامت ہوں۔ کیونکہ میرے باعث یا مجھ جیسے ہی دوسرے خوش خیال یا خوش لباس والوں کی وجہ سے اس وارڈ میں یہ ہوا چلی۔ یہ ہوا جتنے عرصے سے چل رہی ہے تقسیم کا بہت سارا عمل یہاں تحریک پا رہا ہے۔ اگرچہ میرے خیالات بہت الگ ہیں۔ میں امتیاز کے سارے پیمانوں اور میزان کو ٹھوکر مارتی ہوں۔ تعجب ہے کہ میں خود اس حصار میں کیسے پھنس گئی......کیا میں بھی خودغرض ہوگئی تھی؟''

وہ دیوار گھڑی کی طرف دیکھتی ہے پھر پورے وارڈ کا جائزہ لیتی ہے۔

''میری طرح اس وارڈ میں اور بھی کئی ہیں جو کسی بڑی شخصیت کی سفارش سے یہاں ایڈمٹ ہوئے ہیں یا جن کی پشت پر کسی نہ کسی کے وسیلے کی مہر لگی ہوئی ہے۔ جن پر ڈاکٹر اور نرس زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ انہیں خون اور گلوکوز کی بوتلیں' انجکشن اور دوائیاں وغیرہ سب ہسپتال سے مل جاتی ہیں۔ دواؤں کے لیے انہیں اپنے برتن بکری یا بچھڑے وغیرہ بیچنا نہیں پڑتے ان کے پاس عمدہ غذائیں آ جاتی ہیں۔ فروٹ' دودھ کی بوتلیں' پھول اور خوش لباس وزیٹروں کی پھول دار باتیں۔ ان کی خدمات وارڈ بوائے پابندی سے انجام دیتے ہیں۔ ڈاکٹر وقت پر وزٹ دیتے ہیں لیکن اسی ہسپتال میں کوئی مریض ایسا بھی ہے......وہ آخری بیڈ کی طرف دیکھتی ہے۔'' جس کی حیثیت ایک لاوارث لاش کی طرح ہے جس کے پاس کوئی ہمدرد عیادت کے لیے نہیں پہنچتا۔ ہر شام جب یہاں وزیٹروں کا میلہ لگ جاتا ہے اس وقت بھی وہ تنہا رہتی ہے۔ کیونکہ اس کی دنیا بہت چھوٹی سی ہے۔ صرف ایک جوان بیٹا اور ایک ساس......اور ایک بہت بڑی بیماری...... بلڈ کینسر اور اس سے بڑی بیمار یہ پھول دار دنیا۔ یہ ہسپتال اور یہاں کا منظر۔ وہ مریض اس ہسپتال میں یہ مناظر دیکھنے اور حسرتوں کا کفن کمانے کے لیے نہیں آیا ہے اور نہ ہی اپنی آنکھوں میں حسرتوں کا آئینہ چمکانے کے لیے......''

وہ سوچتے سوچتے تھک سی جاتی ہے مگر پر سوچنے لگتی ہے''۔ اس سانولی عورت نے مجھ سے کہا تھا۔ آپ شاید بہت بڑے گھر کی ہیں...... آپ کے پاس ملنے والوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ ڈاکٹر اور نرس آپ پر کتنی توجہ دیتے ہیں...... اور بھی بہت کچھ کہا تھا......لیکن اس نے یہ بھی کہا تھا

''خدا کرے آپ جلد ٹھیک ہو جائیں''۔اس وارڈ میں آپ نے میرا حال پوچھا: ''آپ یقیناً ایک انسان کے درد کو ایک عورت کے دل کو سمجھتی ہیں......''

''پانچ بج رہے ہیں''۔ وہ بڑبڑاتی ہے۔''بس ابھی ہسپتال کا گیٹ کھل جائے گا اور وہ عورت اور بھی تنہا ہو جائے گی۔اسے شاید خبر نہیں کہ میں کوئی بڑے گھر کی نہیں ہوں۔صرف میرا تعلق بڑی دنیا سے ہے''۔وہ سامنے دیکھتی ہے۔

گیٹ کھل جاتا ہے۔لوگ آنے لگتے ہیں۔ وارڈ میں شور ہونے لگتا ہے۔خوشنما لباس' خوشنما باتیں' شیلف سجنے لگتے ہیں۔اس کے پاس رشتے داروں اور جاننے والوں کی ایک موج سی چلی آتی ہے۔ایک عزیز پھولوں کا گچھا پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

''کوئی فکر مت کرنا تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

''شکریہ ــــ'' وہ پھول لیتے ہوئے آخری بیڈ کی طرف دیکھ کر کہتی ہے: ''میں تو ٹھیک ہو ہی جاؤں گی لیکن جو روگ ہسپتال میں لگ جاتا ہے۔اس کا علاج شاید کسی کے پاس نہیں ہے۔''

❁ ❁ ❁

انور خاں

راستے اور کھڑکیاں

آفس کے ایک ساتھی کی مدد سے کمرہ مل ہی گیا۔ میں ان کے ساتھ کمرے پر پہنچا تو کمرے کے مالک شرما جی موجود نہیں تھے۔ بہرحال کمرے کی چابی میرے ساتھی ان سے پہلے لے چکے۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ کمرے میں بیٹھ کر ان کا انتظار کریں۔ ہم نے کمرہ کھول لیا۔ کمرہ کچھ زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن شرما جی کا سامان بھی مختصر ہی تھا۔ ایک تپائی، دو کرسیاں اور ایک چھوٹا سا کپ بورڈ۔ میں بستر اور سوٹ کیس ساتھ لایا تھا۔ وہ ایک طرف میں نے رکھ دیا اور کرسیوں پر بیٹھ کر میں اور میرے ساتھی ان کا انتظار کرنے لگے۔ مجھے شرما جی کے ساتھ رہنا تھا۔ اسے بھی میں نے غنیمت سمجھا۔ ورنہ کمرے کی پگڑی ڈیڑھ دو ہزار روپے ادا کرنے کی مجھ میں سکت نہیں تھی۔ میرے دوست کو کہیں جانا تھا۔ وہ کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد چلا گیا اور میں سوچنے لگا کہ اس کمرے کو کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ دیواروں کو پھر سے رنگ و روغن کیا جانا چاہیے۔ کہیں کہیں سے پلاسٹر اکھڑ گیا ہے۔ اسے دوبارہ ٹھیک کیا جانا چاہیے۔ ایک دو اچھی تصویریں بھی ان خالی دیواروں پر لگانی ہوں گی تاکہ کچھ Ae Sthetic Touch پیدا ہو سکے۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ مکان سے لگا ہوا ایک چھوٹا سا احاطہ تھا۔ پھر مکانوں کا سلسلہ ہی سلسلہ تھا۔ کمرہ سڑک کے پیچھے کی طرف تھا۔ اس لیے راستے کا شور نہیں پہنچتا تھا۔

"آپ ہی نئے کرایہ دار ہیں؟"

کوئی مجھ سے پوچھ رہا تھا۔ میں پلٹا بوسیدہ کوٹ پہنے ہوئے جو کئی جگہ سے رفو کیا گیا تھا۔ ایک نحیف بوڑھا مجھ سے مخاطب تھا۔

"جی ہاں میں ہی یہاں کا نیا کرایہ دار ہوں۔ شاید آپ اس کمرے کے مالک ہیں؟ میں نے سوال کیا۔

"جی ہاں مجھے راجیشور شرما کہتے ہیں۔"

"ناچیز کو مسعود کہتے ہیں۔"

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" کہتے ہوئے ہم دونوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملائے۔

''میری صحت تو ٹھیک ہے نا'' کچھ لمحے خاموش رہ کر انہوں نے کہا۔

میں نے تعجب سے ان کی طرف دیکھا اور پھر یوں ہی ''ہاں'' کہہ دیا۔

''دیکھو دن بھر میں گھر سے باہر نہیں نکلا اور اب آدھ پون گھنٹے کے لیے باہر نکلا تو بارش ہونے لگی''۔ شرما جی نے پھر گفتگو شروع کی۔

''بھگوان کو ایک بوڑھے آدمی کو اتنی تکلیف نہیں دینی چاہیے۔''

میں مسکرا کر خاموش ہو رہا۔

''آپ ابھی پڑھ رہے ہیں' یا ملازمت کرتے ہیں؟''

''جی میں ملازمت کر رہا ہوں''۔ میں نے جواب دیا۔

''تمہارے والدین شاید وطن میں ہیں؟'' انہوں نے پھر مجھ سے پوچھا۔

''ہاں'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''اب دیکھو اس دنیا میں میرا صرف ایک بھائی۔ وہ میرا ذرا بھی خیال نہیں رکھتا۔ اگر میں مر جاؤں تو وہ اور اس کی بیوی سوچیں گے کہ چلو ایک بلا ٹلی''۔ انہوں نے تلخی سے کہا۔

مجھے ان پر رحم آنے لگا۔

''وہ آپ سے ملنے نہیں آتے؟'' میں نے پوچھا۔

کبھی مہینے میں ایک آدھ بار ملنے کے لیے آجاتا ہے اور گذارے کے لیے پیسے دے جاتا ہے لیکن صرف یہی تو کافی نہیں؟

''میری صحت تو ٹھیک ہے نا۔''

''جی ہاں''

''میری عمر کے آدمی کے لیے زندگی عذاب ہو جاتی ہے''۔ انہوں نے بات آگے بڑھائی۔ ''اب دیکھو ہوٹل کے بیرے بھی مجھ سے سیدھی طرح بات نہیں کرتے۔ دوپہر میں بیرا جلا ہوا ٹوسٹ لایا۔ میں نے اس سے کہا یہ ٹوسٹ جلا ہوا ہے تو کہنے لگا تم بوڑھا ہمیشہ یونہی کٹ کٹ کرتا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ یہ بات کرنے کا ڈھنگ ہے؟ پھر ایک بیرا اس طرح بات کرے! میں بوڑھا ہوں اس لیے سب مجھ کو تکلیف دیتے ہیں۔ تم تو ہر چیز کھا لیتے ہو گے؟''

''جی ہاں!'' میں نے کہا۔ اب میں بور ہونے لگا تھا۔

ہاں تم جوان ہو۔ جب میں جوان تھا' اتنا کھایا کرتا تھا کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ لیکن اب میں بوڑھا ہو گیا ہاضمہ ٹھیک نہیں رہتا۔

بارش رک گئی تھی میں شرما جی سے اجازت لے کر چل دیا۔

گھر والوں سے دور رہنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔ کوئی دوست نہ ہونے کی وجہ سے اتنا بڑا

شہر ہونے کے باوجود میرا وقت کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ آفس میں تو تھوڑی بہت بات چیت' گپ شپ ہو جاتی تھی۔ لیکن آفس کے لوگوں سے میل جول اتنا نہیں تھا کہ آفس کے اوقات کے علاوہ ان سے ملاقات تھی۔ شروع شروع میں سوچا تھا۔ چلو شرما جی بوڑھے سہی لیکن کم از کم وقت گزاری کے لیے برے نہیں۔ لیکن شرما جی کو میری بڑی فکر تھی۔ ان کا بار بار مداخلت کرنا مجھے کھلنے لگا۔ یہ قمیص اس پتلون کے ساتھ نہیں پہننی چاہیے۔ تمہارے جوتوں پر پالش کیوں نہیں ہے۔ تمہیں رات میں گھر جلدی لوٹنا چاہیے''۔ اس طرح کے جملے سن سن کر میں بیزار ہو گیا۔ پہلی بار گھر والوں سے دور رہنے کا موقع ملا تھا۔ اس بات کی خوشی تھی کہ یہاں کوئی بات بات پر ٹوکنے والا نہیں کہ شرما جی میرے سرپرست بن بیٹھے۔ بار بار اپنی صحت اور خیالی شکایتوں کا ذکر کر کر کے وہ مجھے اور بور کرتے تھے۔ کچھ ہی دنوں میں یہ عالم ہو گیا کہ میں رات میں صرف سونے کے لیے آتا اور زیادہ سے زیادہ وقت پارکوں اور ریستورانوں اور راستہ ناپنے میں گزارتا۔ پھر بھی صبح اور رات کو سونے سے پہلے شرما جی کو برداشت کرنا ہی پڑتا۔ وہ رات میں دیر تک انتظار کرتے رہتے' ویسے بھی بوڑھے تھے' نیند کم ہی آتی تھی۔ تنگ آ کر میں ان کی باتوں کو سن کر ان سنی کرنے لگا یا مختصر جواب دینے لگا۔ اس کا اثر ان پر خاطر خواہ ہوا۔ کچھ دنوں تک انہوں نے میرے رویے کو برداشت کیا لیکن ایک دن آخرکار پھوٹ پڑے۔ میں آفس جانے کے لیے کپڑے تبدیل کر رہا تھا کہ شرما جی نے گفتگو شروع کی۔

''مسعود صاحب میری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' میں خاموش رہا۔

''میں زندگی سے تنگ آ گیا ہوں''۔ انہوں نے بات آگے بڑھائی۔ ''میرے بھائی کو دیکھو اسے میری ذرا بھی فکر نہیں ہے۔ میں چاہے مروں یا جیوں۔ ایک سو پچاس روپے کیا دیتا ہے گویا احسان کر دیا۔ کوئی میرا خیال رکھنے والا نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے' میری صحت تو ٹھیک ہے نا؟''

میں خاموش رہا۔ شرما جی کا چہرہ پھیکا پڑتا گیا۔ کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے پھر جھٹکے سے اٹھے اور جانے لگے۔ جاتے جاتے وہ رکے۔ میں نے ان کی طرف دیکھا وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے لیکن انتہائی دکھ کی وجہ سے شاید کہہ نہیں پا رہے تھے — آخر جیسے اپنی تمام قوت کو جمع کر کے بولے: ''مسعود صاحب! میں سمجھتا ہوں کہ میری باتوں سے آپ بور ہوتے ہیں۔ لیکن کیا کروں اکیلا آدمی ہوں۔ جی گھبراتا ہے اس لیے کچھ نہ کچھ بکواس کرتا رہتا ہوں''۔ اتنا کہہ کر وہ چلے گئے میں بیحد شرمندہ ہوا۔ جی چاہا کہ انہیں روک کر اپنے رویے کی معافی مانگ لوں۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ چلو جو ہوا ٹھیک ہوا رک گیا۔ اس روز روز کی مصیبت سے تو جان چھوٹی۔

ہمارے تعلقات بگاڑ کی آخری حد پر تھے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد مسٹر رتناکر کا اضافہ ہو گیا۔ ان کے آنے سے تناؤ کم ہو گیا۔ شرما جی نے ان کو کمرے میں رکھنے سے پہلے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس بارے میں ان کی مزاج پرسی کروں لیکن مجھے یہ بھی ڈر تھا کہ شرما

صاحب کہیں مجھ سے ہی دوسری جگہ بندوبست کرنے کے لیے نہ کہہ دیں۔ رتنا کر صاحب کا سامان ایک سوٹ کیس پر محدود تھا اور وہ اپنی کوئی چیز سوائے تولیہ کے باہر نہیں رکھتے تھے۔ میں کمرے میں کم ہی ٹھہرتا تھا۔ اکثر رات میں دیر سے آتا اس لیے کمرہ چھوٹا ہونے کے باوجود میں نے اعتراض کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ رتنا کر صاحب بھی کافی بوڑھے اور مرنجان مرنج قسم کے آدمی تھے۔ پنشن پر گزارہ کر رہے تھے۔ شرما جی سے جو تلخ تجربہ ہوا تھا اس کی بنا پر رتنا کر صاحب سے میل جول بڑھانے کی میں نے کوشش نہیں کی۔

شرما جی میں اور مجھ میں اب سرد جنگ چل رہی تھی۔ عرصے سے ہم دونوں میں ایک لفظ کا بھی تبادلہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن شرما جی میں اب وہ بجھا بجھا پن نہیں رہا تھا۔ رتنا کر صاحب کے آنے سے ان کو ایک اچھا ساتھ مل گیا تھا۔ اکثر رات میں آتا تو دونوں بوڑھے گھل مل کر باتیں کر رہے ہوتے۔ اس وقت میں اپنے دل میں نہ جانے کیوں کچھ حسد سا محسوس کرتا لیکن اب رہائش کے بارے میں مجھے بالکل اطمینان ہو گیا تھا۔

تنہائی میرے لیے سوہانِ روح ہوتی جا رہی تھی۔ صبح کو ناشتہ کر کے دیر تک اخبار پڑھتا رہتا۔ یہاں تک کہ اشتہار وغیرہ سب چاٹ جاتا۔ لیکن وقت جیسے رک سا گیا تھا۔ شام میں دیر تک رسالہ پڑھتا رہتا۔ پھر تھک کر اکتا کر خواہ مخواہ کھڑکی کے باہر مکانوں کی قطاریں یا آسمان کو تکتا رہتا۔ اکثر جی چاہتا کہ کسی اپنی ہی عمر کے شخص کے ساتھ خوب باتیں کروں۔ ہنسی مذاق، دھینگا مشتی ہو، گھر کی یاد اب اکثر آتی اور شاید میں لوٹ ہی جاتا لیکن بڑی مصیبتوں سے ملازمت ملی تھی۔ اور گھر والوں کو مجھ سے بڑا سہارا تھا۔

آفس چھوٹنے میں ابھی آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ دن بھر کا کام ختم کر کے بیٹھا ستا رہا تھا۔ مایوس کن حالات نے آ گھیرا۔ میں سوچنے لگا، تھوڑی دیر بعد میں آفس سے باہر ہوں گا اور پھر وہی چکر ہو گا۔ میں نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا پھروں گا۔ کیوں نہ اپنے کمرے میں چلا جاؤں۔ لیکن کمرے میں اکیلا پڑا رہنا مجھے اور زیادہ مضحکہ خیز لگا۔ خاص طور سے جب شرما جی کمرے میں موجود ہوں اس سے تو بھٹکنا ہی بہتر ہے۔

آفس چھوٹنے میں پانچ منٹ باقی تھے۔ میں اٹھ کر ہاتھ منہ دھونے چلا گیا۔ وہاں اور لوگ بھی موجود تھے۔ قہقہے اچھل رہے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے اپنے گھر تھے، بیوی بچے تھے یا والدین تھے۔ دوست احباب تھے۔ دو ایک مجھ سے بھی مخاطب ہوئے۔ لیکن وقت گزاری کی فکر میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ کسی کو کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔

''بہت سنجیدہ نظر آ رہے ہو'' کسی نے کہا: ''طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں!'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔ ''تو پھر کس کے خیالوں میں ہو، شاید'' کسی اور نے

شگفتگی سے کہا: ''کہاں اپائنٹمنٹ ہے مسعود صاحب؟''

میں فقروں سے بچتا بچاتا باہر آ گیا۔ آفس سے باہر آ کر سوچنے لگا۔ اب کہاں چلا جائے۔ کیوں نہ سمندر کنارے چلوں لیکن ٹھنڈ زیادہ ہے اور پھر وہاں ہشاش چہرے دیکھ کر میری پژمردگی اور بڑھ نہ جائے۔ میں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ پھر خیال آیا کیوں نہ میوزیم آرٹ گیلری چلا جائے۔ لیکن طبیعت اس طرف بھی راغب نہ ہوئی۔ جب کچھ نہ طے کر سکا تو میں یوں ہی ایک طرف چل پڑا۔ راستے میں سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی۔ سگریٹ کیس خالی تھا۔ سگریٹ کی دکان تلاش کرنے لگا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک دکان راہ میں پڑی۔ سگریٹ خرید کر میں چل پڑا۔ پتہ نہیں کب تک یوں ہی خالی الذہن چلتا رہا۔ جس سڑک پر میں چل رہا تھا اس کے دونوں طرف دکانوں کی قطاریں چلی گئی تھی۔ راستے پر بھی چیزیں بیچی جا رہی تھیں۔ غیر ملکی کپڑے سے لے کر ٹیپ ریکارڈ اور ٹرانزسٹر تک ہر چیز راستے پر بک رہی تھی۔ دکانوں کی بہ نسبت یہاں آدمی زیادہ تھے۔ لوگ گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ہر طرف بھیڑ تھی۔ اس بھیڑ میں شاید میں ہی اکیلا بغیر کسی مقصد کے بھٹک رہا تھا۔ پیر دکھنے لگے۔ سوچا کہیں بیٹھا جائے، لیکن میں ہوں کہاں؟ اطراف میں دیکھا۔ میں ریگل سینما کے پاس تھا۔ یہاں دو ہوٹل تھے ایک ہوٹل میں ریکارڈ بج رہا تھا۔ میں نے سوچا یہیں بیٹھا جائے۔ ہوٹل میں داخل ہوا تو یکا یک جیسے ایک ہنگامے میں گھر گیا۔ کچھ عجیب سا لگا۔ ایک گوشہ میں ایک خالی کرسی دیکھ کر میں وہیں بیٹھ گیا۔ ہر میز پر دو دو تین تین آدمی باتیں کر رہے تھے یا بحث کر رہے تھے، یا پھر جھگڑ رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھے مجھے محسوس ہوا جیسے گیت اور وہاں موجود لوگوں کی آوازوں میں ایک دوسرے پر غالب آنے کی کشمکش ہو رہی ہو۔ میں نے گیت سننے کی کوشش کی۔ کبھی کبھی آوازیں مدہم ہونے پر گیت کا کوئی ٹکڑا کانوں سے آ کر ٹکراتا۔ دھن مغربی تھی اور بول اردو ٹیبل والا آیا۔ اسے میں نے چائے لانے کے لیے کہا۔ کسی ٹیبل سے کچھ لوگ اٹھے۔ بیرا جو میرے پاس سے ہٹ ہی رہا تھا۔ زور سے چلایا: ''صاحب لوگ کا ساٹھ پیسہ'' کرخت آواز میرے کانوں کے پردے پھاڑتی ہوئی گزری۔ دل چاہا فوراً اٹھ جاؤں۔ لیکن پیروں میں تکان تھی۔ ٹیبل والا دو منٹ بعد چائے رکھ کر گیا۔ میں نے چائے کا ایک گھونٹ حلق سے اتارا کڑواہٹ نے منہ کا مزا خراب کر دیا۔ میں کچھ دیر تک کڑواہٹ محسوس کرتا رہا۔ یہاں تک کہ کڑواہٹ بھلی لگنے لگی۔ ایک دوسرا مغربی طرز کا ہندوستانی گیت شروع ہوا۔ ایک بار پھر لوگوں کی آوازوں اور گیت کی آواز میں کشمکش ہونے لگی۔ میں سوچنے لگا کس میں کڑواہٹ زیادہ ہے۔ گیت کے شور میں، لوگوں کے شور میں یا چائے میں۔ سوچتے سوچتے شاید سوچنے کی حس ہی ختم ہو گئی۔ یا اس شور نے ختم کر دیا۔ چائے ختم ہو چکی تھی، میں اٹھا اور پیسے ادا کر کے باہر نکل آیا۔ اس ہنگامے سے نکل کر مسرت کا احساس ہوا۔ پھر یہ مسرت بھی آہستہ آہستہ تحلیل ہو گئی۔

باہر کی ٹھنڈی ہوا نے دماغ کو بھی کچھ ہلکا کر دیا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ اب میں سوچ سکتا ہوں۔

لیکن سوچنے کے لیے تھا ہی کیا۔ سڑکیں سنسان ہوگئی تھیں۔ دکانیں بند ہوگئی تھی۔ راستہ پر کہیں کہیں کوئی آدمی چلتا دکھائی دے جاتا۔ میں چلتا رہا یہاں تک کہ پیر پھر دکنے لگے قمقموں کی روشنی میں میں نے دیکھا۔ ایک بس اسٹاپ قریب ہی تھا۔ میں نے سوچا۔ یہیں کچھ آرام کیا جائے۔ ایک بس آئی نمبر دیکھا تو خیال آیا کہ یہ بس تو میرے گھر کے قریب سے ہوکر جاتی ہے۔ اپنے کمرے میں چلنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے یہ آخری بس ہو۔ میں نے قدم تیز کر دیئے۔ بس کے اسٹینڈ پر رکنے تک میں پہنچ چکا تھا بس پوری خالی تھی۔ بس میں بیٹھ کر تسکین کا احساس ہوا۔ یہ سب میرے لیے چل رہی ہے زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں۔

بس سے اتر کر میں اپنی پناہ گاہ کی طرف چل پڑا۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کچھ عجیب کیفیت ہونے لگی۔ دل نہ جانے کیوں جیسے بھر بھر آرہا تھا۔ زبان میں لکس ہونے لگی۔ جی چاہنے لگا کچھ بھی بکنے لگوں اور کوئی سنے۔ شرما جی کا خیال آیا میں نے سوچا دونوں بوڑھے باتیں کر رہے ہوں گے۔ میرا جی چاہا کہ شرما جی مجھ سے کہیں۔ ''مسعود اتنی رات گئے کیوں آتے ہو تم نے اپنے جوتوں پر پالش نہیں کروائی۔ مسعود تمہیں اتنا لاپرواہ نہیں ہونا چاہیے''۔ اب میں اپنے کمرے کے قریب تھا۔ ادھ کھلے کواڑوں سے میری نظر چوروں کی طرح کمرے میں داخل ہوئی۔ شرما جی اور رتنا کر صاحب باتوں میں مصروف تھے اور کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ میرا جی چاہا میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں۔ میں نے دروازہ کھولا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ لیکن میرا منہ کھلا رہ گیا دونوں بوڑھے میری طرف دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں ایک سنگین بے تعلقی تھی۔ برف کی سل کی طرح' میرا تمام جسم سرد ہوکر جیسے جم گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے سینے میں کوئی چیز ٹوٹی اور میں نے صاف صاف کچھ ٹوٹنے کی آواز سنی — قریب میں رکھی کرسی میں گر گیا۔ جوتے اتار کر کپڑے تبدیل کیے بغیر بوڑھوں کی طرف پیٹھ کیے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ آنسوؤں کو چھپاتے جو خود آنکھوں سے نکل پڑے تھے اور گالوں سے بہہ کر ہونٹوں پر سیٹھے سیٹھے لگ رہے تھے۔

❀ ❀ ❀

ساجد رشید

جلتے پروں سے اڑان

ریشم جیسے ملائم اور دھنک جیسے رنگین پروں سے سر نکال کر پرندے نے جب اپنے بازوؤں کو پھڑپھڑایا تو ان پر ٹھہرے اوس کے ننھے قطرے مشرق کی بھوری پہاڑیوں سے جھانکتے سورج کی کرنوں سے ایسے دمک اٹھے جیسے پگھلے سونے کا فوارہ پھوٹ پڑا ہوا۔ اس نے سرخ چونچ کو کھول کر فرحت بخش ہوا کو اپنے سینے میں بھر کر بڑی تازگی محسوس کی اور سر جھٹک کر آس پاس دیکھا سب کچھ وہی تھا مگر کتنا دلکش!

سورج کی نارنجی کرنوں سے تمتماتی بھوری پہاڑیاں' پہاڑی کے پیروں کو دھوتی گہرے نیلے پانیوں والی ندی۔ دوسری جانب ندی میں گرتا دودھ جیسا جھرنا' کنارے پر بکھرا مخمل سا سبزہ اور ان پر جھلملاتی اوس کی بوندیں۔ خود رو پودوں پر منڈلاتی خوش رنگ تتلیاں' چھوٹے چھوٹے پتنگے' دائیں طرف تازہ سبز پتوں سے ڈھکا گھنا جنگل پیڑوں کی لچکدار مضبوط شاخوں پر پھدکتی چڑیاں اور ان کی چہکار۔ سرمئی نم مٹی پر سبک رفتاری سے رینگتی چونٹیاں' جا بجا بکھرے سوکھے پتے ہوا سے کھڑکتے پتوں پر کانوں کو کھڑا کر لینے والے معصوم آنکھوں والے ہرنوں کا جھنڈ ــــ سب کچھ وہی تھا مگر کتنا دلکش!

چڑیوں کی چہکار' جھرنے کی جھرجھر' ہوا کے بہاؤ پر بہتی ندی کی کلکلاہٹ' سوکھے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ' ندی کے کنارے صبح کی دھوپ سینکتے مینڈکوں کی ٹرٹراہٹ پیروں کے تنوں پر چڑھتی اترتی گلہریوں کی چک چکاہٹ سفید جھینگروں کی سیٹیاں اور ہم آغوش لچکیلی شاخوں کی سرسراہٹ' ان آوازوں کی نغمگی سے سارا عالم گونج رہا تھا ــــ سب کچھ وہی تھا مگر کتنا دلکش!

پرندے نے سینہ پھلا کر آسمان کو دیکھا' بے داغ آسمان' آج بھی اتنا ہی نیلا اور اتنا ہی چمکدار تھا جتنا کل تھا۔ پرندے نے تنکوں سے بنے گھونسلے پر الوداعی نظر ڈالی اور دانے دنکے کی تلاش میں پر پھڑپھڑا کر اڑا گیا۔ اڑا اور اڑتا گیا' اوپر ــــ اوپر ــــ بہت اوپر ــــ

ٹھیک پرندے کے سر پر آ کر سورج نے اسے معمول کے مطابق سبزہ زار میں اترنے پر مجبور کر دیا۔ دور تک سبزہ تھا اور دانے اس قدر بکھرے پڑے تھے کہ پرندے کو ہمیشہ کی طرح آج بھی

سوچنا پڑا— کہاں سے شروع کیا جائے۔"

دانا چگتے چگتے وہ سیر ہو گیا تب اس نے دیکھا کہ سورج کا سایہ اس کے قدموں تلے نہیں ہے بلکہ کچھ لمبا ہو گیا ہے پرندے نے مٹی میں چونچ رگڑ کر قریب کی ندی سے شیتل جل پیا اور پھر ایک بار ہوا کو چیرتا فضا میں اڑتا چلا گیا دانے سے پیٹ کے بھاری پن کو ہلکا کرنے کے لیے یہ اس کا معمول تھا اسے ہر اڑان پر یوں محسوس ہوتا۔ جیسے وہ بس ابھی چمکتے نیلے آسمان کو چوم لے گا آسمان کو چومنے کی یہ خواہش اسے بس اوپر لیے چلی جاتی۔ آسمان ابھی بہت اوپر تھا اور پروں میں تھکن رینگنے لگی تھی اس نے آسمان کو چھونے کا فیصلہ ہمیشہ کی طرح کل پر ڈالا اور نیچے اترنے لگا۔

پرندے نے جب سر کو خم کر کے نیچے بکھری دنیا کو دیکھنا چاہا تو اچانک ہی اس کی پرواز تھم گئی اس کا ننھا سا دل دھک سے رہ گیا یہ انہونی سی بات تھی کہیں میں اندھا تو نہیں ہو گیا؟ اس نے آنکھوں میں لہراتے دھند لکے کو دیکھتے ہوئے سوچا نیچے سارے میں سیاہی مائل دھند پھیلی ہوئی تھی دھند ایسی کہ پیڑ پودے ندی، نالے، پہاڑ جھرنے اور میدان جانے کہاں کھو گئے تھے۔ کیا یہ سویرے کی دھند ہے؟ لیکن سویرا ابھی کیسے چلا آیا؟ اور پھر سویرے کی دھند تو بڑی خوشگوار ہوتی ہے وہ ایسی کثیف اور مٹ میلی تو نہیں ہوتی اور پھر اس میں خنکی بھی تو ہوتی ہے — تو پھر یہ کیا ہے؟ دھواں اس کی آنکھوں میں گھس کر چن چناہٹ پیدا کرنے لگا تھا۔ پروں پر اپنے چھوٹے سے جسم کا توازن برقرار رکھتے ہوئے جب وہ دھویں کے کثیف بادل میں اترا تو اس کے سینے میں چنگاریاں اتر گئیں پھیپھڑوں میں دھواں پتھر ہو گیا اور حلق میں چونٹیاں کاٹنے لگیں۔ سینے میں امنڈتے دھویں کی اذیت اور اکھڑتی سانس سے گھبرا کر اس نے بے اختیار چونچ کھول دی مگر تکلیف سے نجات تو کیا ملتی سینے کی جلن بڑھتی چلی گئی تب خود کو بچانے کی کوشش میں وہ بے اختیار چلانے لگا۔ بالآخر وہ دھویں کی کثیف چادر کے نیچے سے نکل کر کھلے میں چلا آیا یہاں گھٹن کچھ کم تھی۔

زخمی سورج آسمان کے بھیگے مشرقی کنارے سے ٹکرا کر اپنا گاڑھا لہو چھوڑ گیا تھا جو دھیرے دھیرے پھیل کر سیاہ ہو رہا تھا مغرب میں گرتے سورج کا چہرہ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے زرد پڑ گیا تھا فضا میں حبس اور ہوا میں حدت تھی۔ پرندہ تھک کر چور ہو چکا تھا سینے میں درد ریت کے ذرے کی طرح رڑک رہا تھا۔ اس نے تھکن سے بوجھل آنکھوں سے نیچے دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ اس کے مختصر وجود میں ننھا سا دل جیسے اپنی دھڑکن بھول گیا۔ اسے ایک لمحے کے لیے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ اسے لگا کہ تھکن نے اس کی آنکھوں کو گمراہ کیا ہے اس نے بازوؤں کو جلدی جلدی حرکت دی کچھ اور نیچے آیا۔ مگر منظر بدلا نہیں کچھ اور واضح ہو گیا۔ اس نے دیکھا اور دیکھ کر پریشان ہو گیا یہ سب کیا ہے؟

وہ سب کہاں ہے؟ اس نے سوچا اور سوچ کر تڑپ اٹھا آنکھوں نے جو کچھ بھی دیکھا وہ

پرندے کے لیے بڑا حیرت انگیز تھا۔

سورج کے ڈھیر ہونے تک سارا عالم کیسے بدل گیا کہاں ہیں وہ پیڑ وہ پودے وہ میدان وہ سبزہ زار؟ کہاں ہیں وہ نالے وہ جھرنے؟ کہاں ہیں وہ غار، وہ ٹیلے وہ پہاڑ؟ کہا ہیں وہ ہرن وہ چونٹیاں وہ مینڈک؟ یہ کیسا تغیر ہے؟ اُف یہ کیسا تغیر ہے۔

جنگل پہاڑوں اور ندیوں کی جگہ اب آسمان سے سر ٹکراتی سیسہ پلاتی عمارتیں تھیں سینکڑوں ایکڑ میں پھیلی اسلحہ ساز فیکٹریاں تھیں بڑے بڑے راڈر تھے۔ دیو پیکر ایٹمی تجربہ گاہیں تھیں سینہ تانے ٹی وی ٹاور کھڑے تھے بڑی بڑی دوربینیں تھیں جن میں ماہرین فلکیات کی آنکھیں گڑی رہتی ہیں برقی تاروں کا ایک جال تھا اور ایک کنارے پر ترتبت سے بنی ایٹمی بھٹیاں تھیں جن کی کشادہ چمنیاں آگ دھواں اور زہر اگل رہی تھی دھواں اس قدر تھا جیسے کسی بہت بڑے سوکھے جنگل کو آگ لگ گئی ہو اسلحہ ساز فیکٹریوں اور ایٹمی بھٹیوں کی چمنیوں سے گاڑھا کالا دھواں ہاتھیوں کی طرح جھومتے ہوئے نکلتا اور فضا میں چادر کی طرح تن جاتا کل کا شفاف آسمان اب یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس پر بے پناہ گرد جم گئی ہو آسمان پر کسی مجرم کی طرح رینگتی سیاہی سے خوفزدہ ہو کر پرندہ اپنے گھونسلے میں اترنے کے لیے بے چین ہو گیا تھا ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ سورج بجھنے کے بعد اپنے گھونسلے کو لوٹا ہو یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اندھیرے میں گرتا جا رہا تھا۔

تھکن سے ٹوٹتے پنکھوں سے پرندہ کچھ نیچے آیا تو فضا میں دوڑتے مواصلاتی پیغامات اس کے پروں سے الجھ الجھ کر پرواز میں رکاوٹیں پیدا کرنے لگے تھکن بازوؤں میں سوئیوں کی طرح چبھ رہی تھی اور اس کو اپنا وجود نا قابل برداشت بوجھ محسوس ہونے لگا تھا اس نے پھولتی سانسوں سے سر کو خم کر کے اندھیرے میں ڈوبتے لوہے' سیمنٹ اور کنکریٹ کے پہاڑوں کو دیکھا کہیں کوئی پیڑ کوئی شاخ کوئی سبز پتہ؟ مگر کہیں کچھ بھی نہیں! اُف یہ میں کس جہان میں آ پھنسا ہوں کیا میری پرواز اتنی اونچی تھی کہ میں اپنے حدود سے باہر نکل آیا؟ مجھے لوٹنا ہو گا مگر بازوؤں سے اٹھتی ٹیس ارادے پر بجلی بن کر گری۔

اب تو بس چند ہی لمحوں کی سکت ہے مجھ میں اس کے بعد تو مجھے کہیں تو اترنا ہو گا۔

مگر کہاں؟ اس نے نیچے دیکھا۔ سب کچھ وہی بدلا ہوا منظر تھا۔

ٹی وی ٹاور تھا جو غیر مرئی مناظر کو منتشر کر رہا تھا —— یہاں بھی نہیں!

بڑے بڑے نیون سائن بورڈ ٹنگے ہوئے تھے —— یہاں بھی نہیں!

سیمنٹ کنکریٹ کے اسکائی اسکریپر منہ چڑھا رہے تھے —— یہاں بھی نہیں!

اسلحہ ساز فیکٹریوں کی دھواں اگلتی چمنیاں تھیں —— یہاں بھی نہیں!

دیو پیکر دوربینیں تھیں جو کائنات کے سارے اسرار سے واقف تھیں —— نہیں' یہاں بھی

نہیں! بڑی بڑی ایٹمی بھٹیاں جو آگ اور زہر اُگل رہی تھیں ـــ نہیں یہاں بھی نہیں! تب کہاں؟ سوچ کر خود ہی لرز گیا۔

کیا میں واپس لوٹ سکوں گا۔ اب ندیوں پہاڑوں اور جنگلوں کو جہاں سے میں اڑا تھا؟

کیا اب میں اپنے نرم گرم گھونسلے میں اتر سکوں گا؟

کیا اب کبھی نیلے آسمان کی وسعت میں تیرتے ہوئے میں نظروں کی آخری سرحد تک پھیلے گھاس کے میدان کا نظارہ کر سکوں گا؟

میری پیاس کو کیا وہ شیتل جل مل سکے گا۔

گھنے جنگلوں کی گہری چھایا میں ستاتے کسی ہرن کی پیٹھ پر بیٹھ کر اس کی گردن کو گدگدا سکوں گا۔ کیا نم مٹی میں اپنے پنجوں کے نشان دیکھ سکوں گا؟

سوالات نے خوف میں ڈھل کر پرندے کو بدحواس کر دیا کسی پیڑ کی زندہ شاخ کو پانے کے لیے اس نے زناٹے سے ایک غوطہ لگایا اور ایک دیو پیکر عمارت کی کھڑکی کے مضبوط شیشے سے جا ٹکرایا اور پھر تو وہ کسی ڈوبتے ہوئے یکے بعد دیگرے اندھے دھویں میں ڈوبتی عمارتوں کی نہ جانے کتنی کھڑکیوں کے شیشوں سے سر ٹکراتا پھرا مگر واپسی کا راستہ جیسے وہ کھل جا سم سم کی طرح بھول چکا تھا اب اس کے حواس جواب دے چکے تھے وہ تھکن اور خوف سے لرزتے جسم کو پھر نہ سنبھال سکا اور ایک ایٹمی بھٹی کے عین منہ پر اپنا توازن کھو بیٹھا۔ زہر نے پھیپھڑوں میں کانٹے بوئے اور شعلوں نے پروں کو چاٹا اور گرد آلود تاریک آسمان پر دور تک ایک روشن لکیر پھیلتی چلی گئی جب آگ پروں کو جلاتی دل تک پہنچی تھی تب پرندے نے تڑپ کر نیچے اُگے لوہے آگ اور دھویں کے جنگل پر آخری نگاہ ڈالی اور سوچا تھا کیا یہ میری آخری پرواز ہے؟ اس سفاک زمین میں کوئی بیج اپنی ننھی سبز بانہوں سے سیمنٹ کنکریٹ کے ان پہاڑوں کو چیر کر ایک تناور درخت کے لیے سر نہیں نکالے گا......

وہ سارے ماہرین فلکیات جن کی آنکھیں بڑی بڑی دوربینوں میں گڑی رہتی ہیں اور جو کائنات میں نمودار ہونے والے ایک ایک ستارے کی خبر رکھتے ہیں وہ عین اپنے سر پر ایک پرندے کے وجود کو خاک ہو کر فضا میں بکھرنے کے حادثے سے لاعلم رہے۔

❀ ❀ ❀

نیر مسعود

ندبہ

میں نے بے حاصل مشغلوں میں زندگی گذاری ہے۔ اب اپنا زیادہ وقت یہ سوچنے میں گذارتا ہوں کہ مجھے ان مشغلوں سے کیا حاصل ہوا۔ یہ میرا اپنا اور شاید آخری اور شاید سب سے بے حاصل مشغلہ ہے۔

برسوں تک میں ملک میں اِدھر سے اُدھر گھومتا رہا۔ مقصد کچھ یہ تھا کہ اپنے چھوٹے بڑے شہروں سے واقفیت بڑھاؤں' لیکن ان دوروں کا حاصل یہ نکلا کہ مجھے اپنے شہر کے سوا سب شہر ایک سے معلوم ہونے لگے اور میں اپنے شہر واپس آ کر کئی مہینے تک گوشہ نشین رہا۔

پھر میرا دل گھبرایا اور میں پھر نکل کھڑا ہوا۔ اب کی بار میرا رخ دیہاتی آبادیوں کی طرف تھا لیکن بہت جلد مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ آبادیاں شہری آبادیوں سے کوئی بہت مختلف نہیں ہیں' کم سے کم مجھ کو مختلف معلوم نہیں ہوتیں۔ میں واپس لوٹ آیا اور بہت دن تک اس وہم میں گرفتار رہا کہ میں چیزوں میں فرق کرنے کی صلاحیت کھو بیٹھا ہوں۔ میں اس وہم کو دل میں لیے رہا اور کوشش کرتا رہا کہ میری کسی بات سے اس کا اظہار نہ ہونے پائے' لیکن جب مجھے محسوس ہوا کہ میرے روز کے ملنے والے مجھ کو عجیب نظروں سے دیکھنے لگے ہیں تو میں نے پھر مسافرت اختیار کی۔

اس مسافرت میں ایک عرصے تک میں اپنی قدیم سرزمین کے اجاڑ علاقوں میں گھومتا رہا۔ ان علاقوں کے موسم سخت اور مٹی خراب تھی دریا ان سے دور پڑتے تھے اور زیادہ ضرورتوں والے انسانوں کا وہاں بسنا ممکن نہ تھا۔ پھر بھی یہ علاقے انسانوں سے خالی نہ تھے۔

میں ایسے علاقوں سے بھی ہو کر گذرا جنہیں انسان نے شاید کبھی اپنا مسکن نہیں بنایا تھا لیکن یہ محض بڑے بڑے غیر آباد جغرافیائی خطے تھے جو کسی مبہم انداز میں سمندروں سے مشابہ تھے اور غیر آباد ہونے کے باوجود اجاڑ نہیں معلوم ہوتے تھے۔ اجاڑ علاقے وہ تھے جنہیں انسانوں نے قدیم زمانوں سے آباد کر رکھا تھا۔

یہ علاقے ان جغرافیائی خطوں سے گذرتے ہیں کسی چھوٹے سے ٹاپوں کی طرح اچانک

مل جاتے تھے اور شاید انسانوں ہی کے ہونے سے اجاڑ معلوم ہوتے تھے اور جس طرح یہ انسان اپنے علاقوں پر اثر ڈالتے تھے کہ انہیں بھرے پرے شہروں میں بھی دیکھ کر پہچانا جا سکتا تھا کہ یہ اجاڑ علاقوں سے آرہے ہیں۔ کم سے کم میں ان کو پہچان سکتا تھا' اس لیے میری اس مسافرت کا زیادہ زمانہ انہیں باسیوں کے درمیان گھومتے پھرتے گذرا۔

یہ چھوٹی چھوٹی برادریاں تھیں اور ہر برادری دوسری برادریوں سے مختلف معلوم ہوتی تھی۔ ان برادریوں کو دیکھنا اور کچھ کچھ دن ان کے ساتھ گذارنا اس مسافرت میں میرا مشغلہ تھا۔ اس مشغلے میں مجھے زیادہ انہماک اس لیے تھا کہ انسانوں کے یہ منتشر گروہ ایک ایک کر کے ختم ہو رہے تھے۔ کوئی اچانک وبا یا موسم کی کوئی بڑی تبدیلی ان کو آسانی سے مٹا سکتی تھی اور مٹا دیتی تھی۔

کئی بار ایسا ہوا کہ کسی برادری میں کچھ دن گذارنے کے بعد جب میں دوبارہ اس علاقے سے گذرا تو میں نے دیکھا اب وہاں کوئی نہیں ہے اور وہ علاقہ کسی غیر آباد جغرافیائی خطے میں قریب قریب گم ہو چکا ہے۔ اس لیے ان برادریوں کی نشانیاں بہت جلد مٹتی تھیں' یا شاید ہوتی ہی نہیں تھیں۔

میں ان لوگوں کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں کر سکا اس لیے کہ اگرچہ وہ میری زبان کچھ کچھ سمجھ لیتے تھے لیکن ان کی بولیاں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں اور ہماری زیادہ گفتگو اشاروں میں ہوتی تھی۔ لیکن اس نے بھی مجھے کچھ بہت فائدہ نہیں دیا اس لیے کہ الگ الگ برادریوں سے الگ الگ اشارے ہوتے تھے' اور کبھی کبھی ایک ہی اشارہ دو برادریوں میں ایک دوسرے کے بالکل برخلاف معنی دیتا تھا۔ ایک برادری خوشی کے اظہار میں جس طرح ہاتھوں کو پھیلاتی تھی' دوسری اسی طرح غم کے اظہار میں پھیلاتی تھی' ایک برادری سر کی جس جنبش سے کسی بات کا اقرار کرتی تھی۔ دوسری اسی جنبش سے انکار ظاہر کرتی تھی۔

ان کے اشاروں کو صحیح صحیح سمجھنے کے لیے وقت چاہیے تھا اور میں کسی ایک برادری میں زیادہ ٹکتا نہیں تھا اس لیے اشاروں کی مدد سے جو کچھ میں نے اپنے نزدیک معلوم کیا اس کا کوئی بھروسہ نہ تھا اور میں نے اس الٹی سیدھی معلومات کو واپس لوٹنے سے پہلے ہی پہلے بھلا دیا۔ جو کچھ مجھے یاد رہ گیا وہ ان برادریوں کا ندبہ تھا جو ہر جگہ مختلف ہوتا پھر بھی ہر جگہ میری پہچان میں آجاتا تھا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ محض اتفاق تھا یا ان لوگوں میں موتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ لیکن بہت سی برادریوں میں میرے پہنچنے کے دوسرے ہی تیسرے دن کوئی نہ کوئی موت ضرور ہوئی جن کا اعلان مرنے والے کے قریب ترین رشتہ داروں یا ان رشتہ داروں کے قریب ترین رشتہ داروں کے چیخنے یا رونے سے ہوتا تھا برادری والے ان سوگواروں کے پاس خاموشی کے ساتھ آتے اور انہیں چپ کرا کے خاموشی کے ساتھ واپس چلے جاتے تھے کچھ لوگ میت کو ٹھکانے لگانے کے بندوبست میں لگ جاتے یہ بندوبست مکمل کر کے کہیں میت کو ٹھکانے لگانے کے بعد اور کہیں اس سے پہلے

سب مل کر ندبہ کرتے جس کے لیے باقاعدہ مقام اور وقت مقرر ہوتا تھا زیادہ تر برادریوں کا ندبہ فریادی لہجے میں موت کی شکایت سے شروع ہو کر مرنے والے کی یاد تک پہنچتا پھر اس میں تیزی آنے لگتی اور جب ندبہ پورے عروج پر آتا تو سب سے بڑھ کر ان کی آنکھوں سے غم کے بجائے غصہ ظاہر ہونے لگتا اور کبھی کبھی ایسا شبہ ہوتا کہ سب نے کوئی تیز نشہ استعمال کر لیا ہے کہیں کہیں مجھ کو بھی اس رسم میں شریک ہونا پڑتا لیکن میں ایسے موقعوں پر جذبوں سے عاری بے عقلی کے ساتھ دوسروں کی بھونڈی نقالی کرتا رہ جاتا اور ندبہ ختم بھی ہو جاتا جس کے بعد سب ایک دوسرے کو تسلی دیتے اس میں مجھے بھی تسلی دی جاتی تھی۔

ندبہ کرنے والوں میں کہیں عورتوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی کہیں مردوں کی لیکن ایک برادری میں عورتوں اور مردوں کی تعداد بالکل برابر رکھی جاتی تھی۔ یہ پہلی اور آخری برادری تھی جن کی عورتوں کو اس رسم کے دوران میں نے بہت قریب اور چھو کر دیکھا۔ ان عورتوں کے قد چھوٹے اور رنگ گہرے سانولے تھے ان کے عورت ہونے کی پہچان بنانے میں قدرت نے مبالغے سے کام لیا تھا اور وہ قدیم زمانے کی ان مورتیوں اور دیواری تصویروں کی اصل معلوم ہوتی تھیں جن کے بارے میں خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے بنائی ہیں جنھوں نے سچ مچ کسی عورت کو نہیں دیکھا تھا یا قریب سے نہیں دیکھا تھا اور چھو کر تو بالکل ہی نہیں دیکھا تھا۔

اس برادری کا ندبہ یوں ہوتا تھا کہ ایک قطار میں مرد اور ان کے روبرو دوسری قطار میں عورتیں ننگی زمین پر دوزانوں ہو کر بیٹھتی تھیں، اور یہ آمنے سامنے والے پہلے ایک دوسرے کی کہنیوں سے کہنیاں ملاتے، پھر کلائیاں ملاتے، پھر ہتھیلیوں پر ہتھیلیاں مارتے اور انگلیاں آپس میں الجھا کر جو کچھ کہنا ہوتا کہتے، پھر الگ ہوتے، پھر کہنیاں اور کہنیوں سے کلائیوں تک ملا کر ہتھیلیاں لڑاتے اور انگلیاں الجھا کر بول کہتے۔ ان کا ندبہ بار بار عروج پر آتا۔ دھیما پڑتا۔ پھر عروج پر آتا اور دیکھنے میں سمندر کا جوار بھاٹا معلوم ہوتا۔ یہاں تک کہ سب کی آنکھیں پلٹ جاتیں اور آخر سب پسینے پسینے ہو کر کپکپاتی ہوئی کمزور آوازوں میں ندبہ ختم کرتے اور آہستہ آہستہ ہانپتے ہوئے الگ ہو جاتے۔

میرے سامنے اس برادری میں تین موتیں ہوئیں۔ پہلی دو موتوں پر میں بھی ندبہ کرنے والوں میں شامل تھا، لیکن تیسری موت میرے بوڑھے میزبان کی ہوگئی۔ میں نے اپنے پاس موجود رہنے والی دواؤں سے اس کا کچھ علاج بھی کیا تھا لیکن وہ بچ نہ سکا۔ اس کی صورت ہی نہیں کئی ادائیں بھی میرے باپ کی یاد دلاتی تھیں اور میں نے اسے کچھ زبان سے اور کچھ اشاروں سے یہ بات بتانے کی کوشش بھی کی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس نے برادری والوں سے میرے بارے میں کیا باتیں کی تھیں۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد لوگ سوگواروں کو چپ کرانے گئے تھے ان میں سے دو ایک میرے پاس بھی آگئے اور اگرچہ میں خاموش تھا لیکن انھوں نے مجھے چپ کرایا۔

ان کے آنے سے مجھ کو اپنے باپ کی موت کا دن یاد آ گیا اس دن میرے گھر میں عورتوں کے رونے کا بے ہنگم شور تھا اور میں سب سے الگ چپ چاپ بیٹھا رہ گیا تھا۔ مجھے اپنے باپ کا آخری وقت کا چہرہ یاد آیا۔ پھر بوڑھے میزبان کی صورت یاد آنے لگی اور جب اس کے آخری بندوبست کے بعد برادری کی عورتیں اور مرد آمنے سامنے قطاریں بنانے لگے تو میں خاموشی کے ساتھ اٹھا اور اس اجاڑ علاقے سے متصل غیر آباد خطے کی طرف نکل گیا اور وہیں کے وہیں میں نے اپنی مسافرت ختم کر دینے کا فیصلہ کیا اور اسی دن واپسی کا سفر شروع کر دیا۔

اب جیسا کہ میں نے بتایا' میرا زیادہ وقت یہ سوچنے میں گزرتا ہے کہ مجھے ان مشغلوں سے کیا حاصل ہوا۔ اس طرح میری زندگی' جس کا بڑا حصہ ناہمواریوں میں نکل گیا اب ایک مدت سے بالکل ہموار گزر رہی ہے۔ البتہ صرف ایک دن اس میں تھوڑی ناہمواری آئی تھی۔ یہ ناہمواری شاید میرے ایک مشغلے کا حاصل تھی' لیکن ایسا حاصل جو' میں سمجھتا ہوں۔ بے حاصلی سے بھی بدتر تھا۔

☆☆☆

اس دن سویرے سویرے میرے مکان کے اس دروازے پر دستک دی گئی جو بازار کی طرف کھلتا تھا میں نے سستی کے ساتھ اٹھ کر دروازہ کھولا تو دیکھا محلے کا ایک پاگل لڑکا ہاتھ میں کاغذ کا ایک مڑا تڑا پرزہ لیے کھڑا ہے مجھے دیکھتے ہی اس نے پرزہ میرے ہاتھ میں تھمایا اور ہنستا ہوا بھاگ گیا اس کی عادت تھی کہ بازار کی گری پڑی چیزیں اٹھاتا اور دوسروں کو بانٹ دیتا۔ اسے وہ انعام دینا کہتا تھا اور بازار والے تقاضا کر کر کے اس سے انعام لیا کرتے تھے۔

تو آج مجھے بے مانگے انعام مل گیا میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے سوچا اور اپنے روزمرہ کے کاموں میں لگ گیا۔

میں نے یہ بھی سوچا جو میں کبھی کبھی سوچا کرتا تھا کہ اس لڑکے کو پاگل کیوں سمجھا جاتا ہے اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی سوا اس کے کہ وہ ہر وقت خوش رہتا اور بات بات پر ہنستا تھا' تاہم سب اس کو پاگل سمجھتے تھے میں بھی کہتا تھا۔

کچھ دیر بعد پھر اسی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے پھر دروازہ کھولا۔ پھر وہی لڑکا تھا۔

''بلا رہے ہیں'' اس نے ہنسی روک کر کہا۔

''کون بلا رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جو آئے ہیں۔''

''کون آئے ہیں۔''

''پرچے والے'' وہ بولا۔ زور سے ہنسا اور بھاگ گیا۔

میں نے دروازہ بھیڑ کر پلنگ پر پڑا ہوا پرزہ اٹھایا۔ پرانا کاغذ تھا اور اس پر میری ہی تحریر

میں میرا نام پتہ لکھا ہوا تھا اور یہ تحریر ان زمانوں کی معلوم ہوتی تھی جب ہاتھ سنبھال کر اور حرفوں کو خوبصورت بنا کر لکھتا تھا۔ مجھے وہ زمانے یاد آئے یہ بھی یاد آیا کہ انہیں میں سے ایک زمانہ میں نے اجاڑ علاقوں کی برادریوں میں گھومتے گزارا تھا۔ مجھے یاد نہ آسکا کہ یہ پرزہ میں نے کب اور کہاں لکھا تھا' لیکن اتنا ضرور یاد آ گیا کہ اس زمانے میں ایک مشغلے کے طور پر کاغذ کے ایک ایسے پرزے لکھ لکھ کر میں نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ برادریوں میں تقسیم کیے تھے۔

میں ان کی مہمان نوازیوں کا یہی ایک صلہ دیتا تھا۔ میں یہ تاکید بھی کر دیتا تھا زیادہ تر غلط سلط اشاروں کی زبان میں کہ اگر کبھی کسی کو میرے شہر میں کوئی کام آپڑے تو میری تحریر کی مدد سے سیدھا میرے پاس پہنچ جائے۔ میں جانتا تھا کہ اپنی ان تحریروں میں سے کوئی بھی مجھے پھر کبھی دیکھنے کو نہیں ملے گی' لیکن اس وقت' اتنے زمانے کے بعد ایک تحریر کا پرزہ میرے ہاتھ میں تھا اور اگرچہ اطلاع دینے والا وہ تھا جس کو سب کے ساتھ میں بھی پاگل سمجھتا تھا۔ مگر مجھے اطلاع ملی تھی کہ کچھ لوگ اس پرزے کی مدد سے مجھ تک پہنچ گئے ہیں اور مجھے بلوا رہے ہیں چند لمحوں کے اندر میری دیکھی ہوئی ساری برادریاں خواب کے خاکوں کی طرح میرے ذہن میں گھوم کر غائب ہوگئیں اور میں گھر سے نکل کر بازار میں آ گیا۔

بازار کھلنے کا وقت ہوگیا تھا لیکن زیادہ تر دکانیں بند پڑی تھیں دکان دار البتہ موجود تھے اور ایک ٹولی بنائے ہوئے آپس میں چہ میگوئیاں کررہے تھے' مجھ کو دیکھ کر سب میری طرف بڑھ آئے۔

''یہ کون لایا ہے؟'' میں نے پرزہ انہیں دکھا کر پوچھا۔

انہوں نے کچھ کہے بغیر مشرق کی سمت اترنے والی اس بے نام کچی سڑک کی طرف اشارہ کر دیا جس کے دہانے کو بازار کے کوڑا گھر نے قریب قریب بند کر دیا تھا۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ ایک نظر میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کوڑا گھر کی حد سے باہر تک کوڑے کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر لگے ہوئے ہیں لیکن دوسری نظر میں پتہ چلا کہ یہ زمین پر بیٹھے ہوئے آدمیوں کی ٹولی ہے۔

''یہ کون لوگ ہیں؟'' کسی دکان دار نے مجھ سے پوچھا۔

''یہ کوئی برادری معلوم ہوتی ہے'' میں نے کہا اور اِدھر بڑھنے کو تھا کہ ایک اور دکاندار نے پوچھا:

''انہیں آپ نے بلایا ہے؟''

''نہیں۔''

''ملنا تو آپ ہی سے چاہتے ہیں۔''

''مگر میں نے انہیں بلایا نہیں ہے۔''

''اچھا ان کی گاڑی تو ہٹوایئے' رستہ رک رہا ہے۔''

میں نے پکی سڑک پر کھڑی ہوئی گاڑی کو اب دیکھا۔ ایک بڑے سے پیپے کو بیچ سے کھڑا کھڑا کاٹ دیا گیا تھا اس طرح اس کی شکل مدور پیندے اور بغیر نوکوں والی چھوٹی ناؤ کی سی ہو گئی تھی یا شاید وہ کوئی بے معرف ناؤ ہی تھی جس کے دونوں سروں پر کسی پرانے درخت کے گول تنے کی بڑی بڑی ٹکیوں کے پہیے لگا کر اسے خشکی میں سفر کے قابل بنایا گیا تھا۔

میں نے گاڑی کو ذرا اور غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ جسے میں پیپا سمجھ رہا تھا وہ بھی کسی درخت کا آدھا کیا ہوا کھوکھلا تنا تھا جس کے نیچے ہری چھال کے ریشوں کی موٹی رسی میں بندھا اور زمین کو قریب قریب چھوتا ہوا ایک بڑا سا بے ڈول پتھر جھول رہا تھا۔ یہ شاید گاڑی کا توازن قائم رکھنے کے لیے لٹکایا گیا تھا' پھر بھی گرد سے اَٹے ہوئے دو آدمی گاڑی کو دونوں طرف سے پکڑے ہوئے تھے میں نے بے دھیانی کے ساتھ سوچا اگر چھوڑ دیں تو گاڑی آگے کی طرف الٹے گی یا پیچھے کو۔ پھر میں نے اسے اور غور سے دیکھا۔

گاڑی کے خلا میں اوپر تک گودڑ بھرا ہوا تھا اور ایک عورت اس پر جھکی ہوئی گودڑ کو مسلسل ادھر سے ادھر کر رہی تھی۔ سر سے پیر تک چادر میں لپٹی ہونے کے باوجود وہ جوان معلوم ہوتی تھی' میں نے ایک نظر اس کو اور گاڑی تھامے ہوئے دونوں آدمیوں کو دیکھا ہی تھا کہ ایک اور دکان دار کی آواز سنائی دی۔

''کون سی برادری ہے؟''

میں نے مڑ کر کوڑا گھر کے آگے زمین پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا یہ دس بارہ آدمی تھے اور سب کے سب گرد میں اس طرح اَٹے ہوئے تھے کہ ان کے کپڑوں کے رنگ تک آسانی سے پہچانے نہیں جا سکتے تھے ان لوگوں کو دیکھ کر مجھے کچھ بھی یاد نہیں آیا تاہم میں نے پہچان لیا کہ یہ اجاڑ علاقوں کی رہنے والی کوئی برادری ہے۔ میں نے انہیں دیر تک دیکھا وہ سب میری طرف بے تعلقی سے دیکھ رہے تھے اور مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ میں اس برادری میں کبھی نہیں رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرا نام پتا ان لوگوں کے پاس کہاں سے آ گیا اور میں نے ایک بار پھر کاغذ کے اس پرزے کو غور سے دیکھا۔

تب ان لوگوں نے بھی دیکھا کہ میرے ہاتھ میں کاغذ کا پرزہ ہے اور اچانک سب میں جان سی پڑ گئی۔ انہوں نے جلدی جلدی آپس میں کچھ باتیں کیں۔ پھر سب کے سب ایک ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے کپڑوں سے تھوڑی گرد اڑی میں نے خود کو ان کے حلقے میں پایا۔ اسی کے ساتھ میں بازار والوں کے سوالوں کے بھی نرغے میں آ گیا۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنا آخری سوال دہرایا۔

''کون سی برادری ہے۔''

میں نے بتا دیا کہ میں ان لوگوں سے واقف نہیں ہوں' پھر بھی وہ سب مجھ سے اس طرح سوال کرتے رہے جیسے مجھ کو ان لوگوں کا ضامن سمجھ رہے ہوں' مگر ان کے سوال ایسے تھے کہ میں ان کا جواب نہیں دے سکتا تھا۔ یہ ناپاک لوگ تو نہیں ہیں؟ شہر میں چوری کی وارداتوں میں جو اچانک اضافہ ہو گیا ہے ان کا ان لوگوں سے کچھ تعلق ہے؟ یہ کہاں سے آئے ہیں؟ کیا یہ بھیک مانگنے والے ہیں؟

اب میں نے پوچھا:

''کیا ان لوگوں نے کسی سے کچھ مانگا ہے؟''

''ابھی تک تو نہیں'' مجھے جواب ملا' ''ہم تو جس وقت سے آئے ہیں یہ کاغذ دکھا دکھا کر سب سے آپ کا پتہ پوچھ رہے تھے۔''

''کس بولی میں؟''

''اشارے سے''

''پھر؟''

پھر میں نے پوچھا: ''اشارے سے بھیک تو نہیں مانگ رہے تھے؟''

''مگر ان کا حلیہ تو دیکھئے'' ''دیکھ رہا ہوں۔''

''اور گاڑی......'' ''وہ بھی دیکھ رہا ہوں۔''

''......اور گاڑی میں کس کو بٹھا لائے ہیں۔ ابھی ختم ہو جائے تو ٹھکانے لگانے کے لیے ہمارے ہی آگے نہیں روئیں گے؟''

اب میں نے گاڑی کے سوار کو دیکھا۔ ابھی تک میں سمجھ رہا تھا کہ گاڑی میں بھرا ہوا گودڑ کچھ اوپر ابھر آیا ہے لیکن یہ اس کے سوار کا بار بار جھکتا ہوا سر تھا جسے عورت سہارا دیتی تھی لیکن وہ پھر جھک جاتا تھا۔ میں بڑھ کر اس کے قریب گیا۔ عورت نے اس کے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اٹھانا شروع کیا تھا کہ مجھے ان سب لوگوں کی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں اور میں ان کی طرف مڑ گیا۔

وہ بار بار میرے گھٹنے چھو رہے تھے اور بول رہے تھے ان کی بولی میری اپنی زبان کی کوئی بگڑی ہوئی یا بگڑنے سے پہلے کی شکل معلوم ہوتی تھی اور میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔

وہ میرے گھٹنے چھوتے۔ پھر گاڑی کی طرف اشارہ کرتے اور ان کے لہجے میں لجاجت آ جاتی جو لفظوں کی محتاج نہیں تھی۔ اس وقت مجھ کو بھی شبہ ہوتا تھا کہ یہ بھیک مانگنے والوں کی ٹولی ہے ان سے دو چار باتیں کرنے کے بعد مجھ کو احساس ہو گیا کہ وہ بھی میری زبان نہیں سمجھتے ہیں' بلکہ میرا سپاٹ لہجہ ان کو اندازے سے بھی میری بات نہیں سمجھنے دیتا۔ خود ان کے لہجے مختلف تھے تاہم مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کسی بڑے خدشے میں مبتلا ہیں۔ طرح طرح کی مصیبتیں جھیلتے ہوئے یہاں تک پہنچے

ہیں مجھ سے کسی قسم کی امداد چاہتے ہیں اوران سب باتوں کا تعلق گاڑی کے سوار سے ہے۔

اس عرصے میں عورت مستقل سوار کی نشست درست کرتی اور اس کے جھکتے ہوئے سر کو سہارا دیتی رہی تھی۔ میں اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ سوار سینے تک گودڑ میں دفن تھا اور اس کے سر پر بھی گودڑ لپٹا ہوا تھا۔ عورت نے ایک طرف سرک کر دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ اوپر کیا اور میری طرف گھما دیا۔

میرے سامنے ایک بچے کا سوجا ہوا چہرہ تھا اس کے پپوٹے بہت زیادہ پھول گئے تھے ایک پپوٹے کے نیچے ہلکی سی درز تھی جس میں سے وہ مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ دوسرا پپوٹا بالکل بند تھا لیکن اس پر چونا یا اور کوئی سفیدی پھیر کر بیچ میں کاجل یا کسی سیاہی کا بڑا سا دیدہ بنایا گیا تھا جس کی وجہ سے اس ابھرے ہوئے پپوٹے پر ایسی آنکھ کا دھوکا ہو جاتا تھا۔ جو حیرت سے پھٹی پھٹی رہ گئی ہو۔ میں نے اس حیران آنکھ پر سے نظریں ہٹا لیں اور جھک کر دوسری آنکھ کی درز میں جھانکا الجھی ہوئی پلکوں کے پیچھے چھپی ہوئی نگاہ میں اذیت بھی تھی۔ لجاجت بھی تھی اور اکتاہٹ بھی۔

میں نے اس کے چہرے کو ذرا اور قریب سے دیکھنے کی کوشش کی تو گاڑی میں ٹھنسے ہوئے گودڑ میں لہریں سی پڑنے لگیں۔ سوار نے ہلکے جھٹکے سے اپنا چہرہ پیچھے کر لیا اس کے ہونٹ سکڑے اور دانت باہر نکل آئے۔ مجھے اپنی پشت پر دکان داروں کی ہنسی کی آوازیں سنائی دیں۔ دور سے سوار شاید ہنستا ہوا دکھائی دیتا تھا لیکن مجھ کو وہ کسی بیمار کتے کی طرح نظر آیا۔ جس کی طرف شریر لڑکے بڑھ رہے تھے۔

اچانک ہنسی کی آواز بازار والوں کی بھنبھناہٹ اور برادری والوں کی تیز آوازوں میں دب گئی۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ آپس میں الجھ پڑے ہیں۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دونوں گروہ ایک ساتھ مجھ سے کچھ کہہ رہے تھے لیکن میری سمجھ میں کسی کی کوئی بات نہیں آئی۔ اسی وقت عورت نے میرا ہاتھ دبوچ لیا اور میں اس کی طرف گھوم گیا اس نے اپنا دوسرا ہاتھ گودڑ میں ڈالا اور ادھر ادھر ٹٹول کر سوار کا ایک ہاتھ کہنی تک نکال لیا۔ میرے سامنے تین ہاتھ تھے۔

میرا اپنا جانا پہچانا ہاتھ، اس کی انگلیوں میں انگلیاں الجھائے ہوئے عورت کا پسیجا ہوا نرم مگر مضبوط ہاتھ اور ہم دونوں کی ہتھیلیوں کے درمیان سوار کا چھوٹا سا سوکھا ہوا ہاتھ جس کی کلائی سے کہنی تک رنگ برنگے ڈورے لپٹے ہوئے تھے۔ اور ان کے بیچ بیچ سے جھانکتی ہوئی مردہ کھال میں جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ عورت کی انگلیاں میری انگلیوں میں لپٹ کر دل کی طرح دھڑکیں۔ مجھے ہلکی سی جھرجھری آئی اور سوار نے منہ سے ایک آواز نکالی اس بیمار کتے کی طرح جس کی طرف شریر لڑکے بڑھ رہے ہوں۔

ایک دکاندار نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میں ادھر مڑ گیا۔

''گاڑی ہٹوائیے'' وہ کہہ رہا تھا' ''دکانداری خراب ہو رہی ہے۔ سویرے سویرے یہ لوگ......''

میں برادری والوں کی جانب مڑا اب وہ سب خاموشی سے مجھ کو تک رہے تھے میں نے انہیں سیدھی سڑک پر شمال کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا جو ان کی سمجھ میں فوراً آ گیا۔ گاڑی کو سہارا دینے والے دونوں آدمیوں نے اسے آسانی سے گھما دیا۔ عورت نے میرے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور سوار کا ہاتھ گوڈر کے اندر کر کے اس کے سر کو سہارا دینا شروع کیا اور گاڑی ہلکی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ آگے بڑھی اس کے پیچھے اپنی اپنی میلی کچیلی پوٹلیاں سنبھالے اور ہاتھوں میں لمبی لمبی لاٹھیاں تھامے۔ ایک قطار میں برادری والے چل رہے تھے اور سڑک کے دونوں طرف دکاندار اور محلے کے دوسرے لوگ جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے۔ خاموش کھڑے تھے۔ میں گاڑی کے آگے آگے تیزی سے چلتا اور دکانوں کے سلسلے کو پیچھے چھوڑتا ہوا پکی سڑک کے مغربی موڑ پر پہنچ کر رکا۔

میں نے مڑ کر ان لوگوں کو اس موڑ پر آ کے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتے رہے۔ ان کے آس پاس گرد اڑ رہی تھی' اور اب مجھے سب کچھ ایک ساتھ نظر آیا۔ ان میں ہر فرد اور ہر شے کہنہ اور بوسیدہ اور عنقریب بکھر جانے والی معلوم ہو رہی تھی' پھر بھی میں نے سوچا' اگر سب کچھ اتنا غبار آلود نہ ہوتا اور اگر گاڑی کے نیچے لٹکتا ہوا پتھر کچھ سڈول ہوتا تو اس جلوس پر کسی شاہی سواری کا گمان ہو سکتا تھا۔

وہ میرے قریب آ کر رک گئے میں نے ان کے پیچھے کچھ دور پر بازار والوں کو اپنی اپنی دکانوں کی طرف جاتے اور تماشائیوں کی قطاروں کو منتشر ہوتے دیکھا پھر میں برادری والوں کی طرف متوجہ ہوا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اب میں اطمینان کے ساتھ ان کی بات سن سکتا ہوں۔ انہوں نے بھی اطمینان کے ساتھ بولنا شروع کیا۔

میری سمجھ میں صرف اتنا آیا کہ وہ گاڑی کے سوار کے بارے میں مجھے تفصیلیں بتا رہے ہیں لیکن ان تفصیلوں کا صرف ایک جز میری سمجھ میں آ سکا کہ گاڑی کا وہ سوار آخری ہے۔ چھوٹی برادریوں میں گھومنے کے دوران میرے سامنے آخری کا مفہوم مختلف بولیوں میں اور مختلف اشاروں کی مدد سے اتنی بار ادا کیا گیا تھا کہ اب اسے میں آسانی سے سمجھ لیتا تھا۔ اس برادری کا بھی قریب قریب ہر آدمی سوار کا حال بتانے کے بعد میرے گھٹنے چھوتا اور لجاجت کے ساتھ جتاتا کہ وہ سوار آخری ہے۔

میں نے بلا سبب خود کو ان کا اور ان سے زیادہ اس سوار کا ضامن محسوس کیا اور انہیں مطمئن ہو جانے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگے پھر سب نے ایک دوسرے کو مطمئن ہو جانے کا اشارہ کیا اور واقعی مطمئن ہو گئے۔ میں نے انہیں وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور تیز قدموں سے چلتا

ہوا۔ جیسے ابھی واپس آتا ہوں اپنے مکان کے دروازے پر آ گیا۔

پاگل لڑکا دروازے پر کھڑا تھا اور ڈرا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

''وہ کون لوگ ہیں؟'' اس نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا:

''پرچے والے ہیں'' میں نے جواب دیا' ''تم نے انہیں انعام نہیں دیا؟''

''انعام؟'' اس نے یوں پوچھا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہو۔

میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور کہا:

''جاؤ' دوڑ کر انعام لے آؤ' پھر ان کے پاس چلیں گے۔''

''نہیں'' اس نے کہا اور پہلے سے بھی زیادہ ڈرا ہوا معلوم ہونے لگا۔

''اچھا' جاؤ کھیلو'' میں نے کہا: ''مجھے کام ہے۔''

''وہ بڈھا کون ہے؟''

''بڈھا؟''

''جو گاڑی میں چھپا ہوا ہے۔''

''وہ بڈھا نہیں ہے'' میں نے کہا۔

پھر میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ میں نے سوار کو بچہ کیوں سمجھ لیا تھا؟ وہ کوئی بوڑھا بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کی ہیئت یاد کی۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور ہاتھ پر جھریاں تھیں میں نے اس کے ہاتھ کی بناوٹ یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی جگہ مجھے عورت کا پسیجا ہوا ہاتھ یاد آیا۔ جن کی انگلیاں میری انگلیوں میں الجھی ہوئی تھیں اور دل کی طرح دھڑکتیں تھیں۔ میں نے زور سے سر کو جھٹکا اور برادری والوں کی باتوں اور اشاروں کو یاد کرنے لگا۔ میری سمجھ میں صرف اتنا آیا تھا کہ وہ آخری ہے۔ برادری کا آخری بچہ' یا آخری بوڑھا؟ کسی آدمی کی یا کسی زمانے کی' آخری نشانی؟ کسی چیز کی یا کسی واقعے کی آخری یادگار؟ میرا دماغ الجھتا گیا اور میں نے اس الجھن میں شاید بہت وقت گذار دیا۔ اس لیے کہ جب میں نے فیصلہ کیا کہ اسے پھر سے جا کر دیکھو تو پاگل لڑکا جا چکا تھا اور دوپہر ڈھلنے کے قریب تھی۔

کوڑا گھر اور دکانوں کے سلسلے کو پیچھے چھوڑتا ہوا میں آگے بڑھا تو میں نے دیکھا کہ وہ سب میری طرف آ رہے ہیں۔ گاڑی آگے آگے تھی۔ سوار کا چہرہ گاڑی کی کگار پر ٹکا ہوا تھا اور اس کے سر پر لپٹا ہوا گودڑ جگہ جگہ سے کھل گیا تھا۔ عورت بار بار خود بھی گاڑی میں سوار ہونے کی کوشش کر رہی تھی اور ہر بار کوئی نہ کوئی اسے پکڑ کر پیچھے گھسیٹ لیتا تھا۔ مجھے گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ کے پیچھے ان کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ کچھ گاتے ہوئے سے معلوم ہو رہے تھے باری باری ایک آدمی کچھ بول کہتا اور اس کے آخری دو تین لفظوں کو سب مل کر دہراتے تھے۔ انہوں نے ایک صف بنالی تھی اور ان کی

آوازیں بلند ہوتی جارہی تھیں۔ایک آدمی صف سے آگے نکلا۔اس نے لحن سے کچھ کہا اور سب نے اسے دہرایا۔ وہ آدمی صف میں واپس چلا گیا اور دوسرا آدمی آگے نکلا اس کی آواز اور دوسروں کی جوابی آواز پہلے کی آوازوں سے زیادہ بلند تھی اور اب ان کے ہاتھ اور بدن کچھ رقص کے سے انداز میں جنبش کر رہے تھے کچھ کچھ دیر بعد کوئی ایک آدمی صف سے آگے بڑھتا۔ کچھ بول کہتا' سب اس کا ساتھ دیتے پھر چپ ہو کر یوں سر ہلاتے جیسے اسے داد دے رہے ہیں۔ میرے خیال میں واہ داد دینے کا اشارہ تھا' لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس برادری میں اس اشارے کا کیا مطلب ہے۔

میں ان کی آنکھوں کے ٹھیک سامنے ہونے کے باوجود انہیں شاید نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ میری ہی طرف بڑھ رہے تھے ان کی پیش قدمی کے ساتھ میں الٹے قدموں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا جا رہا تھا میرے کان کی آوازوں پر اور نگاہیں ان کے اشاروں پر لگی ہوئی تھیں۔ وہ کوئی داستان سنا رہے تھے اور اس داستان کے مبہم منظر میرے سامنے خواب کے خاکوں کی طرح بن بن کر مٹ رہے تھے میں نے دیکھا کہ ایک بچے کو گودیوں میں کھلایا جا رہا ہے۔ بچہ چلنا سیکھ رہا ہے چلتے چلتے گر کر رو رہا ہے' بہلایا جا رہا ہے' بہل گیا ہے' دوڑ رہا ہے؟ تھک کر سو گیا ہے' سو کر اٹھا اور ہتھیلیوں سے آنکھیں مل رہا ہے اور اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی ہیں۔

مجھے بہت سی سرخ آنکھوں کے جوڑے اپنی طرف بڑھتے دکھائی دیئے۔اب وہ سب ایک ساتھ' ایک ہی لحن میں ایک ہی اشارے سے آخری' آخری کہہ رہے تھے اور ان کے گلے پھٹے جا رہے تھے۔ ان پر ایک جوش طاری تھا اور معلوم ہوتا تھا سب غصے سے پاگل ہو رہے ہیں پھر سب پر ایک ساتھ نشہ سا چڑھ گیا۔ گرد نے ان کے کپڑوں سے اڑ کر اور قدموں کے نیچے سے اٹھ کر ان کو لپیٹ لیا اور ایک چھدرے بادل کی صورت میں ان کے آگے منڈلانے لگی۔ گرد کے پیچھے گاڑی کے سوار کے چہرے کو عورت نے پھر سہارا دے کر اوپر اٹھا دیا تھا۔ اس کی آنکھ کی درز بند ہو گئی تھی لیکن دوسری' سفیدی اور سیاہی سے بنی ہوئی' آنکھ مجھ کو حیرت سے دیکھ رہی تھی اور گرد میں میں اٹ جانے کے بعد بھی بند نہیں ہو رہی تھی۔ گاڑی سڑک کے کسی کھانچے پر سے گذری۔ سوار کے سر کو ایک جھٹکا لگا اور اس پر لپٹا ہوا گدڑ تھوڑا اور کھل گیا۔ آنکھ میں ملامت جھلکی' پھر غصہ' پھر ہلکا سا نشہ اور پھر حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔

دکانوں کے سلسلے کے قریب پہنچتے ہی وہ سب خاموش ہو کر رک گئے سب تھکن سے چور اور میری موجودگی سے بے خبر معلوم ہو رہے تھے اب انہوں نے آپس میں کچھ مشورہ کیا اور دور سے میرے مکان کی طرف اشارہ کرنے لگے میں مڑا اور تیز قدموں سے اپنے مکان کی طرف چلا۔ دروازہ آنے سے پہلے میں نے پلٹ کر دیکھا اب وہ میری طرف اشارہ کر کر کے ایک دوسرے کو کچھ بتا رہے تھے پھر وہ آگے بڑھنے لگے۔ سیدھے میری طرف' میں مڑا اور اپنے دروازے کو پیچھے چھوڑتا

ہوا کوئی چالیس قدم آگے نکل کر پھر رکا۔ آہستہ سے گھوم کر میں نے ان کی طرف دیکھا۔ بیٹھی ہوئی گرد میں وہ مجھے کوڑے کے ایک ہلتے ہوئے ڈھیر کی طرح نظر آئے پھر ان کی ترتیب بگڑ گئی اور سب نے سر جھکا لیے۔

دیر تک مجھ پر یہ خیال غالب رہا کہ میں نے کوئی منظر دیکھا ہے۔ جسے اب کبھی نہ دیکھ سکوں گا۔ مجھے ہلکا سا پچھتاوا بھی ہوا کہ میں خود اس منظر میں شامل نہیں تھا۔ لیکن میں نے خود کو بہت محفوظ بھی محسوس کیا اس لیے کہ اب وہ لوگ مشرق کی سمت کٹنے والی ایک بے نام کچی سڑک پر اتر رہے تھے جو شہر سے باہر اجاڑ علاقوں کی طرف جاتی تھی۔

❀ ❀ ❀

انور قمر

چوراہے پر ٹنگا آدمی

اُس کے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور پیر ٹخنوں سے — گلے میں رسی کا پھندا پڑا تھا اور وہ چوراہے پر جھول رہا تھا۔ اس کے جسم پر موجود لباس سے ظاہر ہوتا تھا کہ متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی ٹیری کاٹ کی سفید قمیص اور ٹیری وول کی سلیٹی رنگ کی پتلون غیر شکن آلودہ تھی۔ سیاہ جوتے پر پالش بھی خوب چمک رہا تھا۔ نائلون کے ذرا سے نظر آتے موزوں کا لاسکٹ بھی کسا ہوا تھا۔ اس لیے موزے اپنی جگہ پر چست بیٹھے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ پہننے اوڑھنے کے معاملے میں بڑا محتاط شخص ہے۔

اس کے پیچھے کو بندھے داہنے ہاتھ میں اٹیچی لٹک رہی تھی، جو کھل چکی تھی۔ اس میں بنے خانوں میں ایک بال پن اور ایک پین ٹنگا ہوا تھا۔ دوسرے سے ایک ڈائری کا اوپری سرا جھانک رہا تھا۔

جب بحیرۂ عرب کی طرف سے ہوا کا کوئی جھونکا آتا تھا تو اس کی پیشانی پر بکھرے ہوئے بال پیچھے کو اڑنے لگتے۔ کھلی ہوئی اٹیچی میں سے بھی اکا دکا کاغذ اڑ پڑتے اور وہ اس رسی پر ٹنگا ٹنگا ادھر ادھر جھول جاتا۔ جھولنے کے عمل کے دوران میں ہر مرتبہ اس کی سیاہ فریم والی عینک ناک سے ذرا نیچے کھسک آتی اور اب ہر لحہ کی نک پر اس کی ناک سے گر پڑنے والی تھی۔

چرچ گیٹ اسٹیشن کے حلق سے اُگلے ہوئے تمام لوگ اس کے داہنی طرف جمع تھے مرین ڈرائیو کی طرف سے آنے والے اس کے سامنے کی طرف جمع تھے اور اس کی بائیں طرف وہ لوگ جمع تھے جو دھر کی ادھر درمیانی سمتوں سے چلے آئے تھے۔

یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی بہت بڑا لیڈر، کوئی مہا برش، کوئی مہاتما یا کوئی پیغمبر ان سے خطاب کرنے والا ہو اور یہ سب کے سب بڑی عقیدت سے اس کا خطبہ سننے چلے آئے ہوں۔

وہ سب کے سب ایک دوسرے کی صعوبتوں سے واقف تھے۔ ان سبوں کو معلوم تھا کہ انہیں کپڑے کیوں ڈستے ہیں! جوتے کیوں کاٹتے ہیں! کھانا کیوں بدمزہ لگتا ہے اور پانی کیوں نمکین لگتا ہے!

دلچسپ بات تو یہ تھی کہ موجودہ ہر شخص چوراہے پر جھولتے اس شخص کو اپنی شبیہہ وہاں پر سمجھ رہا تھا۔ ہر شخص یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ خود چوراہے پر لٹک رہا ہے۔

اسٹیشن کے پورٹیکو کے اوپر نصب گھڑی نے دس بجائے۔

نیلکو Nelco کی سکنڈ' منٹ اور گھنٹہ میں وقت بتاتی گھڑی نے دس بجائے۔

یونیورسٹی ٹاور کے کلاک نے دس بجائے۔ اور تمام لوگوں کی رسٹ واچوں نے دس بجائے۔

لیکن آج جو دس بجے تھے وہ کل کے نہیں اور ممکن ہے کہ آئندہ کل کے سے بھی نہ ہوں کیونکہ ان تمام لوگوں کو اس وقت اپنی اپنی آفسوں میں اپنے اپنے ٹیبلوں کے پیچھے اپنی اپنی کرسیوں پر موجود ہونا تھا۔ لیکن یہ سب کے سب آج اس چوراہے پر ٹنگے اس آدمی کے گرد جمع تھے۔

سب کے سب خاموش! سب کے سب موشن لیس Motionless غیر متحرک ان کی تو آنکھیں بھی مجسموں کی آنکھوں کی طرح پتھرائی ہوئی تھیں اور دل! وہ بھی دھڑکنا بھول گیا تھا۔

''کچھ کہو...... کچھ کہو۔''

وہ سب کے سب یک زبان ہو کر بولے:

''میں کیا کہوں؟ میں کیا کہوں؟ میرے گلے میں پھندا پڑا ہے۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہیں! اور پیر حرکت کرنے سے معذور! میں تو اشاروں سے بھی بات نہیں کر سکتا اور نہ یہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل ہو سکتا ہوں۔''

''تم کہاں جانا چاہتے ہو؟ تم کہاں جانا چاہتے ہو؟'' ان سبوں نے اس چوراہے پر لٹکے آدمی سے پوچھا:

''تم ہی بتاؤ تم کہاں جانا چاہتے ہو؟''

اس نے وہی سوال ان سے کر دیا۔

''ہم کہاں جانا چاہتے ہیں؟...... ہم کہاں جانا چاہتے ہیں؟'' وہ سب ایک دوسرے سے دریافت کرنے لگے۔

چوراہے پر ٹنگے آدمی نے قہقہہ لگایا: ''ہا — ہا — ہا' جب تمہیں خود ہی نہیں معلوم اور تم سبوں کو نہیں معلوم کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو' تو یہ سوال تم نے مجھ سے کیوں کیا؟ اپنے آپ ہی سے پہلے پوچھ لیتے!''

''تم مہمان ہو!'' وہ سب بولے۔

''اس لیے کہ چوراہے پر لٹک رہا ہوں؟''

''نہیں تم وہاں کھڑے ہو جہاں سے ہم سب نظر آ رہے ہیں اور ہم وہاں کھڑے ہیں جہاں سے ہمیں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا ہے۔''

''ہر بلندی سے نیچے کی چیز نظر نہیں آتی۔ اونچائی اتنی ہی ہو کہ جہاں سے سب کچھ نظر آ سکے۔''

''تو کیا تم بہت اونچائی پر لٹک رہے ہو؟'' ان سبوں نے کہا۔

''ہاں''

''کیا تمہیں ہم نظر نہیں آ رہے ہیں؟''

''مجھے تمہارے سروں کا کالا سمندر نظر آ رہا ہے اور کچھ نہیں!''

''تو کیا تم کچھ نیچے نہیں آ سکتے؟''

چوراہے پر ٹنگے اُس آدمی نے پھر قہقہہ لگایا۔

''ہا— ہا' تم جانتے ہو کہ میرے گلے میں پھندا پڑا ہے۔ میرے دونوں ہاتھ پشت پر بندھے ہیں۔ میرے پیر بھی حرکت کرنے سے معذور ہیں تم ہی بتاؤ کہ میں اپنی جگہ سے کیسے جنبش کروں ...... البتہ تم چاہو تو مجھے نیچے اتار سکتے ہو۔ تم چاہو تو مجھے کم بلندی پر ٹانگ سکتے ہو اور تم چاہو تو مجھے اور زیادہ بلندی پر بھی اٹھا سکتے ہو!''

''ہم تمہیں نیچے اتارنا چاہتے ہیں۔ ان سبوں نے کہا!''

''میں تیار ہوں۔''

''ہم تمہیں مناسب اونچائی پر ٹانگنا چاہتے ہیں۔''

''مجھے منظور ہے۔''

''ہم تمہیں بہت زیادہ اونچائی پر اٹھا دینا چاہتے ہیں۔''

''مجھے یہ بھی منظور ہے''۔ چوراہے پر لٹکے ہوئے آدمی نے کہا:

''یہ کیا بات ہے کہ تم تینوں حالتوں میں رہنے کو تیار ہو''۔ انہوں نے پوچھا۔

اس لیے کہ میں ان تینوں حالتوں میں تم سبوں سے الگ رہوں گا۔ اس لیے خوش رہوں گا۔ بہت زیادہ اونچائی پر بھی کم اونچائی پر بھی— اور زمین پر بھی۔''

''وہ کیسے؟ زمین پر تم ہم سے الگ کیسے رہ سکتے ہو؟''

چوراہے پر ٹنگے آدمی نے پھر قہقہہ لگایا۔

''ہا— ہا' ہا' اب میں کبھی صبح اخبار نہیں پڑھوں گا۔ کبھی چائے نہیں پیوں گا۔ کبھی بوٹ پالش نہیں کراؤں گا۔ کبھی داڑھی نہیں بناؤں گا— کبھی ریڈیو نہیں سنوں گا— کبھی کام پر نہیں جاؤں گا۔ کبھی راہ چلتے اشتہار نہیں پڑھوں گا کبھی کسی کو تھینک یو نہیں کہوں گا ...... کیونکہ میں اپنی زندگی کے پہیے کو گھماتے گھماتے بور ہو گیا ہوں بے زار ہو گیا ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ وہ پہیا جس محور پر گھوم رہا ہے وہ اپنی جگہ ہی پر قائم ہے۔ جب محور اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا تو پہیا کیوں حرکت کرے گا۔

میں وہیں ہوں جہاں تھا۔ اور اگر محور اب بھی نہ بدلوتو سالہا سال تک وہیں رہوں گا۔ اس لیے اب محور ہی کوئی اور ہوگا۔ نیا۔۔۔انوکھا۔۔۔اچھوتا۔۔۔!''

دو آدمی دائیں طرف کے درخت پر چڑھ گئے اور دو بائیں طرف کے درخت پر! آناً فاناً انہوں نے رسے کی گرہیں کھولیں اور بڑی آہستگی سے رسہ چھوڑتے ہوئے اس آدمی کو نیچے اتارا۔

اُس آدمی نے زمین پر قدم رکھتے ہی بڑے اجنبیت سے اس جم غفیر کو دیکھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ان تمام کا اس سے جو اجنبی سا رشتہ قائم ہوا تھا۔ وہ اس کی اجنبی نظروں نے توڑ دیا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کی طرف بڑی گرم جوشی سے بڑھے تاکہ اسے گلے لگالیں' اور پوچھیں کہ اب اس کا نیا محور کون سا ہوگا؟ کیونکہ وہ سب کے سب اپنی زندگی کے پہیے کو ایک ہی غیر متحرک محور پر گھماتے گھماتے بور ہو گئے تھے' بے زار ہو گئے تھے۔۔۔ تھک گئے تھے۔۔۔اور اس نے وہ جو تازگی' فرحت اور کشادگی کی بات کہی تھی' انہیں بہت پسند آئی تھی۔

اس نے سب سے پہلے تو ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اس کے بیگ کے تمام کاغذات دور دور تک بکھرے پڑے تھے۔ اس نے انہیں جمع کیا۔ بیگ میں رکھا اور بیگ بند کر دیا۔ جیب سے کنگھی نکالی' بال بنائے' چشمہ ناک پر درست کیا اور رومال سے منہ صاف کیا۔ پھر آہستہ آہستہ ایک سمت کو چل پڑا۔۔۔وہ سب کے سب اس کے پیچھے چل پڑے۔

وہ ایک بلند و بالا عمارت کے سامنے جا کر رک گیا عمارت کا داخلی دروازہ مقفل تھا۔

وہ بڑبڑانے لگا۔۔۔''کیا آج چھٹی ہے؟''

''کیا آج میں گھر سے جلدی چلا ہوں؟''

''کیا آج کہیں کوئی ہنگامہ تو نہیں ہوا؟''

دوسرے روز حسبِ معمول اس نے اپنے چائے کے پہلے پیالے کے ساتھ اخبار دیکھا اور یہ خبر پڑھ کر ششدر رہ گیا کہ کل فلورا فاؤنٹن کے چوراہے پر ایک شخص نے اپنے گلے میں رسی کا پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ جس کی لاش دیکھنے کے لیے ہزاروں لوگ جمع ہو گئے تھے۔ اور وہ لوگ اس وقت تک جمع تھے جب تک چوراہے پر ٹنگے اس شخص کی لاش نیچے نہ اتاری گئی۔

❀❀❀

حسین الحق

مردہ راڈار

گئی رات تک اس کے رونے اور کراہنے کی دل چیرتی آواز سنائی دیتی رہی۔

وہ جاڑے کی ایک انتہائی سرد اور قدرے ابر آلود رات تھی' سورج دن بھر بادلوں کے نرغے میں گھرا رہا تھا' ہڈیوں کو چیرتی ہوا' گاہے گاہے رم جھم بارش' زندگی جیسے ٹھہری سی گئی تھی......ایسے ہی موسم میں مغرب کی اذان سے کچھ پہلے یا کچھ بعد' وہ پانی کے اس جماؤ کا حصہ بنا تھا۔

پانی کا وہ جماؤ شہر کے ایک پوش حصے میں تھا۔ بڑے بڑے خوبصورت عالی شان مکانات' مکانوں کے اردگرد چہار دیواری' زیادہ مکانوں کے اندر گیرج اور زیادہ گیرجوں میں گاڑیاں' اور چہار دیواریوں کے اندر' چاروں طرف پھول پودوں کا انبار عہد قدیم سے ہم مہذب ترین اقوام میں گنے جاتے رہے ہیں' کالونی والوں کو تقریباً ساری سہولتیں میسر تھیں......غلاظت کی نکاسی کے انتظام کے سوا......اس پوش کالونی میں بھی گندہ پانی جمع ہو ہی جاتا تھا۔

بات پر بات نکلتی ہے اور بات پر بات یاد آتی ہے' اسی کے حوالے سے شرفو چچا اور منے بھائی نے خاصی دھواں دھار بحث کی تھی۔ شرفو چچا کا کہنا تھا کہ ''اب اس کالونی میں زمین کی قیمت ڈیڑھ لاکھ روپے سے کم نہیں ہونی چاہیے''۔ منے بھائی نے ابھی مکان نہیں بنایا تھا اور اسی کالونی میں زمین کے متلاشی تھے' وہ کہنے لگے ہاؤسنگ سسٹم صحیح نہیں ہے' اتنی قیمت کون دے گا؟ شرفو چچا دلیل لائے کسی کے گھر کا پانی کسی گھر میں تو نہیں سڑتا......'' بس ایسی پوش کالونی میں بھی پانی کا جماؤ موجود تھا۔ اور گئی رات تک اُس کے کراہنے اور رونے کی آواز دل چیرتی رہی۔

طاہر علی گئی رات تک بولایا بولایا پھرا' اس کے گھر کے بالکل بغل میں تھا...... پانی کا وہ جماؤ......اُس نے کھڑکیاں اور دروازے سب بند کر رکھے تھے۔ مگر دروازوں کے شگافوں اور جھریوں کا وہ کیا کرتا؟ بار بار اس کی خواہش ہوتی کہ وہ دروازہ کھول کر باہر نکلے اور پچھواڑے سے گرتی اس دکھ بھری آواز کا درد آشنا بنے' مگر اس دن اتفاق سے گھر میں' مرد کی صورت میں وہ تنہا تھا اور ان دنوں ڈاکوؤں اور لیٹروں کے خوف سے گھروں کے دروازے' سرشام ہی بند ہو جاتے تھے' دراصل یہ غنڈے اور اچکے بیسیوں گھروں میں گھس چکے تھے اور بہت خوف و ہراس پھیلا چکے تھے اور ان کی

گرفت کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں کہ اس علاقے یا شہر سے پولیس چوکیاں ختم کر دی گئیں تھیں مگر ''بارا کانڈ'' میں ساری انتظامیہ اس طرح الجھ کر رہ گئی تھی کہ اسے شہر کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں مل رہی تھی۔ لہٰذا کوئی بھی ذی روح کسی نالے یا گدلے پانی یا گندگی کے جماؤ میں گھر جاتا اور گئی رات تک کراہنے اور رونے کی دل چیرتی آواز سنائی دیتی رہتی۔

اس دن بھی' مغرب کے آس پاس ہی سے پھٹی پھٹی' چیخنے اور چلانے کی آواز دل چیرتی اور رونگٹے کھڑی کرتی رہی طاہر علی ہڑبڑا کر باہر نکلا اور عقب کی طرف دوڑا...... منظر دیکھ کر پہلے تو ہنسی آئی پھر فارسی کا ایک محاورہ یاد آیا اور پھر آہستہ آہستہ افسوس کی ایک کانٹے دار لہر نے اس کے چاروں طرف اپنا جال کسنا شروع کیا مگر اسی وقت باس کا فون آ گیا...... بیٹے نے آ کر بتایا تو وہ بلا سوچے سمجھے گھر کی طرف دوڑ پڑا اس کا باس نوجوان تھا اور بیک ورڈ بھی اور کچھ کرنے کا خواہش مند بھی اس لیے قانون اور ضابطے کی زبان بہت بولتا تھا۔ اور طاہر علی جیسے افراد جو مزاجاً لڑائی جھگڑے اور زور زبردستی سے اپنا کام نکلوانے والے نہیں ہوتے' ان کے لیے قانون کا ڈنڈا ہمیشہ ''تنبیہ الغافلین بنا رہتا ہے طاہر علی حتی الامکان یہ کوشش کرتا تھا کہ اس کا شمار غافلوں میں نہ ہو' وہ باس کی آواز پر کیسے نہ دوڑتا؟ باس سے فون پر گفتگو ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ کچھ لوگ ملنے آ گئے آنے والے طاہر علی کے بے تکلف دوستوں یا پسندیدہ افراد میں سے نہیں تھے۔ مگر ان کی آمد سوشل اسٹیٹس کا درجہ ضرور رکھتی تھی...... اب ایسے میں وہ اس کے گرنے والے قطمیر صفت کی طرف کیا متوجہ ہوتا!

وہ ڈرائنگ روم میں ان لوگوں سے باتیں کرتا رہا اور اس کے رونے اور کراہنے کی آواز آتی رہی۔

پانی کا وہ جماؤ ایک ایسے خطہ زمین پر تھا جس کے چاروں طرف چہار دیواری تو تھی مگر مکان یا پلاننگ نام کی کوئی چیز نہیں' اور چونکہ ابھی اس پر مکان تعمیر نہیں ہوا اور انتظامیہ نے بھی کالونی سے غلاظت نکالنے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ اس لیے اردگرد والوں نے اپنی اپنی نالیوں کا رخ اسی خطۂ زمین کی طرف کر دیا تھا اور اس پر یکطرفہ تماشا یہ کہ برسات کا پانی بھی اردگرد کے سارے ڈھلوانوں سے ہوتا ہوا یہاں تک آ جاتا' بات صرف یہیں تک رہتی تو شاید مسئلہ اتنا شدید نہ ہوتا۔ مگر ہر گھر والے اپنا کوڑا کرکٹ بھی تو اسی پانی میں پھینکتے پس پانی آتا بھی ہے' جمتا بھی ہے' سڑتا بھی ہے اور دلدل بھی بناتا ہے۔

طاہر علی کو بات کرتے کرتے اچانک یاد آیا کہ وہ ''قطمیر زادہ بھی تو دلدل ہی میں پھنس گیا ہے' اور اسے پھر سنائی دی...... اس کے رونے اور کراہنے کی آواز...... دل چیرنے کی حد تک دل دوز ...... پھر ایک مرتبہ خواہش ہوئی کہ وہ باہر جائے اور اس کو اس مصیبت سے نجات دلائے ...... پچھلی مرتبہ بھی تو......''

پھر خیال کی رو بھٹک گئی...... اس شہر میں وہ ابھی نو وارد ہی تھا' ملازمت کے سلسلے میں وہ یہاں آیا اور اسی واسطے سے یہاں کی وہائٹ کلر سوسائٹی کا حصہ بنا پھر اس کے انداز گفتگو نے اسے انٹلکچوئل صفوں تک پہنچایا۔

مسائل پر اس کا جو منفرد نقطہ نظر رہتا تھا اور اس منفرد نقطہ نظر کو وہ جس مدلل انداز میں پیش کرتا تھا' اس کے بھی قائل تھے مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ...... ''ایک صالح معاشرے میں سماجی انصاف کی قدر کو عمل میں کس طرح تبدیل کیا جا سکتا ہے؟''

طاہر علی جانتا تھا کہ ایک دن کیا اگر ایک نشست میں بھی بحث کے مجموعی منظر نامے پر کوئی دوسرا غالب آ گیا تو پھر طاہر علی کو اپنا انٹلکچوئل والا امیج بچانا دشوار ہو جائے گا...... اس نے ہوا میں ہاتھ لہرایا اور کہنا شروع کیا:

''صالح معاشرہ ہمیشہ صالح اقدار کی بنیاد پر وجود میں آتا ہے اور صالح اقدار کے فروغ کا مطلب ہے۔''

''سماجی انصاف کا حصول' اور سماجی انصاف کا کلیدی نکتہ ہے زندہ رہو اور زندہ رہنے دو!''

طاہر علی بولتے بولتے اچانک رک گیا' انیل کمار سب جج بیچ ہی میں پوچھ بیٹھے ''یہ کتے کا پلا کہاں رو رہا ہے؟''

طاہر علی کو غصہ تو بہت آیا مگر اس نے ضبط کیا انیل کمار کی یہ کوئی نئی حرکت نہیں تھی' جب بھی جج صاحب دیکھتے کہ فریق ثانی مجلس پر حاوی ہو رہا ہے تو وہ ایسی ہی غیر متعلق باتیں اٹھا کر بات کا رخ موڑ دیتے' مگر اس دن طاہر علی نے بھی طے کر لیا تھا کہ چاہے جو ہو' انیل کمار کو تو کامیاب نہیں ہونے دینا ہے۔''...... اس لیے جواباً صرف اتنا بولا: ''کتے تو بھونکتے ہی رہتے ہیں'' اور پھر اپنی کہی بات کا سرا بعد کی بات سے جوڑنے لگا...... ''دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ......''

کتے کا پلا روئے جا رہا تھا...... دلدل میں جو بھی پھنستا ہے وہ رونے کراہنے کے سوا کیا کر سکتا ہے؟

بحث ہمیشہ کی طرح بے نتیجہ رہی' کتے کے پلے کے رونے کراہنے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا...... حالانکہ پچھلی مرتبہ دو تین بجے دن میں اچانک پچھواڑے سے کئی بکریوں کے بے تابانہ ممیانے کی آواز سن کر جب وہ دوڑا تھا تو صورتحال اس سے بھی زیادہ بھیانک تھی۔ ایک بکری نہ جانے کس طرح اس ''چھبچے'' (گندے پانی کا جماؤ) میں گر گئی تھی۔

بکریاں تو پانی سے ایسے ہی بھاگتی ہیں اور وہاں یہ مصیبت آن پڑی کہ ایک بکری گھورے پر دانے کی تلاش میں گئی اور پھسل کر پانی میں گر پڑی' ظاہر ہے کہ اس کا چیخنا بالکل فطری تھا' مگر اس کی چیخ سن کر جہاں کئی بکریاں دوڑیں وہیں کتوں کو سن گن مل گئی۔ بکریاں...... محبت کی ماری

......آواز پر...... دوڑ تو گئیں مگر اپنی فطرت سے مجبور' پانی سے سگ گزیدہ جس طرح ڈرے' کنارے پر پہنچ کر لگا سبھی ہمت ہار گئیں کنارے پر کھڑی میں میں کرتی رہیں اس کو بلاتی رہیں مگر پانی میں کیسے اترتیں؟ وہ ایک آفت زدہ بیوقوف بکری...... وہ تو اپنی بے وقوفی سے پانی میں گھر گئی تھی!

مگر کتوں کی تو بن آئی' چار پانچ کتے پانی میں کود پڑے اور چھپڑ چھپڑ کرتے ہوئے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ سبھی حیرت زدہ رہ گئے۔ ان جانوروں میں جنگلی حکمت عملی کا اتنا بالغ شعور کہاں سے آ گیا؟ کیا انہوں نے آدمیوں سے سیکھا؟ یا آدمیوں نے ان سے سیکھا؟ صورت یہ تھی کہ بکری کسی طرح اس گھیرے کو توڑ دینا چاہ رہی تھی۔ اور کتے غالباً بکری کی یہ خواہش محسوس کر چکے تھے — وہ غالباً یہ بھی سمجھ چکے تھے کہ بکری اپنا دفاع صرف چار پیروں سے کر سکتی ہے' شاید اسی لیے کتوں کا پہلا اور مسلسل حملہ بکری کے پیروں پر تھا۔ کتے مطمئن ہوں گئے کہ اگر بکری کا پیر بیکار ہو گیا تو پھر یہ خود ہی ڈھ جائے گی اور تب اس کے جسم کا کوئی بھی حصہ من مانے ڈھنگ سے نوچا اور کھایا جا سکتا ہے۔

ادھر پانی میں کھڑی بکری بھی شاید اس سازش کو سمجھ چکی تھی اور غالباً اسی لیے وہ پورے وجود سے چھٹپٹا رہی تھی۔ اور چیخ رہی تھی۔ اور کنارے پر جو بکریاں تھیں ان کا عالم یہ تھا کہ وہ چیختے ہوئے چہار دیواری کے چاروں طرف دوڑتیں' ان تین چار بکریوں میں ایک سب سے زیادہ بے چین تھی' وہ بے تابانہ بار بار دیوار پر چڑھ جاتی دیوار کے حدود میں جمع پانی کی طرف جھکتی اور پھر جھک کر بے اختیارانہ پیچھے ہٹ جاتی جیسے سہم گئی ہو...... مگر اس کی چیخ کسی طرح رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

کسی نے بتایا کہ گرنے والی اس کی بیٹی ہے۔

ممتا کے درد اور جان کے عشق کی ایسی کشمکش شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے۔

شور و غل سن کر ارد گرد کے لوگ گھروں سے نکل آئے' مرزا رجب علی' سرور کمال' درشہوار علی خان' برکت اللہ انصاری...... نزدیک آتے ہی درشہوار علی خان کے تو ہوش اڑ گئے۔ ''ارے یہ تو میری بکری ہے' میں نے اسے قربانی کی نیت سے پالا ہے۔ تس پر سبھی تشویش میں مبتلا ہوئے اول تو قربانی کا جانور' جس کے سلسلے میں واقعہ مشہور ہے کہ ایک بڑے بزرگ برہمن نے جانور لے جاتے ہوئے قصاب کو ڈانٹ دیا تھا۔ شرم نہیں آتی؟ قربانی کے جانور کو نالی کا گندا پانی پلاتے ہو؟ اور اس پر درشہوار علی خان کی بکری...... سبزی کے پتوں کی جگہ سبزی کھانے والی...... تنومند' خوب صورت دیکھ کر ہی لالچ آ جائے!

بڑوں کی تشویش بچوں تک پہنچی اور بچے جوش میں کود پڑے مگر تھوڑا ہی آگے بڑھنے پر احساس ہوا کہ وہ پورا خطۂ زمین دلدل بن چکا تھا۔ آگے بڑھتا ہوا ہر قدم زمین میں دھنستا اور پیچھے لوٹنا مشکل ہوتا جاتا' لڑکے کسی طرح باہر نکل آئے مگر کتوں کا حملہ جاری رہا اور بکریاں بے تھاہ ہو کر چیختی

رہیں منظر بہت تکلیف دہ تھا۔ لوگوں نے پھر لڑکوں کی ہمت بڑھائی مگر لڑکے بالکل تھونس چکے تھے بہت ضد کرنے پر ایک لڑکا جھلا کر بولا۔ ارے تو جان بچانے کے لیے تو جان دینا ہوگا۔ مگر اسی وقت درشہوار علی خان نے پچاس روپے انعام کا اعلان کر دیا۔ انعام کے اعلان پر لڑکے گڑبڑا گئے کتوں کا حملہ بکری پر جاری تھا۔ پھر لڑکوں نے طریقۂ کار بدل دیا اب کے وہ کہیں سے لمبے لمبے بانس نلے آئے اور کنارے ہی سے کتوں کو دھمکانا شروع کیا اور ایک نے تو کمال ہی کر دیا' گھر سے غلیل لے آیا اور غلیل سے جو نشانہ لینا شروع کیا تو کتوں کے پاس بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

مگر اب کے تو صورتحال ہی بدلی ہوئی تھی۔ شدید سرد اور قدرے ابر آلود موسم' رات کا وقت' بجلی حسبِ دستور غائب' چاند کی بیسویں یا اکیسویں رات اس لیے چاندنی کی بھی آس نہیں' طاہر علی کیا کرسکتا تھا؟ لڑکوں کو چڑھانے کی کوشش کی۔ ''پچھلی مرتبہ بھی تم لوگوں نے ایک جان بچائی تھی۔ ذرا پھر ہمت کرلو۔

مگر لڑکے صاف جواب دے گئے پچھلی مرتبہ کی بات دوسری تھی بکری کا معاملہ تھا اور دن کا وقت تھا۔''

''وہ بھی قربانی کی بکری تھی۔'' دوسرے نوجوان نے ایک اور نکتہ اٹھایا۔

پھر خاں صاحب نے 50 روپے جو بطور انعام دیئے وہ الگ!'' تیسرے عزیز نے بھی پہلو پیدا کیا۔

طاہر علی کا جی چاہا کہ وہ بھی انعام کا اعلان کر دے......مگر کلاس ٹیچر اتنی فضول خرچی کہاں سے کرے۔

''بیٹا جان تو جان ہے'' ایک بزرگ نے سمجھایا۔

''چچا کتے اور بکری کے درمیان تو فرق کرنا ہوگا۔'' ایک عزیز نے ترکی بہ ترکی جواب دیا' سبھی لاجواب سے ہوگئے اور اس کے رونے کی آواز دل چیرتی رہی کہ اس بیچ بیٹے نے آکر بتایا ......''باس کا فون ہے۔''

کافی رات گئے ڈرائنگ روم خالی ہوا طاہر علی گھر میں آیا' کتے کا پلا دلدل میں گھرا چیختا رہا اسے پھر وہ منظر یاد آیا۔ روشنی تو غائب تھی' کئی ٹارچوں کی روشنی میں دیکھا ہوا بس ایک منظر: منظر انگنت راتوں تک جلتا اور بجھتا رہا' کتے کا پلا دلدل میں پھنسا نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مارتا رہا' اور اس سے کچھ فاصلے پر دو تین کتے بڑی بے چینی سے اچھلتے کودتے اور چیختے رہے کتے اور انسان تو بڑے پرانے دوست ہیں اس لیے دونوں ہی پر ایک دوسرے کے چیخنے چلانے کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ مگر وہ چیخیں تو عجیب تھیں' اسے لگا ان چیخوں میں غصہ' افسوس اور خوف تینوں شامل ہیں' ایک تو بالکل پھٹی پھٹی آواز میں مسلسل چیخے جا رہا تھا۔ اور ادھر کتے کا پلا بار بار نکلنے کی کوشش کرتا اور ہر بار چھپاک سے

پانی میں گر جاتا طاہر علی وہاں پر آدھا گھنٹہ کھڑا رہا اور اتنی دیر تک یہ بے معنی عمل لگاتار جاری رہا۔ کتے چیختے رہے کتے کا پلا ڈوبتا رہا...... اسی بیچ باس کا فون آ گیا پھر لوگ آ گئے' پھر بحث چھڑ گئی......''ایک صالح معاشرے میں سماجی انصاف کا کلیدی نکتہ......''

گئی رات تک وہ منظر جھما کے کرتا رہا: دلدل میں گھرا روتا چیختا بے چارہ پلا...... اور اس سے بھی زیادہ بھیانک آواز میں شور کرتے ہوئے کتے...... کتے اپنی زبان میں کیا کہہ رہے تھے' طاہر علی یہ تو سمجھ نہ سکا مگر ایک بات تو سمجھ میں آ چکی تھی وہ بار بار یاد آتی رہی...... کتے اور بکری کے درمیان تو فرق کرنا ہی ہوگا......'' اور پھر رات گئے تک جو بحث جاری رہی......

سماجی انصاف کی قدر کو عمل میں کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے؟ طاہر علی کے اندر درد' افسوس اور پشیمانی کا ایک جلتا بھبھکتا سورج طلوع ہوا اور اسے لگا وہ دھڑ دھڑ جل رہا ہے۔

اسی عالم میں نہ جانے کب نیند آ گئی' پھر شاید بیچ رات میں طاہر علی کی نیند ٹوٹی تو فوراً ہی اس کا خیال اس بے چارے پلے کی طرف گیا' اس نے آہٹ پر کان لگایا۔ کراہ جاری تھی...... تھکان سے چور وجود کی آخری کراہ...... چاروں طرف سناٹا تھا۔ اور اس سناٹے میں صرف اس کی انتہائی درد اور خوف میں ڈوبی تھکی تھکی بہت مدھم کراہ ابھر رہی تھی...... طاہر علی نے کھڑکی کھول کر دیکھا' چہار دیواری کے اندر پانی کی سطح بالکل ٹھہری ہوئی تھی' کسی حصے پر بھی وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا' شاید گردن تک دلدل میں دھنس چکا تھا۔

اس کے باقی ہم قوم شاید گھنی سرد اور سیاہ رات سے ہار گئے تھے۔

بس رہ رہ کر مغربی کنارے پر پانی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا محسوس ہوتا' اور ایک انتہائی کمزور آواز کا گمان گزرتا......اونہہ......ہ......ہ......اونہہ......ہ......ہ......''

یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ دلدل میں ڈوبتا یہ گریہ کتے کے پلے کا ہے یا انسان کے بچے کا۔

ایک بے چین تصور' ناامیدی کے بھنور میں ہچکولے کھاتی کسی کراہ کا بے پیکر ہیولا سا ابھرتا محسوس ہوتا اور طاہر علی اندازے سے تعین کرتا...... وہاں...... ہاں ہاں...... وہیں سے آواز ابھرتی۔ پھر اس نے ٹارچ جلا کر صحیح جگہ کا احساس کرنا چاہا تو نتیجہ تقریباً یکساں ہی رہا۔

ہر گھر کا دروازہ بند تھا۔ اور وہ چھوٹی سی ننھی سی جان پانی کے بگولوں میں تنہا جل رہی تھی!

گلیوں میں بھونکتے رہنے والے کتے کہیں نہیں تھے...... طاہر علی کو عجب سا احساس ہوا۔ کیا انہیں اس کی موت کا یقین ہو چکا تھا؟ یا وہ خود خاموش رہ کر مرنے والے کی موت آسان بنا رہے تھے؟

طاہر علی بستر پر نہیں سوالات اور اضطراب کی سیج پر تھا اور صحرا کی جلتی ریت پر پڑے مٹر کے دانے کی طرح جل رہا تھا...... وہ رات بھر جلتا رہا اور کتے کا پلا رات بھر پانی میں بھیگتا رہا' ابھرتا

رہا ڈوبتا رہا چیختا رہا کراہتا رہا...... پھر جیسے جیسے رات گزرتی گئی اس کی کراہ بھی کمزور پڑتی گئی' صرف کراہنے کا ہلکا ہلکا سا احساس باقی رہ گیا' عجب سی' انتہائی درد اور بے بسی میں گھری کراہ......!

طاہر علی کو دوبارہ نیند آنے تک وہ کراہ سنائی دیتی رہی ...... آہستہ آہستہ مدھم اور معدوم ہوتی ہوئی...... وقت کے بھیانک صحرائی طوفان میں' بگولوں کے بھنور میں گھری' سیلاب کے تھپیڑوں کا نشانہ ہچکولے کھاتی ہوئی ڈوبتی ہوئی مرتی ہوئی......ایک بے بس وجود کا SOS!

صبح کو بچوں نے بتایا کہ کتے کا پلا ٹھنڈے پانی میں ڈبکیاں کھا کھا کر مر گیا۔

کسی کو اس کی موت کا افسوس نہیں تھا۔ صرف طاہر علی کو بہت دنوں تک سماجی انصاف کا کلیدی نکتہ یاد آتا رہا' اور کتے کے پلے کی چیخ سنائی دیتی رہی!!

❁ ❁ ❁

شوکت حیات

گھڑیال

اُس روز دفتر بند تھا۔
چھٹی کے دنوں میں بھی عام طور پر اسے فرصت نہیں ملتی تھی۔
بیوی نے صبح ہی صبح اسے سختی سے تاکید کردی تھی۔
''آج سارے دن گھر پر رہنا ہے۔ کسی باہری آدمی سے ملنا ملانا نہیں ہے۔ آخر میرا بھی تم پر کچھ حق ہے!''

دفتر میں چھٹیاں تو برابر ہوتیں۔ اتوار بھی آکر گزرتا۔ لیکن سمیع صاحب کو فرصت کہاں نصیب۔ یونین کی میٹنگ، محلے اور شہر کی مختلف فلاحی کمیٹیوں کی سرگرمیاں؟ ملنے جلنے والوں کی بھیڑ، لوگوں کے طرح طرح کے مسائل کے حل ڈھونڈنا: یہی ان کی زندگی تھی۔

موجودہ سماجی ڈھانچے میں بھلا مسائل بھی کہیں حل ہوتے ہیں۔ عارضی طور پر ایک سے فرصت ملتی ہے تو دوسرا اپنا جبڑا پھیلائے سامنے آکر کھڑا ہوجاتا ہے۔ کسی کے سالانہ انکریمنٹ کا سوال کسی کے بونس کا بقایا کوئی معطل ہوا تو اس کی بحالی کا معاملہ، سب جانتے تھے کہ سمیع صاحب کے پاس کوئی جادو کی چھڑی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہی کریں گے کہ یونین کی میٹنگ میں ان مطالبات کو ایجنڈے میں لاکر منظور کرائیں گے۔ مینجمنٹ سے بات کریں گے۔ اسٹاف میں کسی جلتے ہوئے سوال کو لے کر بے چینی ہوتی تو اس پر جدوجہد اور علامتی ہڑتال کی نوبت آجاتی تھی۔

لیکن سمیع صاحب کے سامنے اپنا دکھڑا رونے کے بعد مصیبت زدہ لوگوں کے دل کا بوجھ ضرور ہلکا ہوجاتا تھا۔

بیوی کو غصہ آتا کہ دفتری مصروفیات کے بعد گھر پر بھی مختلف بکھیڑوں کے دفتر۔ آپ میاں منگتے باہر کھڑے درویش۔ خود اپنا مسئلہ تو حل نہیں ہوتا۔ چلے ہیں دوسروں کا دکھ دور کرنے۔
بیوی نے پرانی ساڑی کے آنچل سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا:
''بہت دن ہوگئے ہیں جی، تم سے جی بھر کر بات کیے ہوئے...... دیررات میں آتے ہو تو اتنے تھکے ماندے ہوتے ہو کہ بستر پر گرتے ہی سو جاتے ہو...... آج میں تمہارے تمام ملنے والوں

سے تمہارے گھر میں رہتے ہوئے بہانہ بنا دوں گی...... حد ہوتی ہے ہر چیز کی!''

''سنو سعیدہ ...... بات یہ ہے کہ دوسروں کی' تمام لوگوں کی زندگی بدلے بغیر اپنا کچھ بدلنے والا نہیں ...... کیا تمہیں خوشی نہیں ہوتی کہ تمہارا شوہر اپنی زندگی دوسروں کے لیے اور اس طرح اپنے لیے بھی قربان کر رہا ہے......!''

''مجھے اِدھر اُدھر کی باتوں سے کوئی مطلب نہیں ...... میں بس اتنا جانتی ہوں کہ آج تمہیں گھر پر رہنا ہے...... میرا نہیں تو کم سے کم اپنے بیٹے کا خیال کرو...... کیا وہ تمہاری توجہ کا مستحق نہیں؟''

بیوی اپنی ضد پر قائم رہی۔

سمیع صاحب بیوی کی طرف دیکھتے دیکھتے دس سال پیچھے چلے گئے۔ بجھی بجھی اُداس آنکھوں کی جگہ پر اُمید اور اُمنگ بھری آنکھیں زندگی میں کتنی رونق تھی ان دنوں۔ ساری کائنات اشاروں پر ناچتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ پیڑ' پودے' آبشار...... سب کے سب اپنی طرف کھینچتے تھے۔ قدرت کے رنگین نظاروں میں انہوں نے دھوپ کی تمازت کو کبھی محسوس ہی نہیں کیا۔ روکھی روٹی بھی شریانوں میں خون کا چڑھتا دریا بن جاتی تھی۔

لیکن آج — آج سب کچھ سیاہ بادلوں میں کھو گیا۔ حالات کی سنگینی اور سختی کی اصلی وجہ ان کی سمجھ میں آئی تو یونین اور پارٹی کے ساتھ انہوں نے رشتہ جوڑ لیا۔ اب تو اپنی کوئی سدھ بدھ ہی نہ تھی — ایک ایک کر کے دن گزرتے گئے۔ سمیع صاحب دھیرے دھیرے بیوی' بچے اور اپنے آپ سے بیگانہ ہوتے گئے۔ یہ سب کیسے ہوا' کچھ پتا بھی نہ چلا۔ ایک طویل اور تھکا دینے والا سفر جس کے کسی پڑاؤ پر شاید کبھی گم ہوتے ہوئے پیڑ' پودے' آبشار' سب کے سب انتظار کرتے ہوئے ملیں۔

آؤ سمیع ...... ہم بھی تمہارے منتظر ہیں...... ہم میں بھی زندگی کی معنویت ڈھونڈو......!

آؤ سمیع ...... ہمیں پہچانو...... ہمیں گلے لگاؤ......! ہم میں کھو جاؤ......!!!

بیوی کی آنکھوں سے نگاہیں ہٹیں تو ہاتھوں پر ٹک گئیں۔ نرم' ملائم' سڈول اور چکنے ہاتھ کیسے لاغر اور کھردرے ہو گئے تھے۔ انہوں نے بیوی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ بیوی نئی نویلی دلہن کی طرح شرمانے لگی اور سر پر آنچل درست کرنے لگی۔

''اے جی...... ہٹو...... اماں گھر میں ہیں...... تمہیں شرم نہیں آتی......!؟''

سمیع صاحب کو لگا کہ کسی پرانی حویلی کا مقفل دروازہ چرمرا کر کھلا اور تازہ ہوا کے جھونکے اندر آ گئے۔

میں کہاں کھو گیا تھا سعیدہ ......؟ تم کہاں گم ہو گئی تھیں ......؟؟ ہم دونوں کب بچھڑ گئے تھے......؟؟؟

سمیع صاحب کی آنکھوں میں خمار چھانے لگا۔ آواز ڈوبنے لگی۔ بیوی انہیں ایسی نظروں

سے دیکھنے لگی جیسے برسوں بعد مل رہی ہو...... پہچاننے کی کوشش کررہی ہو۔ وہ بیوی کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے مدتوں بعد نظر پڑی ہو پوری زندگی میں پہلی بار۔

کسی نے دروازے پر دستک دی۔

انہیں کچھ سنائی نہ دیا۔ ایک دوسرے میں ایسے ہی ڈوبے رہے۔۔۔ ناؤ لہروں پر ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھتی رہی دور کوئی گھڑیال پانی کے اندر ڈبکی لگاتے ہوئے تیر رہا تھا۔۔۔ دریا کی روانی اپنے پورے جوش پر پہنچی بھی نہیں تھی کہ دستک دینے والے کے زور زور سے چلانے کی آواز نے ان کی ساری محویت درہم برہم کردی۔ بیوی نے آنچل درست کرتے ہوئے دروازے کے قریب آ کر کہا:

''منے کے ابا نہیں ہیں!''

''بھابی دروازہ کھولئے ...... بھیا جیسے ہی آئیں یہ کاغذ انہیں دے دیجئے گا...... بہت ضروری میٹنگ ہے......جلوس نکالنے کے سلسلے میں فیصلہ کرنا ہے......!''

سمیع صاحب چاہتے ہی رہ گئے کہ آنے والے سے تفصیل پوچھیں۔ لیکن بیوی مسکراتے ہوئے ان کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی۔

''چلو جی...... آج میں کہہ چکی ہوں کہ سارا وقت ہمارے لیے ہے...... روز چلتا ہی رہتا ہے دوسروں کا چکر......!''

''سعیدہ! تم سمجھتی نہیں ہو...... حالات کے بے رحم شکنجے سے نجات کے لیے اپنی طرح کے ستم رسیدہ لوگوں کا ساتھ لینا اور دینا بے حد ضروری ہے...... کچھ ایسا کرنا ہے کہ وہ شکنجہ ٹوٹ جائے جو ہم سب کو ایک ایک کر کے جکڑتا اور توڑتا چلا جا رہا ہے......!''

''بس......بس ...... یہ بھاشن رکھو دوسروں کے لیے ...... کتنی بار کہوں کہ میں تمہاری بیوی ہوں...... مجھے تو بس......''

وہ شوہر کی طرف لپکی ۔۔۔ ان لمحوں کے سحر نے اس پر ازخود رفتگی کی عجیب کیفیت طاری کردی تھی۔ منا سوتے سے اُٹھ کر رونے لگا۔ سعیدہ نے لیٹے ہی لیٹے اسے تھپکی دے کر سلانا چاہا لیکن اس کی نیند پورے طور پر ٹوٹ چکی تھی۔ وہ زور زور سے چیخنے لگا۔ برآمدے سے اماں کی آوازیں آنے لگیں۔

''بہو...... بہو...... بچے کا کچھ دھیان نہیں......!''

ناچار اپنے جذبات کا گلا گھونٹ کر سعیدہ نے اُسے چپ کرانے کی کوشش کی کسی بھی طرح بچہ خاموش نہ ہوا تو سعیدہ نے جھنجھلاہٹ میں اسے شوہر کی گود میں رکھ دیا۔ سمیع صاحب نے بڑی مشکل سے اپنے آپ پر قابو پایا۔ اچانک انہیں اس سچویشن پر ہنسی آ گئی۔

''ارے بیٹے...... پیارے بیٹے......تم روتے ہو......ہنسو بیٹے......قہقہے لگاؤ......!''

سمیع صاحب نے قہقہہ لگانا شروع کیا۔ بچہ ان کا زور دار قہقہہ سن کر اور زور سے رونے لگا۔ بیوی نے انہیں ٹوکا۔

دوسروں کا دُکھ دُور کرنے میں لگے رہتے ہو......اپنے روتے ہوئے بچے کو چپ نہیں کرا سکتے......!

سمیع صاحب نے اپنے قہقہے کی اونچائی کم کی۔ بچے کو ہوا میں اچھالا۔ منا چپ ہوگیا۔ اب انہوں نے سنبھل سنبھل کر قہقہہ لگانا شروع کیا۔ منے نے بھی ان کی نقل شروع کردی۔ کچھ ہی دیر میں باپ اور بیٹے دونوں قہقہے لگا رہے تھے۔

بیوی نے یہ منظر دیکھا تو نہال ہوگئی۔ ایسے مواقع کم آتے تھے جب باپ بیٹے دونوں ایک ساتھ ہنستے ہوں۔ وہ اپنا سارا دُکھ' ساری پیاس بھول گئی۔ لیکن لگاتار قہقہے لگاتے دیکھ کر چڑتے ہوئے بولی۔''اے جی......تم خود کھوکھلے قہقہے لگا رہے ہو اور بیٹے کو بھی یہی سکھا رہے ہو!''

سمیع صاحب نے قہقہہ لگانا بند کردیا۔ کچھ دیر گم صم رہے۔ بیوی کی طرف غور سے دیکھا آنکھوں سے گہری اُداسی جھانک رہی تھی۔

''سعیدہ......تم سمجھتی کیوں نہیں...... خالص قہقہوں کے دن لد گئے...... آنے والے زمانے میں کھوکھلا قہقہہ لگائے بغیر جینا مشکل ہوجائے گا......ابھی سے منے کو پریکٹس کرا رہا ہوں تاکہ وہ اس عہد کا ساتھ دے سکے!''

سمیع صاحب نے بیوی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے قہقہہ لگایا۔ بیٹے نے بھی ساتھ دیا۔

بیوی کچھ دیر تک اپنے شوہر اور بیٹے کو غور سے دیکھتی رہی۔ پھر اچانک بولی:

''اے جی تم ہنستے ہوئے رو کیوں رہے ہو؟''

سمیع صاحب کا چہرہ کچھ عجیب ہوگیا۔ جیسے کسی نے چوری پکڑ لی ہو۔ قہقہے نکل رہے تھے اور آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ بیوی کے سوال کا کوئی جواب ان سے بن نہیں پڑ رہا تھا۔

بیٹا بھی ہنس رہا تھا لیکن باپ کی طرف دیکھتے ہوئے ہنسنے کے ساتھ ساتھ مکا ہوا میں لہرا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھیں بھی ہنس رہی تھیں۔

بیوی نے پیار سے بیٹے کا گال چوم لیا۔ میلی ساڑی کے پلو سے اپنی آنکھیں پونچھنے لگی۔

کچھ دوری پر دریا رواں تھا۔ متلاطم لہروں پر ایک ناؤ ڈانواڈول ہورہی تھی۔ بہت سارے گھڑیال پانی کی سطح پر اپنی گردنیں نکالے' آنکھیں بند کیے اس طرح تیر رہے تھے جیسے ایک جگہ ٹھہرے ہوئے ہوں۔

❁ ❁ ❁

عبدالصمد

دوسری حکومت

دفتر پہنچتے ہی جب اخبار میں، میں نے یہ پڑھا کہ سرکار نے اشیاء ضروری کے دام طے کر دیئے ہیں اور اب چور بازاری یا مہنگائی کی کوئی گنجائش یا شکایت نہ رہے گی، تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کسی کام میں بھی جی نہیں لگنے لگا۔ جلد سے جلد بازار پہنچ کر اپنے خوابوں کی حسین تعبیر اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا چاہتا تھا اور پھر گھر پہنچ کر بیوی کو خوابوں کی اُن حسین وادیوں میں لے جاتا جس کے لیے ایک عرصہ سے میں کوشاں تھا اور جس کے لیے جنم جنم سے وہ ترس رہی تھی۔

لیکن دیکھ کر مجھے سخت حیرت اور افسوس ہوا کہ یہ خبریں پڑھ کر صرف میں ہی خوش تھا۔ دفتر میں لوگوں نے ان خبروں کو اس طرح پڑھا تھا جیسے انہوں نے محض یہ پڑھ لیا ہو کہ رات چلتی پھرتی سڑکوں پر کتنوں کو لوٹ لیا گیا اور کتنوں کو زخمی کیا گیا وغیرہ وغیرہ — شاید یہ خبریں بھی لوگ اس لیے پڑھتے تھے کہ شاید اُن میں کسی جان پہچان والے کا نام نکل آئے اور اگر اتفاقاً کسی کا نام شائع ہو ہی گیا ہو تو پھر دیکھئے ان کی خوشی۔

اپنے آپ کو یہ سمجھ کر شاید ان لوگوں کی نظریں ان خبروں پر نہیں پڑی ہیں ورنہ اپنے آپ سے ایسی بے تعلقی کیسے ہوسکتی ہے۔ میں نے لال روشنائی سے ان خبروں کو گھیر دیا۔ اور پھر خود ہی اخبار لے کر سارے دفتر میں گھوم گیا اور تب یہ ہوا کہ میری حیرت اور افسوس میں صرف اضافہ ہی ہوا۔ کچھ لوگوں نے میری طرف دیکھا جیسے میں پاگل ہوگیا ہوں اور اپنے ہوش وحواس کھو کر ان کے پاس آیا ہوں۔ کچھ لوگوں کی نگاہوں میں تمسخر تھا، کچھ لوگوں کی نگاہوں میں میرے لیے افسوس اور ترس کے جذبات تھے اور کچھ نے اسے میری عادت سمجھ کر ایک کان سے سنا، دوسرے سے اڑا دیا—

جی ہاں — عادت، جس کی وجہ سے دوستوں میں نکونبتا ہوں، اپنے پرائے میں رسوا ہوں۔

لوگ مجھے دیکھ کر کترانے لگتے ہیں، سیدھی طرف آرہے ہوں تو ادھر ادھر راستہ ڈھونڈتے ہیں، ادھر ادھر چل رہے ہوں تو سیدھا راستہ اختیار کرتے ہیں اور اگر اتفاق سے کوئی راستہ نہ ملا، کوئی چارۂ کار نہ رہا تو اپنی ذات میں مصروف ومگن ہو کر اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔ میں مسکراتا ہوا انہیں دیکھتا رہتا ہوں، اور کر بھی کیا سکتا ہوں، اپنی عادت تو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں انہیں ا... حال پر

توجہ دلانا چاہتا ہوں لیکن ان کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ وہ بس روٹی کمانے کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ انہیں اس کا بھی ہوش نہیں کہ ان کو اپنی محنت کا پورا پورا معاوضہ بھی مل رہا ہے یا نہیں' بس بے زبان بھیڑوں کی طرح ہنکے جا رہے ہیں' دائیں ہانک دیا گیا تو دائیں' اور بائیں ہانک دیا گیا تو بائیں— ان لوگوں کو یہ سوچنے کی اک ذرا فرصت نہیں کہ ایسا ہوا تو کیوں ہوا' ویسا ہوا تو کیوں ہوا۔ وہ ہواؤں سے اپنی سانس لیتے ہیں لیکن انہیں ہوا کے رُخ کا بھی پتہ نہیں' ایسی لاعلمی' ایسی لاتعلقی— انہیں دھیان دلانے کی کوشش کرو کہ چونکہ تم ہواؤں سے سانس لیتے ہو اس لیے ہواؤں کا رخ بھی جانو۔ تم بے زبان بھیڑ نہیں ہو کہ جدھر چاہے ہانک دیے جاؤ' تم تمام فیصلوں اور اقدام کے برابر کے حقدار اور شریک ہو' تو الٹا میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ اس حکومت کو اپنی حکومت نہیں سمجھتے جسے انہوں نے اپنی رائے استعمال کر کے اپنے اوپر لاگو کیا ہے' وہ تو اپنے آپ کو اس حکومت کی رعایا سمجھتے ہیں جو بازاروں میں قائم و دائم ہے' جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی لیکن جس کے وجود پر لوگوں نے مکمل ایمان لایا ہوا ہے۔ نظر آنے والی حکومت کو تو وہ ایک Decoration Piece سمجھتے ہیں—

ایک بچاری بیوی ہی ہے جس سے جی بھر کر دنیا کے مسائل پر گفتگو کرتا ہوں' قومی اور بین الاقوامی حالات پر غور و خوض— اور وہ میری خاطر ہی سہی' تمام خبروں اور مسئلوں میں پوری دلچسپی لیتی ہے اور اپنی بساط بھر تمام معاملوں میں اپنی ایک رائے رکھتی ہے۔ چنانچہ میں نے جلدی جلدی دفتر کو نمٹایا اور بازار کو ہوتا ہوا گھر کو چلا۔ بازار حسب معمول تھا۔ کہیں پر بھی کوئی ایسی بات دکھائی نہیں دے رہی تھی جس سے معلوم ہو کہ آج صبح اخبار شائع ہوا ہے اور لوگوں میں تقسیم بھی ہوا ہے' لیکن لوگوں کی عادت سے واقف ہونے کی وجہ سے تعجب نہ کر کے چپ رہا۔ جیب میں کچھ پیسے تھے' کچھ ایسی چیزوں کے دام' جن کے نام اخبار میں شائع ہوئے تھے' دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شاید دکاندار نے اخبار کا نام بھی نہیں سنا ہے۔ میں نے اس کی لاعلمی پر افسوس کرتے ہوئے اُسے اطلاع دی کہ سرکار نے چیزوں کے دام طے کر دیئے ہیں اور وہ جو قیمت بتا رہا ہے وہ غلط ہے۔ اُس نے مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو' جواب یہ دیا کہ اسے اخباروں میں چھپی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ تو بس یہ جانتا ہے کہ جس کو ضرورت ہوگی وہ اسے اسی دام میں لے جائے گا۔ اب میں اس سے کیا کہتا لیکن شاید تمام دکانداروں نے آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ جو ایک بولے گا' وہ سب بولیں گے۔ تھک ہار کر میں نے گھر کی راہ لی کہ کم از کم بیوی کو تو یہ خوشخبری سنا دوں' کیونکہ یہ بات تو میں اچھی طرح جانتا تھا کہ بچاری سرکار کو اس کی خبر نہیں کہ بازاروں میں کیا ہو رہا ہے ورنہ ......لیکن بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منا سکتی ہے۔

گھر پہنچا تو سب سے پہلے بیوی سے محبت بھری باتیں کیں' اپنی محبت اور وفا کا اسے یقین دلایا' اس کے عشق میں آگ کے دریا میں ڈوب جانے کی بات کی' اس کی گھنیری زلفوں' سیب جیسے

گال، شہد بھرے ہونٹ، صراحی دار گردن اور سروقد کی تعریف کی۔ اُس نے میری تمام باتوں کا صدق دل سے اس طرح یقین کیا جیسے میری باتیں اُس پر وحی بن کر اُتری ہوں۔ پھر میں نے اُسے وہ مژدہ سنایا— بیوی کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ جس نے میرے اندر آگ لگا دی۔ اُس کی یہ بے یقینی مجھے توڑ کر رکھ دیتی اگر میں اپنے آپ کو فوراً سنبھال نہیں لیتا— ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے، ہر کسی کے پاس جادو کی چھڑی نہیں ہوتی کہ ہوا میں گھمایا اور مقصد حاضر، اور نہ ہر کسی کے پاس الہ دین کا چراغ ہوتا ہے کہ دیو ہر خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہے۔ میں نے دل ہی دل میں بیوی کی معصومیت پر افسوس اور اس کی عقل پر ترس کھا کے سوچا کہ اب کچھ بولنا لاحاصل ہے، جب میری باتیں سچ ثابت ہوں گی تو پھر خود ہی ان لوگوں کو عقل آئے گی، بھلا اخبار میں چھپی باتیں غلط کیسے ہو سکتی ہیں اور سرکار جھوٹ کیسے بول سکتی ہے۔

اخباروں میں یہ خبریں صرف ایک دن چھپ کر نہیں رہ گئیں بلکہ کئی روز تک اس قسم کی باتیں شائع ہوتی رہیں اور ان پر خوب گرما گرم بحث رہی۔ لوگوں کی بے تعلقی برقرار تھی کیونکہ وہ تو اپنے آپ کو دوسری حکومت کی رعایا تسلیم کیے بیٹھے تھے۔ میرے لیے یہ خبریں اور بحثیں مسرت کا باعث تھیں کہ ان سے میری اس حکومت پر اعتماد اور یقین پختہ ہو رہے تھے جسے میں تسلیم کرتا تھا۔ میں دل ہی دل میں لوگوں کی بے حسی اور بے وقوفی پر ماتم کرتا اور مجھے ہنسی بھی آتی کہ جب میرا یقین سچ ثابت ہوگا تو ان پر کیا گزرے گی۔ میں جب بھی بازار جاتا تو بیوی کے کانوں میں یہ بات ضرور ڈال کر جاتا کہ آج جب میں لوٹوں گا تو وہ میری جیب کا کرشمہ دیکھے گی جسے اس نے اب تک ہلکی ہی ہوتی دیکھی ہے لیکن پتہ نہیں سرکار کو اس کی وہ مسکراہٹ پسند تھی یا بازار والوں کو میری ضد تھی کہ ہزار کج بحثی، ہزار سمجھانے بجھانے، ہزار یقین دلانے اور ہزار کوشش کرنے پر بھی جیب کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اور بیوی کی وہ مسکراہٹ برقرار رہی تو میں نے تھک ہار کر اُمید ہی چھوڑ دی اور دل کو سمجھا لیا کہ شاید کوئی مصلحت ہوگی یا پھر کوئی ایسی بات ہوگی جسے ظاہر کرنا عوامی مفاد میں نہیں ہوگا لیکن یہ میں نے طے کر لیا تھا کہ حکومت میں ایسی سرکار کی تسلیم کروں گا جسے میں نے اپنی رائے سے اپنے اوپر لاگو کیا تھا، اُس سرکار کی ہرگز نہیں جسے کسی نے اپنی رائے نہیں دی تھی لیکن پھر بھی جس کی حکومت قائم تھی اور جس کی طاقت میں روز بہ روز اضافہ ہی ہو رہا تھا۔

اُس دن میں نے نکڑ کے حلوائی کی دکان پر وزیرِ خزانہ کی بجٹ تقریر سنی، پوری قومی معیشت کا نقشہ سامنے تھا۔ قیمتوں کی لگامیں کہیں سے کس دی گئی تھیں، کہیں سے ڈھیلی کر دی گئی تھیں۔ دکان پر بھیڑ تو تھی اور لوگ بجٹ سن بھی رہے تھے لیکن اس طرح جیسے صبح کا اخبار پڑھتے ہیں کیونکہ بے یقینی کے زہر نے کسی میں بھی جان باقی نہیں رکھی تھی۔ میں جلدی جلدی قدم بڑھاتا ہوا گھر کی طرف چلا کہ بیوی کو بجٹ کی خبر سنا دوں اور پھر دیکھوں کہ ہماری پلیٹوں میں کیا اضافہ ہونے جا رہا ہے اور کیا کمی

— گھر میں قدم رکھا ہی تھا کہ بیوی کے حواس باختہ چہرے پر نظر پڑی حالانکہ اُس وقت اس کے تازہ دم اور خوبصورت نظر آنے کی کوشش کرنے کا وقت تھا۔ میں نے بھی نظرانداز کر کے اُسے مخاطب کیا۔

''ارے سنو— نیا بجٹ......'' وہ بات کاٹتی ہوئی بولی۔

''چھوڑو بھی — منّا کی طبیعت صبح سے بہت خراب ہے' کئی الٹیاں ہو چکی ہیں' اس وقت ایک سو دو ڈگری بخار ہے' اول فول بک رہا ہے' بے ہوشی کی کیفیت ہے۔''

یہ سنتے ہی میرے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ میرے اور بیوی کے درمیان کی مضبوط کڑی میں ایک منّا تھا۔ ہماری آنکھوں کا تارا— ہمارے ستون واطمینان کا گہوارہ— میں نے جلدی سے منّا کے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور جیسے میرا کلیجہ جل اٹھا۔ منّا بخار میں پھنک رہا تھا۔ میں سر پٹ ڈاکٹر کے ہاں بھاگا۔ اس کے ہاں مریضوں کی بھیڑ تھی۔ میں نے ڈاکٹر کے پیر پکڑ لیے اور جب ڈاکٹر کو لے کر میں گھر پہنچا تو بیوی کی آنکھوں میں اُمید کے دیے بجھ چکے تھے اور منّا' یا تو سو گیا تھا یا بے ہوش ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے ہر طرح کی جانچ کے بعد خبر دی: ''یہ تو ملاوٹ کا کیس ہے!''

''لیکن ڈاکٹر— ہمارے ہاں تو اس کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ ملاوٹی چیزیں استعمال نہ ہوں۔''

''یہ آپ یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ آجکل تو ہوا بھی خالص نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے گویا میرا تمسخر اڑایا۔ اُس نے ایک انجکشن لگایا' دو تین گولیاں لکھیں' ایک دو مکسچر لکھے اور چلا گیا۔ دواؤں نے منّا کی حالت اور بگاڑ دی اور اس کی آنکھوں سے زندگی جانے لگی۔ میں پھر ڈاکٹر کے پاس بھاگا۔ اب کی ڈاکٹر آیا تو سب سے پہلے اُس نے دواؤں کو دیکھا اور بولا:

اے صاحب— یہ تو نقلی دوائیں ہیں— یہ تو زہر ہیں زہر— انہیں پھینک دیجئے اور اب میں اپنے پاس سے دوائیں دیتا ہوں۔''

ڈاکٹر کی دواؤں نے فائدہ کیا اور دوسری صبح منّا مسکرانے لگا۔ زندگی جاتے جاتے لوٹ آئی تھی۔ میں نے اطمینان کی سانس لی اور اب مجھے بجٹ کا خیال آیا تب تک بجٹ ہمارے گھروں میں لاگو ہو چکا تھا اور اس پر تبادلہ ٔخیال کرنے کے مواقع بھاگ دوڑ اور پریشانیوں میں ختم ہو چکے تھے۔

بیوی نے کہا: ''اب تو مان جاؤ کہ اب تک تم غلط کہتے' سوچتے اور یقین کرتے آئے ہو۔''

میں نے کہا: ''کیسے مان لوں؟ دنیا اگر غلط کرتی ہے تو میں کیوں کروں— ؟''

اُس نے کہا: ''تم مانو یا مانو— کوئی مانے نہ مانے لیکن یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ دوسری حکومت قائم ہے اور پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن میں اپنی آنکھوں میں بے یقینی اب بھی محسوس کر رہا تھا—

سید محمد اشرف

آدمی

کھڑکی کے نیچے انہیں گزرتا ہوا دیکھتا رہا۔ پھر یکا یک کھڑکی زور سے بند کی۔ مڑکر پنکھے کا بٹن آن کیا۔ پھر پنکھے کا بٹن آف کیا۔ میز کے پاس کرسی پہ ٹک کر دھیمے سے بولا۔

''آج تو کل سے بھی زیادہ ہیں۔ روز بڑھتے جارہے ہیں۔''

سرفراز نے ہتھیلیوں پر سے سر اٹھایا اور انوار کو دیکھا۔ ''تم نے تو دو ہی دن دیکھا ہے نا! میں تو بہت دن سے دیکھ رہا ہوں۔ کھڑکی بند رکھوں تو گھٹن ہوتی ہے کھول دوں تو دل سے اور زیادہ گھبراتا ہے۔ لگتا ہے جیسے سب ادھر ہی آرہے ہوں۔'' سرفراز چپ ہوگیا۔

پھر ایک لمحے کے بعد بولا:

''آج تم سے اتنے برسوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی تو دل کتنا خوش تھا کہ پھر یہ لوگ ......''

میں نے تمہیں سفر کا واقعہ بھی تو بتایا تھا۔ میں بھی صرف دو ہی دن سے تھوڑے ہی دیکھ رہا ہوں۔ ادھر گاؤں میں بھی آج کل یہی عالم ہے۔ کچھ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کیا ہوگا۔''

سرفراز نے چاہت بھری نظروں سے اپنے بچپن کے ساتھی انوار کو دیکھا جس سے آج پندرہ سال بعد ملاقات ہوئی تھی۔

دونوں کی بہت ساری یادیں ایک سی تھیں۔

جب وہ بہت چھوٹا سا تھا تبھی اپنے خالو کے گھر پر پڑھنے بھیج دیا گیا تھا۔ خالو کا گھر ایک بڑے دیہات میں تھا جہاں سے دو میل کے فاصلے پر بسے قصبے میں انٹر کالج تھا۔ وہیں پہلے ہی دن ایک ہم عمر لڑکے نے بہت بے تکلفی کے ساتھ اس کی ربڑ لے کر اپنی آرٹ کی کاپی پر غبارے نما پھول مٹا کر ایک لیمپ نما بطخ بنا کر اس کی ربڑ واپس کردی تھی۔ حاضری کے وقت اس کا نام ہوا تھا۔

''سید انور علی'' ''حاضر جناب''

سرفرار دھیرے سے بولا۔

''سید انوار علی''

''حاضر جناب۔ تمہیں اسکول یاد آ رہا ہوگا۔''

''ہاں۔ تمہیں کیسے معلوم؟''

''یار تم اب بھی پہلے کی طرح گھامڑ باتیں کرتے ہو۔ میرا پورا نام حاضری کے وقت ڈرائنگ ماسٹر صاحب کے علاوہ اور کون جانتا تھا؟''

سرفراز یہ سن کر مسکرایا حالانکہ گھامڑ والا جملہ اسے برا لگا تھا لیکن وہ سوچ کر مطمئن ہو گیا کہ آج میں افسر کی اونچی کرسی پہ بیٹھا ہوں۔ میرا بچپن کا یہ دوست پرائمری اسکول میں اردو ٹیچر ہے۔ اپنے احساسِ کمتری پہ قابو پانے کے لیے اسے ایسے ہی جملے بولنے چاہیے۔

پھر اس نے سوچا انوار ہی تو اسے اسکول سے واپسی پر حوصلہ دیتا تھا ورنہ قصبے سے دیہات تک پھیلے جنگل' سنسان باغوں اور خاموش کھیتوں میں ہو کر گزرنے میں اس کی روح آدھی رہ جاتی تھی۔ سرفراز نے سر کرسی کی پشت سے لگایا اور آنکھیں بند کر لیں اور بچپن کی اس دہشت کو یاد کیا اور اس یاد میں مزہ محسوس کیا۔

جاڑوں کے شروع میں چار بجے اسکول کی آخری گھنٹی بجتی۔ سب کے سب غل غپاڑہ کرتے تیزی سے نکلتے اور مست چال سے' بستے کندھے پہ ڈالے اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو جاتے۔ سرفراز کے دیہات کا کوئی بھی لڑکا کالج پڑھنے نہیں آتا تھا۔ وہ راستے کی دہشت کے خیال سے سہا سہا' دھیرے دھیرے قدموں سے کالج کے گیٹ سے باہر نکلتا۔ انوار کبھی اس کے ساتھ ہوتا کبھی نہیں ہوتا۔ جب ہوتا تھا تو تالاب تک چھوڑنے ضرور آتا تھا۔ تالاب سے آگے وہ بھی نہیں بڑھتا تھا کیونکہ تالاب کے بعد سڑک مڑ گئی تھی اور موڑ کے بعد پیچھے دیکھنے پہ قصبہ غائب ہو جاتا تھا۔ رخصت ہوتے وقت وہ اس کی ہمت بڑھاتا تھا۔

''تم ڈرنا مت سرفراز۔ نہر کی پٹڑی پار کرو گے تو باغ میں داخل ہونے پر کوئی نہ کوئی آدمی مل ہی جائے گا۔''

سرفراز اس کی طرف بے بس نظروں سے دیکھتا اور اس خیال سے کہ انوار پر اس کا ڈر ظاہر نہ ہو' چہرے پہ بہادری کے تیور سجا کر جواب دیتا۔

''نہیں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ باغ میں کبھی کبھی آدمی مل جاتا ہے تو ذرا اطمینان رہتا ہے اور نہیں ملتا ہے تب بھی میں گھبراتا نہیں ہوں۔'' یہ کہہ کر دیہات کی طرف چل پڑتا۔ دونوں پیچھے مڑ کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے۔ سرفراز انوار کے اوجھل ہوتے ہی گردن کے تعویذ کو چھو کر محسوس کرتا اور جلدی جلدی آیۃ الکرسی پڑھنے لگتا۔ نہر کی پٹڑی پر مڑنے سے پہلے وہ چاروں قل پڑھ کر اپنے سینے پر پھونکتا اور پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا باغ کی طرف بڑھنے لگتا۔ یہ غروب کا وقت ہوتا تھا۔ سردیوں میں شامیں جلدی آ جاتی تھیں۔ نہر کی پٹڑی پر مڑنے سے پہلے کچی سڑک پر اکادکا

آدمی سائیکل پہ آتے جاتے مل جاتے یا گھنٹیاں بجاتی بیل گاڑیاں گزرتیں تو اسے تقویت کا احساس رہتا لیکن پٹڑی پہ مڑتے ہی بالکل سناٹا ہوجاتا تھا۔ اوپر شیشم کے درخت پہ بیٹھا کوئی گدھ شاخ بدلتا پر کھول کر برابر کرتا تو وہ آواز اس سناٹے کو اور ڈراؤنا بنا دیتی۔ اور یہی وہ وقت ہوتا تھا جب وہ آیتہ الکرسی بھول جاتا تھا۔ وہ قل ہواللہ پڑھنا شروع کردیتا۔ اسی درمیان تیزی سے اول کلمہ طیب بھی پڑھ لیتا۔

اور اب سامنے باغ آتا۔ آموں کا بوڑھا باغ۔ ڈوبتے سورج کی زرد روشنی میں کہرے میں لپٹا باغ جس کے اندر دوپہر کے وقت بھی سورج ڈوبنے والے وقت جیسا اندھیرا ہوتا تھا۔ کیونکہ ایک دن اتوار کو اس نے دوپہر کے وقت بھی یہ باغ دیکھا تھا۔ شام کے وقت یہ باغ بالکل بدل جاتا۔ لگتا جیسے سارے درختوں کی چوٹیاں آپس میں گندھ گئی ہیں۔ فجری کے درخت کے نیچے سے ہوکر گزرتے ہوئے اسے اپنے دل کی تیز تیز دھڑکن صاف سنائی دیتی۔ اسے لگتا جیسے جنات بابا درخت سے اب اترے۔

باغ سے نکل کر ایکھ کے کھیتوں کے پاس مینڈھ پر گزرتے ہوئے اسے محسوس ہوتا کہ ابھی ایکھ کے کھیت سے نکل کر بھیڑیا اس کی ٹانگ پکڑ لے گا۔ وہ پسینے پسینے ہوجاتا۔ پھر گیہوں کے کھیت آتے۔ پھر پلکھن کے درخت کے اوپر گاؤں کی مسجد کے کنارے اور مندر کے کلس نظر آتے۔ تب آہستہ آہستہ اس کے بدن کا کھنچاؤ دور ہوتا۔ ٹانگوں میں طاقت کا احساس پیدا ہوتا۔ پھر وہ بلند آواز میں کوئی فلمی گانا گانے لگتا۔

مہینے میں دو چار بار ایسا بھی ہوتا کہ باغ میں داخل ہوتے ہی اسے آدمی نظر آجاتا جو عموماً پھاوڑا لیے جھونپڑی کی طرف جارہا ہوتا تھا۔ اسے دیکھ کر گانا شروع کردیتا۔ گانا بیچ میں روک کر وہ بہت اپنائیت کے ساتھ آدمی کو سلام کرتا۔

آدمی اس کا سلام سن کر پھاوڑا زمین پر رکھ کر آنکھیں مچمچا کر اسے دیکھتا۔

''رام رام بیٹا— پٹواری صاحب کے بھانجے ہو۔ انہیں ہماری رام رام بولنا''

وہ روزانہ اسی بھروسے پہ کالج سے گھر آنے کی ہمت کر پاتا تھا کہ شاید آج بھی آدمی مل جائے۔ اگر یہ آسرا نہ ہوتا تو وہ رو پیٹ کر کالج سے نام کٹا کر اپنے گاؤں واپس جاچکا ہوتا۔

لیکن آدمی روزانہ نہیں ملتا تھا۔ ایک دن کالج سے نکلتے نکلتے دیر ہوگئی۔ وہ گراؤنڈ پر والی بال کا میچ دیکھنے میں ایسا محو ہوا کہ وقت کا احساس ہی نہیں ہوا۔ جب دیر کا احساس ہوا تو اس نے سورج کی طرف دیکھا جو آج قصبے میں ہی زرد ہوگیا تھا۔ وہ تیزی سے کالج کے گیٹ سے باہر نکلا اور دیہات کی طرف چل پڑا۔ نہر کی پٹڑی پر مڑتے ہی اس نے اپنے بدن میں یہ سوچ کر سنسنی محسوس کی کہ اب تو باغ سے آدمی بھی چلا گیا ہوگا۔ اس نے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور شیشم کے درخت کے نیچے

سے گزرا درخت کے نیچے سے نکلتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی درخت سے اتر کر اس کے پیچھے چل پڑا ہو۔ پیچھے کی آہٹ اچانک تھم گئی۔ اسے لگا جیسے جنات بابا پیچھے سے اس کی کمر کا نشانہ لے کر جادو کی گیند مارنے ہی والے ہیں۔ اس نے تیزی سے کلمہ پڑھا اور کنکھیوں سے پیچھے دیکھا۔ وہ ایک بڑا بندر تھا جو چلتے چلتے اچانک رک کر زمین پر دونوں ہتھیلیاں ٹیکے اس کی طرف دیکھ کر خرخر کر رہا تھا۔ اسے بندر سے بھی ڈر لگتا تھا لیکن جنات بابا کے مقابلے میں کم اس نے اپنا بستہ بہت کس کے پکڑا اور باغ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ آج آگے کا راستہ بھی بند تھا اور پیچھے کا بھی۔ آگے سنسان باغ جس میں اب آدمی ہونے کی اسے کوئی امید نہیں تھی اور پیچھے بندر۔

سورج ڈوبے دیر ہو چکی تھی اور باغ کے درخت دھیمی آواز میں شام کی سرگوشیاں شروع کر چکے تھے۔ وہ باغ میں داخل ہوا۔ آگے بڑھا۔ بوڑھے فجری کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کا دل زور سے دھڑکا۔ یہی جنات بابا کا اصلی گھر ہے۔

داہنی سمت سے آواز آئی۔

''آج بہت دیر کی بیٹا۔''

ارے...... آدمی موجود ہے۔ اسے اتنی خوشی اس دن بھی نہیں ہوئی تھی جس دن انگلش والے ماسٹر صاحب نے ''مائی کاؤ'' لکھنے پر اسے ویری گڈ دیا تھا۔ اس نے آدمی کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ وہ جھونپڑی کے قریب درختوں کے پاس کہرے میں کھڑا تھا۔ اس نے غور سے دیکھا اس کا پھاؤڑا اس کے ایک ہاتھ میں تھا جسے وہ زمین پہ ٹکائے ہوئے تھا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ انگوچھے کو کانوں پہ برابر کر رہا تھا۔ کہرے میں لپٹا' دھوتی کرتا انگوچھا پہنے یہ آدمی اسے حضرت خضر علیہ السلام کا نوکر لگا۔

''آدمی سلام'' وہ چہک کر بولا۔

''جیتے رہو بیٹا۔ پٹواری صاحب کو ہماری رام رام کہنا۔ اندھیرا مت کیا کرو۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گھر آ کر کھانا کھا کے دلان میں بیٹھی خالہ کے کلیجے سے لگ کر اس نے انہیں پورا واقعہ سنایا۔ وہ چاہتا تھا خالو اور خالہ کو علم ہو جائے کہ اسکول کی پڑھائی کے علاوہ راستے میں واپسی کے لیے اسے کیسی جوکھم اٹھانا پڑتی ہے۔ مگر خالہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ والی بال کے میچ کے چکر میں اسے دیر ہوئی تو وہ ہمدردی کے بجائے الٹا اسے ڈانٹنے لگیں۔

رات کو دالان میں رضائی سے بدن اچھی طرح لپیٹ کر اس نے سوچا اگر وہ آدمی مر گیا تو میں اسکول سے کیسے واپس آیا کروں گا۔ پھر یہ سوچ کر مطمئن ہوا کہ وہ آدمی دیکھنے میں تو خالو سے بھی چھوٹا لگتا ہے ابھی نہیں مرے گا۔

''سرفراز! تمہاری خالہ کی بیٹی کی شادی ہے۔ خالہ نے مجھے بلا کر کہا کہ سرفراز تو ہمیں

بالکل بھول گیا۔ تم اس سے جا کر کہو کہ خالہ اور خالو اسے دیکھنے کو بہت بے تاب ہیں اسے شادی میں ضرور آنا ہے۔''

سرفراز کو یہ سن کر بہت ندامت ہوئی۔ وہ ندامت کے اس احساس کو چھپانا چاہتا تھا۔ اس نے سنجیدہ لہجے' لیکن کھوکھلی آواز میں انوار کو بتایا کہ سرکاری ملازمت خصوصاً ذمہ داری کے عہدے پر کام کرنے میں بالکل فرصت نہیں ملتی۔ پھر اسے عائشہ کی یاد آئی' جسے اس نے اپنی گود میں کھلایا تھا۔ وہ کتنی جلدی اتنی بڑی ہوگئی۔

''شادی کب ہے؟''

''پرسوں بارات آئے گی۔''

''ارے۔ ان حالات میں تاریخ کیوں رکھ دی خالہ نے'' تم نے دیکھا نہیں' کیسے دیوانے ہورہے ہیں سب لال بھبھوکا چہرے لیے ٹرکوں اور ٹریکٹروں پر جلوس نکال رہے ہیں۔ ہاتھوں میں ہتھیار اور کیسے نفرت انگیز نعرے......''

انوار اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا:

''میں نے بھی خالہ سے کہا تھا کہ آج کل تقریب کرنے والا وقت نہیں ہے۔ گاؤں گاؤں میں وہ بات پھیل گئی ہے۔ خود انہیں کے گاؤں میں لوگوں کے لہجے بدل گئے ہیں۔ مگر خالہ کی بھی مجبوری ہے۔ خالو کے بھائی کے بیٹے سے رشتہ طے ہوا ہے جو تین دن بعد جدہ واپس چلا جائے گا۔ خالو بھی اب بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ اپنے سامنے عائشہ کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں۔ تمہیں آج ہی چلنا ہوگا سرفراز۔ بھابی کو فون کر کے تیار ہونے کو کہہ دو۔''

''کیا تم نے اخبار نہیں پڑھا انوار۔ پرسوں ریل گاڑی سے اتر کر......'' وہ چپ ہوگیا۔

انوار بھی خاموش ہوگیا۔ پھر بولا:

''اچھا تو بھابی اور بچوں کو یہیں رہنے دو۔''

ہاں ان لوگوں کو نہیں لے جاپاؤں گا۔''

گیارہ بجے ہیں — اگر بارہ بجے بھی کار سے چلیں تو شام چھ سات بجے تک خالہ کے ہاں پہنچ جائیں گے۔''

''ہاں۔ تقریباً ڈھائی تین کلومیٹر کا سفر ہے۔''

راستے میں نہر کے پل پر اچانک کچھ لوگوں نے گاڑی کے سامنے آ کر گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ دونوں کے دل بیٹھ گئے کیونکہ بچاؤ کے لیے ان کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ سامنے پل پر ٹرک اور ٹریکٹروں کا جلوس آرہا تھا۔ لوگ دیوانہ وار نعرے لگا رہے تھے اور ایک عجیب جذبے کے ساتھ آگے بڑھتے چلے آرہے تھے۔

دونوں کے ذہنوں نے کام کرنا بند کردیا۔ دونوں گاڑی میں بیٹھے رہے۔ جلوس برابر سے گزرتا رہا۔ گاڑی رکوانے والے وہیں کھڑے کھڑے نعروں کا جواب دیتے رہے۔ سرفراز نے آیۃ الکرسی یاد کی۔

جلوس گزر گیا تو وہ لوگ بھی زور زور سے کچھ باتیں کرتے جلوس کے ساتھ بڑھ گئے۔

سرفراز سخت ذہنی دباؤ میں تھا اس لیے گاڑی فوراً اسٹارٹ نہیں کر سکا۔ دونوں بیٹھے ایک دوسرے کا ڈر محسوس کرتے رہے۔

سرفراز نے گاڑی اسٹارٹ کی تو انوار بولا:

کھلے عام سڑک پر اِکا دُکا آدمیوں سے کچھ نہیں کہتے۔ اِکا دُکا آدمیوں سے نمٹنے کے لیے شہر شہر گاؤں گاؤں لوگوں کو تیار کیا گیا ہے۔ پچھلے جمعے کو جب احمد شہر کی پٹڑی سے باغ کی طرف مڑا تو اچانک کسی نے پیچھے سے......''

سرفراز کے بدن میں سر سے پاؤں تک سنسنی سی دوڑ گئی وہ خالی ذہن کے ساتھ گاڑی چلاتا رہا۔ انوار بتاتا رہا۔

اگر پورا جلوس اِکا دُکا آدمیوں پر حملہ کرے تو بدنامی بھی تو بہت ہوگی۔ ویسے اپنی طرف سے بھی تیاریاں ٹھیک ٹھاک ہیں۔'' اس نے یہ بات رازداری کے لہجے میں بتائی۔

جب وہ نہر کی پٹڑی پر مڑے تو سورج ڈوب رہا تھا۔ سرفراز کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔

تب اسے یہ خاموش نہر' سنسان پٹڑی اور سائیں سائیں کرتے باغ کتنے بھیانک لگے تھے۔ اس نے اچانک گاڑی کے بریک لگائے۔ ہیڈلائٹ کی روشنی میں ایک بڑا سا بندر ہتھیلیاں زمین پر ٹیکے ان کی طرف دیکھ کر خرخر کر رہا تھا۔ دونوں مسکرائے۔ بندر بھاگ کر درخت پر چڑھ گیا۔ اوپر کسی گدھ نے پہلو بدلا تو پھڑ پھڑاہٹ کی آواز ہوئی۔ سرفراز نے سوچا پہلے اس پھڑ پھڑاہٹ سے کتنا ڈر لگتا تھا۔

''تو یہ احمد دکاندار والا معاملہ کب ہوا تھا؟''

''آج چار دن ہو گئے۔''

''ارے......'' سرفراز کی ہتھیلیاں اسٹیرنگ وہیل پر نم ہو گئیں۔

''کیا ہوا؟'' انوار نے پوچھا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ کیا ہوا۔

''نہیں کچھ نہیں۔ یعنی ابھی بالکل تازہ واقعہ ہے۔ کچھ پتہ لگا؟''

''پتہ کیا لگتا۔ الٹے تھانے دار نے دفن کے بعد ہی سب کو ڈانٹا کہ جب ایسے حالات چل رہے ہیں تو سورج مندے گھر سے باہر نکلنے ہی کیوں دیا۔ اندھیرے میں حملہ کرنے والوں کو مار کر بھاگنے میں سہولت رہتی ہے۔''

پٹڑی سے اترتے ہی باغ سامنے آ گیا۔

گاڑی یہیں روک کر بیک کر کے لگا دو۔ آگے راستہ نہیں ہے۔" انوار بولا۔

سرفراز نے گاڑی بیک کر کے لگا دی اور باغ کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔

کہرے میں لپٹا باغ بہت دن بعد دیکھا تھا۔ آج اسے باغ سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا لیکن ایک عجیب سا سناٹا دونوں کے اندر خاموشی سے اتر آیا تھا جو باتیں کرنے کے باوجود ٹوٹ نہیں رہا تھا۔

دونوں جب جنات بابا والے پرانے درخت کے پاس سے گزر رہے تھے تو سرفراز نے اچانک رک کر انوار کا ہاتھ اتنے زور سے دبایا کہ دکھن ہڈیوں تک پہنچ گئی۔

انوار نے سرفراز کی طرف دیکھا۔ سرفراز نے آنکھ کے اشارے سے باغ کی بڑی مینڈھ کی طرف اشارہ کیا۔ انوار کو کچھ نظر نہیں آیا۔ اندھیرے میں وہ اس جگہ کا تعین بھی نہیں کر پایا جہاں سرفراز نے اشارہ کیا تھا۔

سرفراز نے اس بار اور بھی زیادہ زور سے ہاتھ دبایا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے پکڑے واپس مڑا اور کھینچنے والے انداز میں دوڑتا' گرتا' سنبھلتا باغ سے باہر نکالا۔ گاڑی میں انوار کو دھکیل کر گاڑی اسٹارٹ کی اور فل اسپیڈ پر نہر کی پٹڑی پر چڑھا کر پل پار کر کے کچی سڑک پر آ گیا۔ سرفراز شدید کھنچاؤ کے عالم میں گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کا چہرہ ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور پورا بدن پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔

"اب دور نکل آئے ہیں۔ بتاؤ تو سہی کیا بات تھی؟" سرفراز نے گاڑی روک دی۔

"باغ کی مینڈھ پر درختوں کے درمیان ایک آدمی جھکا کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار تھا جسے وہ زمین میں ٹکائے ہوئے تھا۔"

علی امام نقوی

شائبہ

عبداللہ پور، عبداللہ پور

آصف آباد جانے والی پرائیوٹ بس کنڈکٹر پچھلے پائیدان پہ کھڑا چیخ چیخ کر مسافروں کو بلا رہا تھا۔ ان دونوں کو عبداللہ پور ہی جانا تھا، کنڈکٹر کی آواز پر اس نے شبانہ کا بایاں بازو پکڑا، اور جوں ہی تیزی سے اسے ساتھ لے کر بس کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو اسے لگا، شبانہ گوشت پوست کا وجود نہیں۔ پتھر کی مورت ہے۔ جس کے پیر زمین میں بہت اندر تک دھنسے ہوئے ہیں۔ اس احساس کے پیدا ہوتے ہی اس نے اپنی کنپٹی کی نسوں میں خون کے دوران کی تیزی کو محسوس کیا، سر کو دائیں جانب موڑنے کے بعد ناراضگی کے اظہار کی خاطر اس نے شبانہ کو گھورا۔

''رکشے سے چلیں گے''

دھیمے لہجے میں شبانہ نے اپنے میاں کو مخاطب کیا تو اس کی خفگی اور بڑھ گئی، اسی عالم میں اس نے سوچا، امی، خالہ جان اور بابا غلط تو نہیں کہتے۔ واقعی شبانہ تھوڑی سی......

سوچ کا سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا کہ اس تھوڑی سی سے آگے سوچنے کا ارادہ اس نے کئی مرتبہ کیا تھا، لیکن جب بھی اس کا ذہن اس سمت بڑھا، شبانہ کی آنکھیں زبان بن گئیں، اس کا عمل آڑے آ گیا۔ سوٹ کیس اٹھاتے ہوئے اس نے رکشاؤں اور انہیں چلانے والوں پر ایک نگاہ ڈالی، اک نئی سی رکشہ کا انتخاب کرنے کے بعد اس نے اپنا سوٹ کیس رکشہ کے پائیدان پر رکھ دیا۔ شبانہ ہڈ کا ہینڈل پکڑ کر رکشہ پر سوار ہوئی تو اس نے سوچا۔

نہیں ـــ بابا، امی اور خالہ جان غلط کہتے ہیں۔ یہ تو اچھی بھلی ہے۔ باؤلے کہیں احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ پھر...... پھر آخر اسے کیا ہو جاتا ہے؟

رکشہ چل پڑا تھا، کریپ کے برقعہ کی جالی سے شبانہ کی کٹورہ سی آنکھیں بائیں طرف زمین پر پڑنے والے رکشہ کے اگلے پہیے کے سائے پر جمی ہوئی تھیں، اور وہ سوچ رہی تھی، چچی کے بغیر اب گھر کیسا لگے گا؟ چچی ذکو کا خیال آتے ہی ان کا سراپا شبانہ کے تصور میں ابھر آیا۔ چوڑی دار پائجامہ، سفید ململ کا کرتا، دوپٹے کا پلو سر پر قرینے سے جما ہوا، ہونٹوں پر پان کی سرخی، اور گلے میں

پڑے چاندی کی ڈیڑھ انچی تلوار جس سے وہ خلال کیا کرتی تھیں۔

''اے لونڈیا۔ ہوش میں رہا کر' دوپٹے کی آنچل سر پر ڈال' ورنہ قسم جناب امیرؑ کی۔ اسی سے تیرا گلا نہ گھونٹ دیا تو ذکو نہ کہیو''۔ اک دم سے اسے اپنے کنوار پن کے دن یاد آ گئے۔

رہنے بھی دیں چچی کم بخت دوپٹے ہی ایسے آ رہے ہیں' جو سروں پہ نہیں رکتے'' اور اس کے ساتھ ہی اسے یاد آ گئی ایک اور آواز' اس کے یاد آتے ہی دل کے کسی گوشے سے ڈھیر ساری نفرت بھی ابل پڑی۔ ''کیوں آخر ایسا کیوں کیا ابو نے؟''

رکشہ پلر نے ایک دم سے کاوا کاٹا تو دونوں ہی ہل کر رہ گئے۔ دونوں کے جسم آپس میں ٹکرائے۔

''بے وقوف کہیں کی۔ شوہر نے کنکھیوں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

''ذرا سنبھل کے بھائی— شبانہ نے رکشہ چالک کو تاکید کی۔

''اجی گڑھا آ گیا تھا سورا۔''

سڑک پر پڑنے والا رکشے کا سایہ کچھ اور دراز ہو چلا تھا' شوہر نے چہرے پر ابھرنے والے ناگواری کے تاثرات چھپانے کی خاطر بائیں جانب کھڑے ایکھوں کو دیکھنا شروع کیا۔ ابھی کھیت کا چھوٹا سا ٹکڑا ہی گزرا تھا کہ اس نے سر گھمایا۔ ایک کسان بیل کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا اسے دکھائی دیا' اس کے گلے میں ٹرانسسٹر پڑا ہوا تھا اور ریڈیو سے کافی بلند آواز میں گانا نشر ہو رہا تھا۔

''وقت نے کیا' کیا عجب ستم' تم رہے نہ تم' ہم رہے نہ ہم۔''

نہیں! شاید بابا' امی اور خالہ جان ہی ٹھیک ہیں' مجھے تو ان کا پورا گھر ہی باؤلوں کا لگتا ہے۔ شبانہ کا باپ کیا کسی پاگل سے کم تھا؟ بارہ سال پہلے جب خود میری شادی نہیں ہوئی تھی اور ابو بابا سکھے کے ساتھ میرا رشتہ لے کر عبداللہ پور گئے تھے' تب شبانہ کے باپ نے بلا کوئی وجہ بیان کیے رشتہ نامنظور کر دیا تھا اور ٹھیک بارہ برسوں بعد' جب میں تین بچوں کا باپ بن چکا اور میری بیوی مجھے داغ مفارقت دے گئی' تو اس کی برسی سے پہلے ہی پھر ایک مرتبہ ابو میرے بچوں کو پالنے کی خاطر اسی عبداللہ پور میں میرا رشتہ لے کر پہنچے تھے اور جب انہیں علم ہوا کہ شبانہ آج بھی کنواری ہے تب ابو نے جھٹ سے نسبت طے کی اور قریبی تاریخ طے ہوتے ہی خاموشی کے ساتھ میرا عقد ثانی شبانہ سے ہو گیا۔

سہاگ رات بس گذر گئی دل دھڑکا ہوگا تو اس باؤلی کا دھڑکا ہوگا۔ مجھے تو اس رات رہ رہ کر یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ یہ لڑکی جو آج بلقیس کی جگہ اس مسہری پر لیٹی ہے۔ کیا بلقیس اور میرے بچوں کو ماں کا پیار دے سکے گی؟ مگر اس نے تو کمال ہی کر دیا۔ امراؤ' ظفر اور مختار تین مہینوں میں ہی بلقیس کو بھول گئے' بھول تو میں بھی اسے گیا تھا اور میں ہی کیا' بابا' امی اور خالہ جان' سب ہی اسے بھلا بیٹھے تھے کیونکہ شبانہ پر دورے جو پڑنے لگے تھے۔

پہلا دورہ شادی کے چار ماہ بعد پڑا تھا' جب ابو کسی خیال میں کھوئے خلاف عادت بلا کھکارے ہمارے کمرے میں داخل ہوگئے تھے' شبانہ کچھ ہی دیر پہلے غسل خانے سے نہانے کے بعد نکلی تھی اور کمرے کے درمیان کھڑے ہوکر' اپنے بدن کو خم کئے تولیے سے زلفوں کا پانی جھٹک رہی تھی' ابو کے کھکارنے پر وہ ایکدم سے اکڑوں بیٹھ گئی' اُدھر ابو کا عجب حال تھا ان کے قدم گویا زمین پر چپک کر رہ گئے تھے۔

جائیے' نکلئے' باہر۔ شبانہ چیخی تھی' امی باورچی خانے میں ہنڈیا چولہا چھوڑ کر دوڑیں' اور خالہ جان اپنے کمرے سے' دونوں بہنوں نے دیکھا' ابو پسینے میں شرابور سر جھکائے دلان عبور کر رہے تھے' اور اندر کمرے میں شبانہ آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ امراؤ' ظفر اور مختار' نئی ماں کا نیا روپ دیکھ کر سہم کر چوکی پر بیٹھ گئے تھے۔ امی اور خالہ جان نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا پھر اپنی اپنی سوالیہ نظریں ابو کی طرف اٹھائیں' وہ آنگن میں نیم کے پیڑ تلے سر جھکائے مونڈھے پر بیٹھے اپنے دائیں پیر سے کچی زمین پر کبھی ایک لکیر کھینچتے اور دوسرے ہی پل دوسری عمودی لکیر سے اسے کاٹ دیتے۔

شام کو جب میں گھر میں داخل ہوا تب مجھے علم ہوا کہ شبانہ کو دورہ پڑا تھا۔ رات کے کھانے کے وقت امی نے جب سینی میں ابو کے لیے کھانا اتار کر شبانہ سے کہا کہ جاؤ اسے اپنے ابو کے کمرے میں پہنچا دو تو وہ نفرت سے امی کو دیکھنے لگی تھی۔ میں نے صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اُسے اپنے کمرے میں بھیجا اور خود سینی اٹھا کر ابو کے سامنے پہنچا۔ وہ اب بھی سر جھکائے بیٹھے تھے۔

دوسرے دن عبداللہ پور پہنچ کر میں نے چچی ذکو سے شبانہ کے دورے کے بارے میں بتایا تو ان کا چہرہ فق ہوگیا۔

''کیا کہو ہو۔ یہاں تو کبھی نا پڑا' اُس پہ دورہ

عبداللہ پور میں شبانہ کے دوسرے عزیزوں سے بھی میں نے پوچھا۔ سب کا ایک ہی جواب تھا۔ اور اُس روز جوابات کی یکسانیت نے بے اختیار مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ بابا سکھے نے مجھے پھنسا دیا ہے۔ ایک پاگل یا نیم دیوانی لڑکی میرے پلے کر دی گئی ہے۔ لیکن —— بچوں کے لیے تو وہ بے حد شفیق اور مہربان ماں ثابت ہوئی تھی۔ خود میرے لیے وہ مثالی بیوی تھی' امی اور خالہ جان بھی اس سے خوش تھیں اور خود شبانہ کو ان سے کوئی شکایت نہ تھی۔ بس ابو ...... کہیں ابو نے کوئی ...... نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ میرے لیے تو ایسا سوچنا بھی گناہ عظیم ہے۔ پھر ...... کیا بات ہے۔ ان کا سامنا ہوتے ہی شبانہ کی آنکھوں کی پتلیاں جائے پناہ کیوں تلاش کرنے لگتی ہیں؟ ہونٹ کیوں پھڑ پھڑاتے ہیں۔ اور وہ کیوں چیخ اٹھتی ہے؟

''ہٹئے۔ سامنے سے۔ جائیے۔''

☆☆☆

شبانہ کے مخاطب کرنے پر وہ چونکا' اس کی طرف دیکھنے سے پہلے اس نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا۔ پلیا کے اس پار عیدگاہ کے بلند مینار اسے دکھائی دیئے عیدگاہ سے پرے عبداللہ پور تھا۔

''تم نے کچھ کہا۔''

''جی۔''

''کہو۔''

''آپ برا تو نہیں مانیں گے۔''

''برا ماننے والی بات ہوئی تو ضرور مانوں گا۔''

''تو پھر مجھے کچھ نہیں کہنا۔''

واقعی یہ باؤلی ہے۔ اُس نے سوچا — اور دونوں اُس وقت تک ایک دوسرے کو دیکھتے رہے' جب تک رکشہ والے نے اسے مخاطب نہیں کرلیا۔

''عبداللہ پور تو آ گیا ہے گا باؤ جی۔ آپ اسٹینڈ پر اتریں گے یا......

''میاں سجاد کی کوٹھی پر اتار دو۔ وہ جو مقبرے کے پاس ہے۔

دو منٹ بعد دونوں چچی ذکو کے مکان میں بیٹھے تھے۔ چچی کے دونوں بیٹے' بہوویں ان کے گرد بیٹھے تھے' سب کی نگاہیں شبانہ کو ٹٹول رہی تھیں' چچی ذکو کا بڑا بیٹا چہلم کا پروگرام بتانے لگا۔ مغربین کے بعد بڑی سی سینی میں دو عدد نان' ایک پیالے میں آلو گوشت کا سالن' چھوٹی سی پرچ میں زردہ اور ایک پیالے میں فیرنی رکھنے کے بعد اُس پر خوان پوش ڈھک دیا گیا۔ چچی ذکو کے سارے بچے' اور وہ خود سینی لے کر قبرستان پہنچے سینی چچی کی قبر پر رکھ دی گئی' وہیں فاتحہ دی گئی اور مسجد کے موذن کو فاتحہ کا کھانا دینے کے بعد وہ سب گھر لوٹ آئے۔ سب نے محسوس کیا' چچی ذکو آج ہی تو بی گئی ہیں۔ رات کے گیارہ بجے تک ہر پھر کر اُن ہی کا ذکر ہوتا رہا۔ وہ قدرے شبانہ نے غور سے اپنے میاں کو دیکھا' پل بھر کے لیے کچھ سوچا پھر ہاتھ بڑھا کر پلنگ کی دوسری پٹی تھامی اور جھکنے کے بعد اُس کے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔

''مل گیا جواب''

''زبان سے کہو''

شوہر کے اصرار پر شبانہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور اُس سے مخاطب ہوئی۔ ''میں ایک بات پوچھوں''

''ہاں' پوچھو۔''

''مرد جانتے ہیں' ان کی بیوی انہیں چاہتی ہے' پھر بھی وہ بیوی کی زبانی سننے کی خواہش کیوں کرتے ہیں؟'' یہ کسی باؤلی کا سوال ہے؟ ذہن میں ایک خیال سوال بن کر ابھرا اور فوراً ہی اُس کا جواب بھی ذہن نے نفی میں دے دیا۔

''پتہ نہیں۔مردوں میں یہ خواہش کیوں پیدا ہوتی ہے۔''

''میں بتاؤں۔''

''تم جانتی ہو؟''

''ہاں۔''

''تو بتاؤ۔''

''آپ برا مان جائیں گے۔''

''نہیں مانوں گا۔چلو بتاؤ۔''

''مردوں کو عورت کے دل میں جھانکنا نہیں آتا۔اس لیے۔''

''ہوں۔''

ہنکاری بھرتے ہوئے شبانہ کے لیے اُس کے دل میں بے پناہ محبت اُمڈنے لگی' کتنی رسانیت اور اعتماد سے اُس نے گر کر بات اُسے بتا دی تھی۔

''ایک بات اور کہوں۔''

''ہاں کہو۔''

''سمجھ دار مرد کو اپنی بیوی سے اس طرح کا سوال نہیں کرنا چاہیے۔''

''کیوں۔''

''شوہر کا سوال' بیوی کے ذہن میں وسوسے کو جنم دیتا ہے۔''

''اوہ''— نہیں یہ پاگل نہیں ہوسکتی۔تو' تو پھر ان دوروں کی کیا حقیقت ہے؟ سوال' اُس کے ذہن کی حساس ترین نس میں اتر کے رہ گیا۔اُس نے بے چارگی سے شبانہ کو دیکھا اور پھر سوال کی اذیت سے نجات کی خاطر بات کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

''تو کیا تمہارے دل میں' میرے لیے شک پیدا ہوگیا۔''

''ابھی تو نہیں۔''

''کب تک ہوگا۔''

اُس کا سوال سن لینے کے بعد شبانہ نے مسکراتے ہوئے اُسے دیکھا اور بڑی محبت بھری آواز میں اُس سے پوچھا۔

''یہ آج آپ کیسی باتیں کرنے لگے؟''

شبانہ کے سوال کا اُس نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ بلکہ وہ ذہن میں پہلے سے موجود اصل بات کے اظہار کی خاطر مناسب الفاظ تلاش کرنے لگا تھا۔کافی دیر بعد شبانہ سے نظریں چراتے ہوئے اُس نے کہا۔

''دراصل ...... مجھے ......ابو کے بارے میں' تمہارے رویے نے یہ سوال کرنے پر مجبور کردیا ہے اپنی بات کے خاتمے پر اُس نے محسوس کیا کہ اُس کا ذہن خاصا ہلکا پھلکا ہو چکا ہے۔ اُس نے نظروں کا زاویہ بدلا تب اُس نے دیکھا۔ ایک سایہ شبانہ کے چہرے پر آ کے گزر گیا۔ اب شبانہ غور سے اُسے دیکھ رہی تھی اور وہ پھر ایک مرتبہ اُس نے نظریں چرانے پر خود کو مجبور پا رہا تھا۔ شبانہ اُسے غور سے دیکھتے ہوئے اُس کے برابر ہی لیٹ گئی۔ کچھ لمحے بعد اُس نے تھکی سی آواز میں کہنا شروع کیا۔

''جانے۔ مجھے — کیا ہو جاتا ہے۔ انہیں دیکھتی ہوں تو ان کی آنکھوں سے ڈر لگتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے' جیسے وہ نظریں میرے سراپے میں' اپنی کوئی ...... کھوئی ہوئی شے تلاش کر رہی ہیں۔ اور اُس کے بعد میں آپے میں نہیں رہتی۔

''کیا بکواس ہے؟''

بے دلی کے عالم میں ان کے درمیان بیٹھا ہوں ہاں کرتا رہا نیند سے بوجھل ہوتی ہوئی اُس کی پلکوں پر سب سے پہلے بڑی بہو کی نظر پڑی' اُس نے اپنے میاں کو اشارہ کیا' سب خاموشی سے اٹھ گئے' ان دونوں کے لیے بڑی بہو نے اپنا کمرہ خالی کر دیا۔ بستر پر لیٹتے ہوئے اُس نے کپڑے بدلتی ہوئی شبانہ کو دیکھا تو یکایک اُس نے سوچا۔ کہاں سے شروع ہوتا ہوگا باؤلا پن؟ لاؤ' آج اسی سے کیوں نہ پوچھ لوں۔

''شبو''

''جی''

''یہاں آؤ''

''قمیص تو بدل لوں''

''یوں ہی آ جاؤ''

''کوئی آ جائے تو''

''کوئی نہیں آتا۔ تم آؤ۔ یوں بھی شمیز میں جچ رہی ہو۔''

شبانہ نے مسکرا کر اُس کی طرف دیکھا' دو قدم بڑھائے اور اُس کے پہلو میں جا بیٹھی۔''

''ایک بات بتاؤ گی''

''پوچھیے''

''تمہیں...... میں اچھا لگتا ہوں؟''

جواب میں شبانہ مسکرانے لگی۔

''بتاؤ نا''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔''

''پھر''

''یہ تو — سمجھنے کی بات ہے۔ جان لینے کی بات ہے۔''

''سمجھتا بھی ہوں اور جانتا بھی۔''

''پھر کیوں معلوم کر رہے ہیں؟''

''میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔''

اُس کی بلند آواز کی کرختگی پر شبانہ سہم گئی۔ تیزی سے کروٹ بدل کر اس نے میاں کی بغل میں منہ چھپا لیا اور سبکتے ہوئے بولی:

''میرا یقین کیجئے۔''

''تم بھول رہی ہو کہ وہ میرے ابو ہیں اور تمہارے سسر، تمہارے بھی باپ ہی سمان ہیں وہ۔''

''ہاں ہیں۔''

شبانہ نے دو لفظ لخت لخت ادا کیے اور گھٹی ہوئی آواز میں رونے لگی۔ اس کا میاں کچھ دیر تو خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کا سر سہلاتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا:

''تم ...... تم گھبراؤ نہیں ...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایسا کریں گے کل کو جب یہاں سے روانہ ہوں گے تو بس اڈے جانے سے پہلے......''

اس نے عمداً بات مکمل نہ کی۔ شبانہ نے بغل سے منہ نکال کر استفہامیہ انداز میں سبکتے ہوئے شوہر کو دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو شوہر نے اسے اپنے سے لپٹاتے ہوئے بات پوری کی۔

''بس اڈے جانے سے ہم پیارے لال شرما اسپتال چلیں گے۔''

''و...... وہاں ...... کیوں''

''دماغ کے ماہر کسی ڈاکٹر سے مل کر تمہاری بیماری کا علاج معلوم کریں گے۔''

سبکتی ہوئی شبانہ کے ذہن میں شوہر کی تجویز نے دھماکہ کیا۔ پل بھر کے اندر ہی اس میں ایک انقلاب سا آ گیا۔ سبکنا چھوڑ کر وہ تیزی سے اٹھی۔ میاں کو غصہ سے دیکھا اور دوسرے پلنگ پر پڑی اپنی قمیص اٹھا کر پہنتے ہوئے خاصی بلند آواز میں بولی:

''میں کیا باؤلی ہوں جو دماغ کے ماہر ڈاکٹر سے آپ میرا علاج کروانا چاہتے ہیں؟

شرون کمار ورما

ایک تھا تاراچند

لالہ جی بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بہت دنوں سے ایسا ہو رہا تھا۔ جیسے اندر کچھ ٹوٹ رہا ہو۔ گرد سی اڑ رہی ہو۔ دم گھٹتا سا محسوس ہوتا۔ جی چاہتا کہیں چلے جائیں۔ تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لیں — وہ نکل بھی جاتے۔ کچھ دور جاتے تو کوئی جیسے اندر سے ٹوکتا — کہاں جا رہے ہو تاراچند — لاجونتی کو چھوڑ کر — کیا کسی برگد کے نیچے بیٹھ کر گیان پراپت کرو گے — اور وہ رک کر سوچنے پر مجبور ہو جاتے — کہاں جا رہے ہیں اس بوڑھی بیمار عورت کو چھوڑ کر' جو زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر پچھلے پچاس برسوں سے ان کے ساتھ ساتھ چلی آ رہی ہے۔ گوتم تو راج کمار تھا — پھر وہ جیسے چل نہ پاتے — وہیں بیٹھ جاتے۔ کچھ دیر سر تھامے گہری سوچ میں ڈوبے رہتے۔ پھر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے' سر لٹکائے دھیرے دھیرے کسی شکست خوردہ سپاہی کی طرح چلتے ہوئے گھر لوٹ آتے۔ چھوٹے سے لان سے سوکھی ٹہنیاں پتے اور پرندوں کے پر بٹورتے' کیاریاں ٹھیک کرتے' پودوں کو پانی دیتے اور ادھر سے فارغ ہو کر اندر جا کر بیوی کی چارپائی کے قریب اپنی مخصوص آرام کرسی پر نڈھال سے جیسے گر جاتے اور بیوی کی طرف یوں دیکھتے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔

''کہاں گئے تھے؟'' لاجونتی پوچھتی۔

''کہیں نہیں''۔ وہ بے یقینی سے کہتے۔ یہ جھوٹ بھی ہوتا اور سچ بھی وہ جانتے تھے کہ جھوٹ بول رہے ہیں لیکن سچ کیا ہے شاید وہ یہ سمجھ نہیں پا رہے تھے یا بیوی سے کہنے کی جرأت نہیں کر پاتے تھے۔ لاجونتی یوں ان کی طرف دیکھتی جیسے من میں جھانک رہی ہو۔

وہ آج بھی حسب معمول پانچ بجے جاگ گئے تھے جیسے ان کے اندر الارم فٹ ہو گیا ہو۔ اٹھ کر کھڑکی تک گئے تھے۔ باہر درختوں' بجلی کے تاروں اور منڈیروں پر چڑیوں کے جھنڈ اتر آئے تھے۔ ہوا میں پھاگن مہینے کی تازگی اور خوشبو تھی' لیکن انہیں اپنے اندر وہی دم گھوٹنے والی گرد کا احساس ہو رہا تھا۔ پھر وہی کہیں چلے جانے کی خواہش — جہاں سے وہ کبھی واپس نہ آ سکیں — 'تاراچند' ایسا تو مر کر ہی ممکن ہے — کسی نے ان کے اندر ہنس کر کہا — انہوں نے بیوی کی طرف دیکھا جواب

خواب آور دوا کے زیرِ اثر گہری نیند میں تھی۔ انہیں اس نحیف' بیمار' پتلی سی عورت کو دیکھ کر دکھ ہوا—— کہاں گئی وہ بھری بھری سی خوبصورت عورت—— انہیں یاد آیا کہ جب تک اس کی صحت ٹھیک رہی۔ ہاتھ پاؤں چلتے رہے وہ اُن سے پہلے جاگ جاتی۔ انہیں چائے کی پیالی دے کر نہانے جاتی۔ وہ سیر سے لوٹتے تو لاجونتی پوجا پاٹھ سے فارغ ہوکر کچن میں مصروف ہوچکی ہوتی۔ صبح کی سیر تو خیر لالہ جی اب بھی کرتے تھے۔ لیکن صبح کی چائے پہلے تو بہو بنا کر دیتی رہی—— پھر—— ہوا یوں کہ ایک صبح جب وہ چائے اور اخبار کا انتظار کر رہے تھے تو نریندر آ گیا—— اخبار اُس کے ہاتھ میں تھا۔ لالہ جی نے سوچا' وہ انہیں اخبار دینے آیا ہے۔ نریندر جیسے رٹے رٹائے جملے ادا کرنے لگا۔

''باؤ جی' راہل رات کو بار بار جاگ جاتا ہے۔ مدھو کی نیند خراب ہوتی ہے۔ آپ کہیں تو میں اسے جگا کر چائے بنانے کے لیے کہوں۔ ابھی ابھی سوئی ہے۔''

تب لالہ جی نے لاجونتی کی طرف دیکھا تھا' جس نے نہ جانے کیوں آنکھیں موند لی تھیں۔ لالہ جی نے سوچا بچپن میں نریندر بھی تو اکثر رات میں جاگ جایا کرتا تھا۔ اور لاجونتی اُسے لے کر دیر تک بیٹھی یا ٹہلتی رہتی—— لیکن صبح کی چائے انہیں وقت پر مل جاتی—— انہوں نے دیکھا کہ نریندر گہری نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا—— ایک پل انہوں نے فیصلہ کرلیا۔

''نہیں—— چائے کا کیا ہے۔ تھوڑا ٹھہر کر بھی بن سکتی ہے۔ سونے دو بہو کو—— اور ہاں راہل کو کسی چائلڈ اسپیشلسٹ کو دکھاؤ——''

''جی——'' نریندر نے جیسے مطمئن ہوکر کہا اور سیٹی بجاتا چلا گیا۔ وہ اخبار ساتھ ہی لے گیا تھا۔

لاجونتی نے آنکھیں کھول کر خاوند کی طرف جیسے اداسی اور احساسِ جرم سے دیکھا—— پھر وہ بجھے سے لہجے میں بولی۔

''میرے ہاتھ پاؤں کام کرتے تو میں خود بنا دیتی۔ کچھ ڈھنگ سے پکڑا بھی تو نہیں جاتا۔''

''نریندر ٹھیک ہی کہتا ہے—— '' لالہ جی مسکرائے۔ ''ویسے بھی چائے کوئی اچھی چیز تو نہیں۔ السر کرتی ہے معدے میں۔ سوچتا ہوں چھوڑ دوں۔ اب بہت پی لی۔''

لاجونتی نے پھر آنکھیں موند لی تھیں۔

اُس دن کے بعد چائے تھوڑا ٹھہر کر ہی بننے لگی۔ لالہ جی باسی پانی پی کر ہی سیر کو چلے جاتے۔ اس کی تاویل انہوں نے یہ دی کہ باسی پانی ہاضمہ کے لیے بے حد مفید ہوتا ہے۔

ایک صبح جب وہ سیر کو جانے لگے تو بہو آ کر انہیں دودھ کی خالی بوتلیں دے گئی کہ ملک بوتھ سے دودھ لے آئیں۔ نریندر سر درد کی وجہ سے رات کو ٹھیک سے سو نہیں سکا تھا۔ اس کے بعد

جیسے یہ دستور ہی ہوگیا — نریندر اپنے کمرے سے پکار کر کہنے لگا — ''باؤ جی دودھ لانا نہ بھولئے گا — '' دھیرے دھیرے لالہ جی اس کے بھی عادی ہوگئے۔ نریندر کو آواز دینے کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ وہ خود جا کر کچن سے پلاسٹک کی ٹوکری اور خالی بوتلیں لیتے' بوتھ تک جاتے قطار میں کھڑے ہو کر دودھ لیتے' لا کر فریج میں رکھتے۔

ایک صبح جب وہ دودھ کی بوتلیں فریج میں رکھ رہے تھے تو بہو نے آ کر پہلے تو ان کے پاؤں چھوئے پھر السائی سی آواز میں بولی۔

''باؤ جی' پہلے دودھ دے جایا کریں پھر سیر — راہل — ''

''ٹھیک ہے — '' لالہ جی نے بہو کو آشیرواد دے کر کہا — ''راہل میں ساری عادتیں نریندر والی ہیں'' — وہ مسکرائے بھی۔

جواب میں بہو بھی مسکرا دی۔

پھر گھر میں وہی ہونے لگا جو بہو اور نریندر کہتے یا چاہتے — لالہ جی پلاسٹک کی ٹوکری اور بوتلیں لے کر جاتے' دودھ لا کر فریج میں رکھتے پھر سیر کرنے جاتے۔ واپس آ کر پودوں کی کاٹ چھانٹ کرتے' کیاریوں کو پانی دیتے۔ اس کے بعد جا کر لاجونتی کے پاس بیٹھتے اور صبح کی چائے پیتے۔

کھڑکی میں کھڑے انہیں ایک چبھتا سا احساس ہوا۔ جیسے وہ کوئی بے کار اور فالتو شے ہوں۔

چند روز پہلے وہ یونہی سیڑھیوں والی بگھاری میں جا گھسے تھے — گھر کی ہر بیکار ٹوٹی پھوٹی چیز وہاں پھینک دی جاتی تھی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے وہ ٹوٹی ہوئی کرسی پڑی تھی جس پر بیٹھ کر وہ کبھی لکھا کرتے تھے۔ ٹین کا وہ زنگ آلود ٹوٹا ہوا بکسہ اوندھا پڑا تھا جس میں لاجونتی کبھی اپنا نک سک رکھا کرتی تھی — ایک ناکارہ چوکی تھی جس پر بیٹھ کر لاجونتی روٹی پکایا کرتی تھی۔ گھر میں گیس آ گئی تو یہ سب بے کار ہو کر رہ گیا تھا — وہ ان چیزوں کو دیکھتے رہے۔ انہیں یاد نہیں رہا تھا کہ وہ وہاں کس چیز کی تلاش میں آئے تھے۔ وہ پلٹے ہی تھے کہ اُن کی نظر کیل سے ٹنگی اس لالٹین پر پڑی جس کی روشنی میں انہوں نے اکثر کام کیا تھا۔ بجلی فیل ہو جانے پر وہی لالٹین کام آتی۔ انہوں نے بے ارادہ ہی وہ لالٹین اتار لی۔ وہ سیڑھیاں اُتر رہے تھے کہ بہو سامنے آ گئی۔

''باؤ جی' یہ تو خراب ہے۔''

لالہ جی نے دھوئیں سے کالی چمنی کی طرف دیکھا اور لالٹین کیل سے جا کر ٹکا آئے۔ جب وہ اپنے کمرے میں آئے تو لگا جیسے اُس لالٹین کے ساتھ اپنا بہت کچھ اُس کاٹھ کباڑ میں چھوڑ آئے ہیں۔

نریندر کے کمرے میں بہو کی چوڑیاں نغمے جگا رہی تھیں۔ لالہ جی نے جیسے کھینچ کر خود کو اپنے گرد بھرے اندر سے نکالا۔ جلدی جلدی کچن میں گئے۔ خالی بوتلیں اور ٹوکری لی اور ملک بوتھ کی طرف روانہ ہو گئے —— واپس آئے تو بیٹے کے کمرے سے وہی چوڑیوں کی جھنکار اور دبی دبی ہنسی کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ لالہ جی نے حسرت اور دُکھ سے لاجونتی کی سوکھی' کمزور کلائیوں کو دیکھا —— بائیں کلائی میں ایک پتلی سی طلائی چوڑی کہنی تک چلی گئی تھی۔ بارہ چوڑیاں ہوا کرتی تھیں ان کلائیوں میں لالہ جی کو یاد آیا۔ لاکٹ' ہار' چین' جھمکے' بالیاں' ٹاپس الگ —— پہلی بیٹی کا بیاہ ہوا تو چار چوڑیاں' ہار اور دو انگوٹھیاں سنار کی کٹھائی میں پگھل گئیں —— دوسری بیٹی کی شادی پر چار چوڑیاں لاکٹ اور جھمکے گئے۔ نریندر کا گھر بسا تو تین چوڑیاں' بالیاں اور ایک چین گئی —— رہ گئی یہ ایک چوڑی اور ٹاپس۔ نریندر تو یہ بھی مانگ چکا تھا۔ کہتا تھا راہل چین کے لیے ضد کر رہا ہے۔ لیکن لاجونتی نے سختی سے انکار کر دیا تھا —— ''یہ میرے سہاگ کی نشانی ہے۔ جیتے جی تو اتاروں گی نہیں۔ میرے مرے پر جو جی میں آئے کرنا۔''

بیٹے کے کمرے میں چوڑیاں کھنکتی رہیں۔ لالہ جی دبے پاؤں سیر کو نکل گئے۔

''پھر لیٹ آئے ہو —'' ان کے ساتھی ریٹائرڈ سب پوسٹ ماسٹر بیج ناتھ نے شکایت کی۔

تبھی ماسٹر جاگیری لعل بھی چھڑی ٹیکتے آ گئے۔

''لو اب یہ بھی دیر سے آنے لگے۔''

''بیج ناتھ' یار تو رہتا ہے اکیلا — ہم ہوئے ٹبر ٹور (خاندان) والے۔'' جاگری لعل ہنسا۔ ''دیر سویر تو ہو گی ہی۔''

گھاس پر ننگے پاؤں ٹہلنے اور بینچ پر بیٹھنے کے دوران کچھ ہنسی مذاق' کچھ گھریلو پریشانیوں' کچھ بیماریوں' دواؤں اور ملک میں پھیلی بدامنی' افراتفری اور نئی نسل کی باتیں ہوتیں۔ ہر کسی کے پاس کچھ شکائتیں تھیں۔ کچھ حسرتیں اور خواہشیں تھیں۔ ان سے پیدا ہونے والی مایوسیاں تھیں۔ بے بسی کی زندگی اور زندگی کی بے بسی ماسٹر جاگیری لعل روز کہتا کہ وہ ہردوار جا کر کسی وردھ آشرم میں شامل ہو جائے گا لیکن ہر صبح پارک میں پہنچ جاتا۔ بیج ناتھ سادھو ہو جانے کی بات کرتا۔ لیکن سب سے پہلے پارک میں آ جاتا۔ بشن داس' گھاسی رام' کشوری سب کے پاس حالات سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ تھا۔ اس پر عمل کرنے کی ہمت اور سکت شاید نہیں تھی۔ لالہ جی سب کی سنتے اور چپ رہتے۔

لالہ جی سیر سے لوٹے تو لاجونتی جاگ چکی تھی اور ہاتھوں کی انگلیاں سیدھی کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''درد کم ہوا کچھ؟'' لالہ جی نے بیوی کے جھریوں زدہ چہرے پر کرب کے آثار دیکھ لیے

تھے۔ پھر بھی جیسے عادتاً پوچھ لیا تھا۔ ''نئی دوا کا بھی اثر نہیں ہو رہا — میں نے کہیں پڑھا تھا رشی کیش میں ایک آشرم ہے جہاں کسرت' بھاپ اور جڑی بوٹیوں سے گنٹھیا کا علاج کرتے ہیں۔ چار' چھ ہفتہ رہنا پڑتا ہے وہاں۔''

''چھوڑو' کہاں کہاں لیے پھرو گے مجھ اپاہج کو۔ ہو جاؤں گی ٹھیک۔ آج دوا لے آنا ختم ہوگئی ہے۔''

لالہ جی نے بیوی کی طرف دیکھا۔ کتنی برداشت کی شکتی ہے اس کمزور بیمار عورت میں — نہ کبھی کچھ مانگا نہ گلہ کیا۔ ہر حال میں خوش رہی۔ جو کچھ آس پاس تھا اس گھر کو دے دیا۔ اپنی خوشیاں صحت' اپنے سپنے — وہ جانتے تھے کہ ہومیو پیتھک فری ڈسپنسری کی دواؤں سے افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ جرمن دوا لے آؤ۔ بازار گئے تو پتا چلا کہ چھوٹی سی شیشی ستر روپے کی تھی چپ چاپ دکان سے نکل آئے۔ تب انہوں نے سوچا تھا کاش انہیں سرکاری نوکری مل گئی ہوتی۔ پنشن تو آتی گھر میں۔ وہ ہنس دیئے — جاگیر لال کو تو ملتی ہے پنشن۔ سارے پیسے بیٹا بہو رکھ لیتے ہیں وہ پارک کی بینچ پر بیٹھ کر ہنس کر کہتا — ''یہ دیکھو تارا چند۔ میری ہتھیلی میں چھید ہے۔ اس ہاتھ میں پیسہ ٹک نہیں سکتا۔ کیرو بھی یہی کہتا ہے۔ آج کل میں کیرو کو پڑھ رہا ہوں — کبھی پیسہ ٹکا ہی نہیں۔ بچے چھوٹے تھے تب اُن کے لیے تھا۔ بڑے ہوئے تب ان کے لیے ہے — لالہ جی جاگیر لال کی نہیں اپنی ہتھیلیاں دیکھنے لگتے پتہ نہیں ان جیسے کروڑوں لوگوں کی ہتھیلیوں میں چھید کیوں ہوتے ہیں — پرماتما بھی عجیب چیز ہے غریب کی چھت اور ہتھیلیاں دونوں ٹپکتی رہتی ہیں۔

''میں نریندر سے بات کروں گا۔'' لالہ جی کو بیوی کے علاج کی فکر ہوئی۔

''نہیں تمہیں میری سوگندھ' میری مری کا منہ دیکھو۔ اگر نریندر سے کچھ کہو۔''

''اور پھر کس سے کہوں۔ ہم نے کیا چھپا کے رکھا ہے اور اولاد سے۔ جو کمایا اس پر خرچ کر دیا' اب۔''

''احسان نہیں کیا اُن پر ہمارا فرض تھا۔''

''بیٹے کا کوئی فرض نہیں؟''

''سب کچھ تو کر رہا ہے۔ لاکھوں سے اچھا ہے۔ نالائق ہوتا تو سڑک پر بٹھا دیتا۔ کچھ مت کہنا اُس سے' وہ بہت پریشان ہے ان دنوں ابھی کل ہی بہو سے جھگڑ رہا تھا۔ راہل کے اسکول والوں نے تین ہزار روپیہ مانگ لیا۔ فیس فنڈز اور نہ جانے کیا کیا۔''

''تین ہزار۔'' لالہ جی جیسے اچھل پڑے۔ ''تو ایسے اسکول میں پڑھاتے کیوں ہیں بچے کو —''

لالہ جی ناراضگی سے بولے۔ انہیں غصے میں شاید اس کا احساس نہیں رہا تھا کہ ان کا لہجہ

سخت اور آواز اونچی ہوگئی تھی۔۔۔ "یہ اسکول ہیں کہ دکانیں۔ کیا بنے گا اس دیش کا۔ تعلیم کو بھی کاروبار بنالیا ہے۔ لعنت ہو۔"

"آہستہ بولو۔" لاجونتی نے آواز دبا کر کہا۔ "بہو سنے گی تو برا مانے گی۔ کل سے منہ پھلائے ہے۔ جیسے لوگوں میں رہنا ہو ویسے ہی طور طریقے اپنانے پڑتے ہیں۔ چاہے اپنا دم نکل جائے۔

"ایسا ہی ہے۔"

"کیا ایسا ہی ہے! اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو دوسروں کے سر منڈھنا اچھا نہیں ہوتا۔ سماج کیا آدمی سے کوئی الگ چیز ہے۔"

"دکھی مت ہوا کرو۔ ذرا ذرا سی بات پر۔۔۔" لاجونتی نے تحمل سے سمجھایا۔ "ہم نے ہی بھگوان سے اولاد مانگی تھی۔۔۔ ان کے بیاہ شادیوں کی منتیں مانگیں۔۔۔" جیسے کچھ سوچ کر بولی۔ پانی ہمیشہ ڈھلوان کی طرف ہی بہتا ہے۔ دھواں اٹھتا ہے اوپر کی طرف۔"

لالہ جی نے بیوی کی طرف دیکھا "کیسی سیانی باتیں کرنے لگی ہے۔ انہوں نے سوچا اور کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے۔ ایک چڑا گھاس میں پڑی پھٹی بوری میں چونچ مار کر ریشے نکال رہا تھا۔ کچھ ریشے وہ چونچ میں لے کر اڑ گیا۔ پھر آ گیا۔ پھر وہی عمل دہرایا۔۔۔ وہ اپنے کام میں مگن رہا۔۔۔ لالہ جی آپ ہی آپ ہنسے۔ بے وقوف۔

"کسے کہہ رہے ہو بے وقوف؟" بیوی نے پوچھا۔

لالہ جی چپ رہے۔ انہیں لگا۔ یہ ساری زندگی ہی ایک بے وقوفی ہے۔

"نہاؤ گے نہیں آج۔" بیوی نے پھر کہا۔

لالہ جی تولیہ سے کر غسل خانے کی طرف چلے گئے۔ پچھلے برآمدے میں نریندر مونڈھے پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اُس کا تولیہ غسل خانے میں کھونٹی سے لٹک رہا تھا۔ باپ کو دیکھ کر جھٹ سے بولا:

"باؤ جی پہلے مجھے نہا لینے دیں۔"

"لالہ جی وہیں رُک گئے۔ نریندر اخبار مونڈھے پر پھینک کر غسل خانے میں گھس گیا۔

لالہ جی نے اخبار کی طرف دیکھا۔ اٹھایا نہیں۔ انہوں نے اخبار پڑھنا اسی دن چھوڑ دیا تھا جس دن نریندر ان سے دودھ لانے کے لیے کہہ کر اخبار لیے چلا گیا تھا۔۔۔ ہوتا کیا ہے اخبار میں۔ بڑھا چڑھا کر لکھی گئی خبریں اور جھوٹے اشتہار۔۔۔

لالہ جی کچے پر اتر گئے۔ انہیں لگا جیسے وہاں کسی چیز کی کمی ہوگئی ہو۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مہندی کا وہ بوٹا نہیں تھا جو کچھ سال پیشتر لاجونتی نے لگایا تھا۔۔۔ اُسے بالوں کے لیے کالی

مہندی کی ضرورت رہتی تھی — اب وہاں گہرا گڑھا تھا۔
وہ آگے بڑھ کر اس گڑھے میں جھانکنے لگے۔ پیچھے سے بہو کی کھلی کھلی سی آواز سنائی دی۔
''باؤ جی' کچھ کھو گیا ہے کیا؟''
''ہاں — نہیں — '' وہ ہنس دیئے۔''
''میں یہاں سیڈلیس نیبو لگواؤں گی۔ گھر میں کام آئیں گے۔''
''ہاں' ٹھیک ہے۔'' لالہ جی نے کہا — ''اچھا کیا۔''
بہو اپنا فیصلہ سنا کر دوبارہ کچن میں چلی گئی۔ لالہ جی نے سوچا۔ لاجونتی کو بالوں کے لیے مہندی کی ضرورت ہے۔ بہو کو نیبو چاہئیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔
نریندر نہا کر نکلا تو راہل بھاگ کر غسل خانے میں چلا گیا۔
''پہلے میں دادا جی۔''
''بہت شیطان ہو گیا ہے۔ بہو نے کچن میں سے کہا۔
لالہ جی گڑھے میں دیکھتے رہے۔ کیا فرق پڑتا ہے — انہیں کہیں جانا تو ہے نہیں — لیکن کسی نے جیسے اُن کے سینے میں چٹکی سی لی — تارا چند تمہیں ہر بات میں پیچھے دھکیلا جا رہا ہے تم پیچھے کیوں ہٹتے جا رہے ہو۔ مزاحمت کیوں نہیں کرتے۔ آخر گھر تو تمہارا ہے۔ خاندان کے بڑے تو آج بھی تم ہی ہو۔ انہیں لگا جیسے گڑھے میں سانپ ہو۔ وہ بیٹھ کر غور سے دیکھنے لگے۔ کینچوا تھا۔
نریندر دفتر چلا گیا۔ راہل اسکول چلا گیا۔ مدھو مارکیٹ چلی گئی۔ گھر میں جیسے سناٹا رہ گیا۔ باہر اب چڑیاں بھی نہیں تھیں کچھ کوے تھے۔ آسمان پر چیلیں اور گدھ اُڑ رہے تھے۔ شاید کسی جانور کی لاش پڑی ہو — لالہ جی پر پھر وہی بے بسی کا دورہ سا پڑا — وہ دیر تک برآمدے میں سیڑھیوں پر بیٹھے آسمان میں اڑتی ہوئی چیلوں اور گدھوں کو دیکھتے رہے۔ پھر انہیں خیال آیا کہ چل کر بیوی کے پاس بیٹھیں۔

وہ اندر جا کر اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گئے۔ بیوی کو دیکھ کر انہیں بگھاری میں لٹکی لالٹین یاد آ گئی۔ دل میں جیسے کسی خونی درندے نے تیز پنجے گاڑ دیئے۔ میز سے دردناشک تیل کی شیشی اٹھائی۔
''تیل مل دوں۔''
''آج تاش کھیلنے نہیں جاؤ گے؟''
''نہیں۔''
''چلے جاؤ۔ وہ لوگ بھی انتظار کرتے ہوں گے۔ تمہارا بھی دل بہل جائے گا۔''
لالہ جی نے کچھ کہا نہیں۔ بیوی کی انگلیوں پر تیل کی مالش کرنے لگے۔ ان ہاتھوں نے ہمیشہ انہیں سہارا دیا تھا — انہوں نے سوچا اور ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

رات کو کھانے کے بعد نریندر اور بہو ان کے پاس آ بیٹھے۔ راہل ہوم ورک کرنے کے بعد اپنا کیرم بورڈ اٹھا لایا تھا اور اب اس پر پاؤڈر چھڑکنے کے بعد گوٹیاں سجا رہا تھا۔ پھر وہ ماں اور باپ کو پکارنے لگا۔

''مجھے نہیں آتا— '' نریندر نے کہا: ''دادا جی بہت اچھا کھیلتے ہیں۔''

بہو ہنس دی۔

''کیوں جھوٹ بولتا ہے رے۔ سب سے پہلے تو تو ہی لایا کیرم بورڈ۔ پیچھے ہی پڑ گیا تھا باپ کے۔ لا کر ہی چین ہوا۔ سارا سارا دن دوستوں کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا۔ جا کھیل اب بیٹے کے ساتھ بھی۔''

''نہیں ماں۔ باؤ جی اچھا کھیلتے ہیں۔'' وہ پھر ہنسا۔

ماحول سازگار پا کر لالہ جی نے کہا۔

''نریندر' رشی کیش میں ایک یوگ آشرم ہے وہاں گنٹھیا کا علاج کرتے ہیں۔ کسرت' بھاپ اور دیسی دواؤں سے۔ چار چھ ہفتہ وہاں رہنا پڑتا ہے۔ میں چاہتا ہوں تیری ماں کو وہاں لے جاؤں۔''

نریندر ایک دم جیسے ہنسنا بھول گیا۔ بہو بھی سنجیدہ ہوگئی تھی۔ نریندر نے مدھو کی طرف دیکھا اور گمبھیرتا سے انگریزی میں بولا۔

''جیسی آپ کی مرضی۔ لیکن گنٹھیا لاعلاج مرض ہے۔ بلاوجہ خراب ہوکر آ جائیں گے۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ سوچ لیجئے۔ میں نے ایک ڈاکٹر سے بات کی تھی۔ وہ کہتا ہے ہومیوپیتھک علاج جاری رکھو۔ دیر ضرور لگے گی— آگے آپ کی مرضی۔''

لالہ جی نے بیٹے کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ انہیں لگا۔ یہ ان کا بیٹا نہیں۔ کوئی سیاسی نیتا بول رہا ہے۔

''کیا گٹ پٹ کررہا ہے۔ باپ سے۔'' لاجونتی نے پوچھا۔ اُس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' لالہ جی نے کہا۔ ''ملک کی سیاسی حالت پر بات کررہا ہے۔''

''گھر میں یہ موئی سیاست نہ بگھارا کرو تم باپ بیٹے— اور تھوڑی باتیں ہیں کرنے کو۔''

''دادا جی آؤ نا۔'' راہل اتاولا ہو رہا تھا۔

لالہ جی یوں پوتے کے سامنے جا بیٹھے جیسے کرنے کو اب اور کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

دادا جی— آج میں نئی کہانی سنوں گا۔'' راہل نے سر اٹھا کر چلاتے ہوئے کہا۔

باؤ جی' اسے جن بھوتوں کی کہانیاں تو سنایئے گا نہیں۔ رات کو ڈرتا ہے۔'' بہو نے ہنس کر کہا۔

''آج میں اسے نیلم پری کی کہانی سناؤں گا۔''

''وہ تو آپ سنا چکے ہیں آج کوئی نئی والی۔''

نریندر اور مدھوسونے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد راہل کو بھی اباسیاں آنے لگیں۔

''سوجا اب۔'' دادی نے کہا۔

راہل دادا کو کھینچتا ہوا اپنے بستر پر لے گیا۔

''اچھا سنو — ایک تھا راج کمار — ''

یہ بھی پرانی ہے۔ نئی والی۔''

ایک تھا تاراچند — ''لالہ جی جیسے کچھ سوچنے لگے۔

''پھر — ؟'' راہل نے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔ ''یہ تو آپ کا نام ہے دادا جی۔''

''پھر — ''لالہ جی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے — پھر — ؟

❀ ❀ ❀

شفق

چٹکی بھر زندگی

شاید رات کا پچھلا پہر تھا جب میری آنکھیں کھل گئیں۔

نیم غنودہ ذہن نے گھر میں پراسراری ہلچل محسوس کی تیز تیز قدموں کی آوازیں' پرتشویش انداز میں باتیں کرنے کی آوازیں' مگر آواز دھیمی رہتی اس لیے باتیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں' کبھی کبھی آواز کا حجم بڑھ جاتا' کتنی دیر ہوگئی' میں نے پرانا کپڑا مانگا تھا' تمہیں تو وقت پر کوئی چیز ملتی ہی نہیں...... خدا غارت کرے بجلی کو بھی ابھی فیل ہونا تھا۔ لالٹین تیز کرو' روشنی ادھر دکھاؤ۔

میں کچھ دیر تک منتظر رہا کہ کوئی میرے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر بتائے گا کہ......مگر دیر ہوگئی تو میں نے سر جھٹک کر کروٹ بدل لی۔

ممکن ہے نیند خراب ہونے کے خیال سے کسی نے مجھے نہ جگایا ہو' اب جو ہوگا دیکھا جائے گا مگر نیند کی گہرائیوں میں ڈوبتے ذہن میں تشویش اور ناامیدی کی ہلکی سی لہر ضرور تھی' خوشی کی بات ہوتی' تو کیا نیند خراب ہونے کی پرواہ کی جاتی......؟

صبح جب غسل خانے کی طرف جارہا تھا' ماں اور بہنوں کی نظروں میں ہمدردی اور تاسف دیکھ کر میرے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا' حالانکہ میں نے ہونے والے حادثے کو پہلے سے ذہن میں رکھ کر اپنا دل مضبوط کرلیا تھا مگر یہ کیسا دھچکہ تھا جس نے عمارت کی نیو ہلا دی' کوئی اَن دیکھا ہاتھ میرے دل تک پہنچ گیا اور کلیجہ مسل رہا تھا۔ مسلے جارہا تھا۔

غسل کے دوران سرد پانی نے جذبات کو سرد نہیں کیا بلکہ نفرت کی مورتی دُھل کر اور صاف ہوگئی کیا محرومیاں اور ناکامیاں ہی میرا مقدر ہیں؟ کیا میں نئے عہد کا پیغمبر ہوں اور خدا نے اپنی آزمائشوں کے لیے میرا انتخاب کرلیا ہے؟ میں بچپن سے اپنی ہر خواہش کا گلا گھوٹتا رہا' اپنے ارمانوں کو اپنے ہاتھوں کفن پہنا کر مفلسی کی قبر میں سلاتا رہا' ملازمت ملی تو شادی ہوگئی اور گنتی کے کھٹے میٹھے دن بیتے کہ ایک بچی کا باپ بن گیا۔

''سنئے جی'' بیوی نے سویٹر بنتے ہوئے مخاطب کیا' خدا نے جو دیا اس کا کیا شکوہ مگر زمانہ خراب ہوگیا ہے' ہمیں ابھی سے بچی کے لیے ہر ماہ کچھ نہ کچھ......

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر اپنی پھول سی بچی کو دیکھا' پیار سے اس کے گالوں پر انگلیاں پھیریں۔ میری بیٹی' ساری زندگی کی جدوجہد کے بعد خدا نے اس لائق بنایا تھا کہ اپنی تشنہ آرزوؤں اور تمناؤں میں رنگ آمیزی کرتا مگر تم...... پر ابھی سے فکر کا سایہ پڑ گیا' تمہاری ماں بھی غلط نہیں کہتی' میری نظروں میں کتنے چہرے ہیں جو بیٹی کی شادی کے لیے پریشان ہیں' رشتوں کے لیے کیا کیا جتن نہیں کیے جاتے' خدا نے عجیب قانون بنایا ہے' وہ بیٹی جو جان سے زیادہ عزیز ہوتی ہے' اسے دوسروں کو منتوں' اور خوشامدوں اور قربانیوں کے ساتھ سونپ دیا جاتا ہے اور تماشا یہ کہ دوسرا مفت لینے کو تیار نہیں' کیا لڑکی دنیا کی سب سے حقیر شے ہے؟

آپ کیا سوچنے لگے' بیوی نے ٹوکا' میری بات پر دھیان دیجئے۔

جب میں غسل خانے سے باہر نکلا تو ماں ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے کہہ رہی تھی۔ بالکل گڑیا جیسی ہے تمہاری یہ بیٹی' بہو کو دیکھو' بیٹی کا سنتے ہی رونے لگی' ماں کے لیے سب اولاد برابر ہوتی ہے' خدا نے اس بار بھی بیٹا نہیں دیا تو اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔

میرا جی چاہا' میں اپنے بال مٹھیوں میں جکڑوں' نہیں چاہیے مجھے یہ بیٹی' نہیں چاہیے خدا کی مصلحت' مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے عفریت لپٹ گئے ہیں' نوچ نوچ کر میرا گوشت کھا رہے ہیں' خون پی رہے ہیں' اب میں انہیں اور نہیں کھلا سکتا' واپس لے لے خدا اپنی امانت میں اس کا اہل نہیں ہوں...... میں نے بڑی مشکل سے اپنی وحشت پر قابو پایا' میرے ہاتھ بے اختیار تولیے سے بال رگڑے جا رہے تھے۔

ماں میری اضطراری کیفیت اور چہرے سے میرے دل کا حال سمجھ گئی تھی اس نے بڑی نرمی سے سمجھایا بیٹے' تم بے وجہ پریشان ہو اس گھر کی بیٹیاں بڑی آسانی سے اٹھ جاتی ہیں' سوچو تمہاری چار بہنیں ہیں اور تمہارے والد کی اوقات کیا تھی' تم تو خدا کے فضل سے بہت اچھے ہو جس خدا نے تمہیں اس مقام پر پہنچایا ہے وہی تمہاری مشکلات بھی حل کرے گا۔

میں نے ماں کی باتوں کی تردید نہیں کی' میری کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی بے چینی اضطراب اور تھکن میں ماں کو اپنی دلی کیفیات نہیں بتا سکتا تھا وہ پریشانیاں یاد دلانا نہیں چاہتا تھا جو بہنوں کی شادی کے وقت پیش آئی تھیں۔ میں ایسا جواری تھا جو آخری بازی بھی ہار گیا۔ ان چار بیٹیوں کے بعد مزید آزمائش کی گنجائش نہیں اگر پانچویں بھی بیٹی ہوگئی تو؟ اسی انتظار نے تو یہ دن دکھایا اب یہ فیصلہ ہوگیا کہ میرے یہاں بیٹا نہ ہوگا' کوئی میرا سہارا نہ ہوگا' جب بیٹیاں اپنے گھر چلی جائیں گی تو ہم دونوں بوڑھے بوڑھیا دن رات دروازہ تکیں گے' کوئی آہٹ کوئی آواز' کوئی نہیں آئے گا کہ یہاں آنے والا پیدا ہی نہیں ہوا۔

آپ بے وجہ پریشان ہیں' پروفیسر شمیم نے سمجھایا' کیا آپ یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ بیٹا

ہو جاتا تو آپ دونوں دروازہ نہ تکتے؟ میں اپنے والدین کا سعادت مند بیٹا رہا ہوں۔

پھر کیا آپ نے اپنے بعد کی جنریشن پر غور کیا ہے' میں قدیم ہوں' آپ قدیم اور جدید کا امتزاج ہیں اور یہ صرف جدید ان کی نظروں میں پرانی قدروں کی کوئی اہمیت نہیں' پھر آپ کا بیٹا جدید ترین ہوتا میں تو تیسری نسل سے ہی مایوس ہوں اور آپ چوتھی سے آس لگائے بیٹھے ہیں۔ آفس جانے کو دل نہیں چاہتا تھا مگر یہ سوچ کر کہ وہاں ذہن بٹ جائے گا آفس کے لیے روانہ ہوا تو راستے میں ساجد مل گیا۔

مبارک ہو بھئی' سنا ہے تمہیں پرموشن ملا ہے اب تو اس پھٹیچر سائیکل کا پیچھا چھوڑ کر اسکوٹر لے لو سیکشن آفیسر کو یہ سائیکل زیب نہیں دیتی۔

اسکوٹر — میں تلخی سے مسکرایا۔ جب سائیکل سے کام چل ہی رہا ہے تو جلدی کیا ہے' لے لیں گے۔ اسکوٹر بھی' تم سناؤ ہفتوں بعد نظر آئے ہو کہاں رہے۔

ساجد کے ہونٹوں کی مسکراہٹ غائب ہوگئی' بہن کے رشتے کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہوں ایک جگہ بات چل رہی ہے' لڑکا اچھا ہے مگر جہیز کے علاوہ کیش پچاس ہزار مانگ رہے ہیں۔

جب ابھی لڑکے کی قیمت پچاس ہزار پہنچ گئی ہے تو جب ثمن جوان ہوگی تو؟ میں نے محسوس کیا کہ میرے بال کھچڑی ہو گئے ہیں' آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی ہے اور ایک شخص بے رحمانہ لاپروائی سے کہہ رہا ہے۔ سنئے جناب کم از کم ایک لاکھ روپے نقد اور جہیز کی جو چیزیں ہیں' وی سی آر' فریج' صوفے اور ماروتی کار...... کم سے کم پندرہ تولہ سونا......

اچھا ساجد دفتر کا وقت ہو رہا ہے پھر ملاقات ہوگی خدا تمہاری مشکل آسان کرے۔

سائیکل واقعی تکلیف دہ ہوگئی ہے مگر ساجد کو کیسے بتاتا کہ دو بار اسکوٹر کے لیے روپے جمع کیے مگر عین وقت پر خیال آیا' اسکوٹر صرف میرے کام آئے گا اگر اسے فکسڈ ڈیپازٹ میں ڈال دوں تو؟

دفتر میں بھی دل نہیں لگا' کھلی ہوئی فائل کے صفحات پر چہرے ناچنے لگتے۔

سنتے ہیں جی' میرا دل بہت ڈر رہا ہے اگر اس بار بھی بیٹی ہوگئی تو؟

بیٹا ہوگا تو ساس بن کر ایک بے قصور سے اپنا بدلہ چکاؤں گی۔

آپ تو ہر بات کا مذاق بنا دیتے ہیں' آپ کو کیا پتہ دوسروں کا بیٹا دیکھ کر میں کتنے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہوں' نہ جانے خدا ہمیں کس گناہ کی سزا دے رہا ہے۔

گناہ تم نے کیا ہوگا' میں تو معصوم فرشتہ ہوں۔

ہونہہ بڑے آئے معصوم فرشتہ' جیسے میں کچھ جانتی ہی نہیں۔

اس بار چاہے بیٹا ہو یا بیٹی' میں چار سے زیادہ کا متحمل نہ ہوسکوں گا اور یہ نمبر چار بھی کیا

توازن نہ بگاڑ دے گا' سمن اور صادقہ ایک ساتھ ہوجاتی ہیں اور ہم تم شانی کے ساتھ' اب یہ سکھ بھی چھن جائے گا۔ بیوی کا چہرہ ہلکا گلابی ہوگیا تھا۔

فائل میں کوئی خاص بات ہے کمال صاحب' بہت دیر سے پڑھ رہے ہیں' کسی کی آواز سن کر میں چونک پڑا' گھبرائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھا' بیشتر نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اور ان آنکھوں میں ترحم تھا' میں نے تو کسی کو بھی نہیں بتایا پھر انہیں کیسے معلوم ہوا یا یہ میرے پژمردہ دل کا فریب ہے اور میں ہی خود کو قابل رحم سمجھ رہا ہوں۔

گھڑی پر نظر گئی تو خیال آیا بیٹیاں اسکول سے واپس آ گئی ہوں گی مگر آج اسکول جاتے وقت کسی نے مجھ سے پیسہ نہیں مانگا تھا صرف کمرے کے سامنے سے کئی بار گزری تھیں' نہ جانے ٹفن باکس بھی لیا تھا یا نہیں...... میں نے جلدی جلدی کام ختم کیا۔

گھر پہنچا تو بیٹیاں اسکول سے آ چکی تھیں مگر کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی کوئی میرے پاس نہیں آیا حالانکہ ان کا روز کا معمول تھا وہ مجھے اسکول کی ذرا ذرا سی باتیں بتاتی تھیں' آج کسی نے ہوم ورک نہیں کیا تھا اس کی پٹائی ہوئی' کس کی کتاب گم ہوئی' سسٹر نے کیا کہا وغیرہ۔

میں نے سمن کو پکارا تو وہ ڈرتے ڈرتے میرے پاس آئی۔ پاپا آپ ناراض ہیں؟

میں دھک سے ہوگیا' کیوں گڑیا میں کیوں ناراض ہونے لگا۔

ہمارے ایک اور بہن جو آئی ہے' سچ پاپا ہمیں بھی بہت ارمان تھا کہ ہمارے ایک بھائی ہوتا ہم سے لڑتا جھگڑتا کاپیاں پھاڑتا کھلونے توڑتا۔

میں نے کھینچ کر بیٹی کو سینے سے لگا لیا' میرا دل بھرایا جا رہا تھا' ان معصوم بچیوں کو بھی میری محرومی کا احساس ہوگیا' انہیں ایک بھائی کی کمی ساری زندگی کھٹکتی رہے گی' انہیں ایک بھائی ملنا ہی چاہیے مگر کیسے......؟ چار سے زیادہ کا بوجھ...... چار سے زیادہ...... کتنا اچھا ہوتا نوزائیدہ مر جاتی......

اگر نوزائیدہ مر جاتی تو...... میں نے سمن کو اپنے سے الگ کیا' اس کا گال تھپتھپایا پیسہ دیا اور وہ خوش خوش باہر بھاگ گئی تو میں نے سوچا' اگر نوزائیدہ مر جاتی تو مجھے کوئی افسوس نہ ہوتا' مرنے کا افسوس تو پالتو جانور کا بھی ہوتا ہے مگر ابھی یہ پالتو کہاں ہے ابھی تو صرف گوشت کا لوتھڑا ہے۔ گنتی کم ہوجاتی تو ایک چانس لیا جا سکتا تھا۔

مگر یہ گناہ ہوگا۔ ضمیر نے ملامت کیا تو میں نے اسے جھڑک دیا۔ اس سے بڑا گناہ تو یہ ہے کہ میں اسے بہتر زندگی اور زندگی کی آسائش نہ دے سکوں گا اور خود بھی بوجھ تلے دبتا چلا جاؤں گا' نہ جانے کتنی بار ہم دونوں خودکشیاں کریں گے' ایک زندگی دوہرا قتل ہے ایک قتل دوہری زندگی ہوگی مگر کیا بیوی اس قتل کی اجازت دے گی؟ چلتی ہوئی گاڑی میں بریک لگ گیا' نہیں کبھی نہیں' اگر اسے معلوم ہوگیا تو وہ مجھے قاتل سمجھ کر ساری زندگی مجھ سے نفرت کرے گی پھر پھر......

دفعتاً ماں کا وہ جملہ یاد آیا جو بہت غصہ ہونے پر کہتی تھی' اگر میں جانتی تو پیدا ہوتے ہی نمک چٹا دیتی۔نمک — میری آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں' میں نے نمک دان ہاتھ میں اٹھالیا' مجھے کیا معلوم تھا کہ تم میرا کھانا ہی نہیں میری زندگی بھی مزے دار بنانے کی طاقت رکھتے ہو کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا۔ میں نے تھوڑا سا نمک اپنی جیب میں ڈال لیا۔

جب ماں نے بچی دیکھنے کو کہا تو میں دھڑکتے دل کے ساتھ بیوی کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ بیوی کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ پگلی تم رو رہی ہو' میں نے پلنگ کی پٹی پر بیٹھ کر اس کے آنسو پونچھے' اتنا غم کرو گی تو تمہاری صحت خراب ہوجائے گی' اب قدرت کے کام میں ہمارا کیا دخل' میں نے اسے سمجھایا تو وہ میرے شانے پر سر رکھ کر رونے لگی۔

کیا دنیا کے سب سے بڑے گنہگار ہم ہی ہیں کہ بیٹے کی دولت سے محروم رہ گئے' میں نے خدا سے کتنی دعا کی تھی کتنی منتیں مانی تھی مگر......

وہ نہ جانے کیا کیا کہتی رہی' میرا ذہن کہیں اور تھا۔ میں نے بچی پر پڑا ہوا تولیہ ہٹا دیا۔

گلابی رنگ کا پھول اپنے اوپر گزرنے والی حادثے سے بے خبر سو رہا تھا۔ میں نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی بائیں ہاتھ کی انگلی جیب میں نمک پر رکھ دی اور میرا داہنا ہاتھ بچی کے بدن پر پھرنے لگا۔ کول لمس نے میری رگوں میں سنسنی سی دوڑا دی تھی' میرے اندر بادل گرج رہے' بجلی چمک رہی تھی بارش ہو رہی تھی۔

میں نے بیوی کی طرف دیکھا' وہ دوسری طرف منہ پھیرے آنسو پونچھ رہی تھی' میں نے احتیاط سے بائیں انگلی جیب سے نکالی اور بچی پر اس طرح جھک گیا کہ بیوی میری کارروائی نہ دیکھ سکے۔

ابھی میری انگلی بچی کے ہونٹوں کے پاس پہنچی ہی تھی کہ اس نے آنکھیں کھول دیں۔

دنیا کی آلودگی سے پاک جیسے دو کنول کھل گئے' مجھے لگا وہ معصوم اور پاکیزہ آنکھیں مجھ سے پوچھ رہی ہیں۔ پاپا میرا قصور کیا ہے؟ پھر نہ جانے کیسے ہوا کہ میں بچی کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ میری بیٹی' میری جان۔

❁ ❁ ❁

انیس رفیع

اب وہ اترنے والا ہے

اب وہ اترنے ہی والا ہے—
آپ سب قطار میں کھڑے ہو جائیں—
—اس کے اترنے کی علامتیں دھیرے دھیرے واضح ہوتی جارہی ہیں۔
اب مزید گزارش کی گنجائش مفقود ہے—
دوڑ کر!
رینگ کر!
گھسٹ کر!
کسی بھی طرح، بنائی گئی سیدھی لکیر پر کھڑے ہو جائیں—!

موقع—

امید کہ آپ سب قطار میں کھڑے ہوں گے۔ جس خط پر آپ کھڑے ہیں وہاں سے گردن اٹھا کر دیکھئے۔

آسمان کی طرف۔

جی ہاں! آسمان کی طرف۔ وہ چوٹی آپ کو صاف صاف دکھائی پڑنی ہی چاہیے کیونکہ کل کی بدلیاں اب آسمان کو خالی کر چکی ہیں۔ اور وہاں سے اترنے والا بے حد خوش ہے۔ اور اب وہ خوشی آپ پر بھی اترنے والی ہے۔

آپ اپنے ہونٹوں کو مسکراہٹ کے لیے تیار رکھیں۔
تیار......رکھیں......
رکھیں......تیار......تیار......رکھیں......رکھیں......

اب وہ اترنے ہی والا ہے۔ خبر ہے کہ وہ پہلا قدم اٹھا چکا ہے۔

مگر آپ کی سرگوشیوں سے اندازہ ہو رہا ہے کہ آپ لوگ خبر دار نہیں ہیں۔ اترنے والا آپ سب کو اور چوکنا دیکھنا چاہتا ہے۔ صف ٹیڑھی میڑھی ہے جیسے ہر قطار خط مستقیم پر نہیں بلکہ خط منحنی

پر کھڑی ہو۔ صف سیدھی کرلیں۔ کرلیں۔ صف سیدھی۔

اب وہ اترنے ہی والا ہے۔ خبر ہے کہ وہ کئی قدم اٹھا چکا ہے۔ لگتا ہے آپ لوگوں نے صفیں سیدھی کرلی ہیں۔ اب اپنے بدن کے ہر عضو کو اچھی طرح ٹٹول کر تشفی کرلیں کہ سب ٹھیک ہیں۔ کوئی بھی معطل اور ناکارہ نہیں۔ اترنے والا کچھ بھی طلب کرسکتا ہے۔ اس مسکراہٹ کے عوض جو آپ کو ملنے ہی والی ہے۔

ہاں! ایک بار آپ کو پھر یاد دلا دوں۔ آپ سب اپنے ہونٹوں کو مسکراہٹ کے لیے تیار رکھیں۔ ضرورت ہو تو دو چار بار ریہرسل بھی کرلیں تاکہ عین موقع پر آپ کو کف افسوس نہ ملنا پڑے۔ احتیاطاً ایک بات اور بھی نوٹ فرمالیں۔ اترنے والے کی طرف سے جتنی بھی مسکراہٹ آپ کے حصے میں الاٹ ہو اس سے زیادہ مسکرانے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔

اب وہ اترنے ہی والا ہے۔ وہ بڑی تیزی سے قدم اٹھا رہا ہے۔

موقع —

کون ہو تم؟ کہاں سے بول رہے ہو؟
ہمارے تلووں کے نیچے یہ کیسی لکیریں سرسرا رہی ہیں؟
کیا یہ خطوط مستقیم — کون اترنے والا ہے؟

موقع ختم —

اب وہ اترنے ہی والا ہے۔ شور نہ کریں۔ وہ واپس بھی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ جس تیزی سے وہ نیچے اترتا ہے اس سے کہیں تیزی سے وہ اوپر کی طرف لوٹتا ہے۔

اور ایک ذرا صف میں کھڑے ہوگئے ہیں تو نقصان ہی کیا ہے۔ آپ تک مسکراہٹیں اسی لیے نہیں اترتیں کہ آپ سب بہت بے صبرے واقع ہوئے ہیں۔ یقین کیجئے آپ لوگ کسی داؤ پر نہیں چڑھائے گئے ہیں۔ بلکہ قطار بند کیے گئے ہیں۔ بس اتنی ہی دیر میں آپ کی ایڑیاں پگھلنے لگیں — بہر حال آپ کو قطار بند کرکے آپ کے صبر کا امتحان لینا مقصود نہیں۔ کیونکہ اترنے والا اگر آپ سے کچھ طلب کرے گا تو اس کے عوض مسکراہٹ کی تھیلیاں بھی تو پیش کرے گا۔ البتہ یہ سچ ہے کہ ہمیں بھی معلوم نہیں کہ وہ آپ سے کیا طلب کرے گا۔ لہٰذا آپ اپنے آپ کو ہر اعتبار سے حاضر رکھیں۔ اور اب تو معلوم ہونے والا ہی ہے کہ —

وہ اترنے ہی والا ہے سامنے کی پہاڑی پر اس کے قدم کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔

موقع —

لیکن وہ کیوں اتر رہا ہے؟
وہ کس کے لیے اتر رہا ہے؟

تم نے اسے کیوں اترنے پر مجبور کیا ہے؟
ہم لوگ مسکراہٹ لے کر کیا کریں گے؟

موقع ختم—

آپ کے سوالات بے حد فطری ہیں۔ مگر آپ کے سوالات اس وقت ختم ہو جائیں گے جب اترنے والا اتر آئے گا۔ بس اس کے اترنے کی دیر ہے۔ پھر آپ ایک ایک مسکراہٹ کے لیے سودا کرنے کو بے چین ہو جائیں گے — وہ دیکھو! وہ دیکھو! اترنے والا اتر آیا ہے۔
اب وہ پر کٹ ہو رہا ہے۔ ہونٹ مسکراہٹ کے لیے تیار رکھیں۔ وہ مسکراہٹ کی تھیلیوں سے لدا ہوا ہے۔ بولئے! چاہئے وہ تھیلی آپ کو؟ تیار ہیں آپ سب؟ یہ تھلیاں آپ لوگوں کو مل جائیں گی۔ یہ آپ ہی کے لیے ہیں۔ بس اس کے عوض وہ آپ سے کچھ طلب کرے گا۔ بولئے جلدی کیجئے! فوراً فیصلہ کریں! ورنہ وہ اگلی پہاڑی کی جانب نکل جائے گا۔ وہاں بھی لوگ اس کے منتظر ہیں۔ بڑا ہی نادر موقع ہے۔ اسے گنوانا عین حماقت ہے۔ بولیے۔ ایک۔ بولئے! دو۔
ہاں! ہاں! بولیے۔ آواز لگائیے! بول...... لیے۔

موقع—

ہاں! ہاں ہمیں وہ تھیلی چاہیے!
مسکراہٹ کے لیے ہمارے ہونٹ تیار ہیں!
شکریہ! اب اترنے والے سے گزارش ہے کہ آپ سامنے بنے ہوئے چندن کی لکڑی والے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو جائیں۔ لوگوں کی یہ قطار آپ کا سواگت کرتی ہے۔ ہم بیچ بیچ میں تالیاں پیٹنے اور جے جے کار کا اشارہ بھی کر چکے ہیں۔ نروس ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ آپ کو ان میں اپنی بات رکھنے کے لیے ان کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ پلیٹ فارم پر ایسے آلات موجود ہیں جو آپ کی بات ان تک لے جائیں گے۔ جے جے کار اور تالیوں کا شور آپ تک اپنے آپ ہی پہنچتا رہے گا۔ آپ کے اور ان کے بیچ ہم نے بہت ساری حفاظتی ریکھائیں کھینچ رکھی ہیں۔ اب آپ پلیٹ فارم پر تشریف لے آئیں۔ لوگ آپ کے منتظر ہیں۔ شکریہ — اب آپ اپنی باتیں رکھیں۔
''امید ہے کہ آپ سب میرے ہونٹوں پہ پھیلی ہوئی مسکراہٹ ضرور دیکھ رہے ہوں گے۔ ہمارا نصب العین مسکراہٹ ہے۔ ہمارے پاس مسکراہٹ کی تھیلیاں ہیں۔ ہم اپنی ساری تھیلیاں آپ میں بانٹ دیں گے مگر اس کے عوض آپ ہمیں اپنا ایک ایک بازو پیش کریں۔'' سب نے اپنے اپنے بازو پیش کیے۔ اترنے والا بازوؤں کو سمیٹ کر اوپر کو لوٹ گیا۔ مگر قطار میں کھڑے لوگوں کے ہونٹ مسکراہٹ کے لیے جس طرح تیار تھے۔ تیار ہی رہ گئے۔ اترنے والا کچھ دنوں بعد پھر اترا۔ اس نے کہا—

''آپ کے وہ بازو جو ہم لے گئے تھے ہمارے کسی کام نہ آئے۔ سڑ گئے۔ ہم نے انہیں پہاڑی کی دوسری طرف پھینک دیا۔ مسکراہٹ کی تھیلیاں اب بھی محفوظ ہیں۔ آپ سب ہمیں اپنی ایک ایک ٹانگ دے دیں۔'' مگر اس بار بھی مسکراہٹ کی تھیلیاں بند کی بند رہیں۔ کچھ دنوں بعد اترنے والا پھر اترا۔ اس نے قطار میں کھڑے لوگوں کو بتایا۔۔۔

آپ کی آنکھیں ہمارے لیے بے کار ثابت ہوئیں۔ انہیں بھی ہم نے پہاڑی کی دوسری طرف پھینک دیا۔ شاید آپ کی آنکھیں ہمارے کچھ کام کی ہوں۔ آپ سب اپنی اپنی آنکھیں ہمیں دے دیجئے۔''

سب نے اپنی اپنی آنکھیں پیش کر دیں۔ اترنے والا آنکھیں لے کر اوپر چڑھ گیا۔ تھیلی بند کی بند رہی۔ ہونٹ مسکراہٹ کے لیے بالکل تیار تھے۔۔۔ بالکل تیار۔۔۔ کہ شاید اس بار۔ اترنے والا ایک مدت بعد پھر اتر آیا۔ اس بار اس کے لہجے میں بڑی ہمدردی اور جملوں میں دکھ کی آمیزش تھی۔

''آپ سب نے ہماری طرف سے ملنے والی مسکراہٹ کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ آپ سب ہمارے سچے اور مخلص پرستار ہیں۔ یقین کیجئے ملنے والی مسکراہٹ ضرور ملے گی...... مگر اب جبکہ آپ اندھے لنگڑے اور نہتے ہو چکے ہیں اور اس قابل بھی نہیں رہے کہ قطار سے نکل کر اپنے حصے کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لے سکیں اور دوسروں کی مسکراہٹ دیکھ سکیں اس لیے آپ سے گزارش ہے کہ آپ سب اپنے ہونٹ ہمارے حوالے کر دیں ہم انہیں اوپر چوٹی پر لے جائیں گے اور اعلیٰ قسم کی مسکراہٹ ان پر منڈھ کر انہیں آپ کے پاس واپس بھیج دیں گے۔''

سب نے اپنے اپنے ہونٹ پیش کر دیئے۔ اترنے والا ہونٹوں کا قافلہ لے کر اوپر چڑھ گیا۔۔۔ اور پھر کبھی واپس نہیں آیا۔ اور ایک دن یہ اعلان۔۔۔

۔۔۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کی قوت سماعت بے حد وفادار ہے۔ آپ لوگوں نے برابر کہی جانے والی باتیں غور سے سنیں اور ان پر عمل کیا۔ لہٰذا آپ یہ جان لیں کہ اترنے والا اب کبھی نہیں اترے گا کہ آپ کے پاس مسکراہٹ کے لیے ہونٹ بھی نہیں رہے۔

''براہِ کرم آپ سب قطار توڑ دیں۔ جلدی کریں۔ بھیڑ نہ لگائیں!!!''

آخری موقع۔۔۔

گلزار

مائیکل اینجلو

فلورینس سے آئے' مائیکل اینجلو کو پھر پانچ سال ہو چلے تھے۔ وہ اوبھنے لگا تھا روم سے!
''روم میں چہرے نہیں ملتے۔ چہروں پہ کردار نہیں ملتے۔ سب ایک ہی سے لگتے ہیں۔'' اس نے پوپ جولیس ثانی سے کہا تھا۔

''میرے چہرے پر تمہیں کیا نظر آتا ہے؟'' جولیس نے پوچھا تھا۔

''ایک جلتی ہوئی موم بتی!''

جولیس ایک وقفے کے بعد مسکرا دیا۔ اینجلو کی کڑوی باتوں کا وہ عادی تھا: ''ہاں میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ ان ہزاروں بےصورت موم بتیوں میں جلتی ہوئی ایک موم بتی' جنہیں لوگ عبادت کے وقت گرجے کے آلٹر پر جلا جاتے ہیں۔''

اینجلو چپ رہا......

''حیرت ہے' خدا کی اتنی بڑی دنیا میں' ایک چہرہ دوسرے سے نہیں ملتا۔ اور تمہیں اپنی تصویروں کے لیے شکلیں نہیں ملتیں' ماڈل نہیں ملتے۔ اور چار مہینے سے تم یہودہ کے لیے......''

اس کی بات ادھوری رہ گئی اور اینجلو' سینٹ پیٹرز سے باہر چلا گیا۔

پوپ جولیس' اینجلو کے مزاج سے واقف تھا۔ یہ پانچواں سال تھا۔ پانچ سال سے اینجلو سینٹ پیٹرز کے سسٹین چیپل کے گنبد اور دیواروں پر' پرانے اور نئے عہد نامے کے اہم واقعات منقش کر رہا تھا۔ اور اب آخر آخر میں آ کر جولیس اینجلو کے ساتھ کوئی بدمزگی نہیں پیدا کرنا چاہتا تھا۔

جولیس ثانی کو یاد تھا کہ اینجلو نے' چرچ آف ہولی سپرٹ کے لیے جب لکڑی پر یسوع کا ''کروسیفکیس'' تراشا تھا' تو اس کا ماڈل وہ نوجوان تھا جس کا ہولی سپرٹ مونیسٹری میں اچانک انتقال ہو گیا تھا۔ اینجلو کی وجہ سے وہ جنازہ بارہ گھنٹے دیر سے اٹھا تھا۔

وہ برمانتے (Bramante) نہیں تھا جو تخیل سے کردار پیدا کرتا تھا۔ اسی لیے برمانتے کے کرداروں کے خط و خال ہمیشہ ایک ہی طرز کے لگتے تھے۔ بقول میدیسی وہ ایک ہی خاندان کے لگتے تھے۔ برمانتے کو ہٹا کر اسے پھر اینجلو سے سمجھوتا کرنا پڑا تھا۔

پانچ سال پہلے جب مائیکل اینجلو روم لوٹا تھا تو گھنٹوں سینٹ پیٹرز کے گنبد کے نیچے لیٹ کر آپ ہی آپ کچھ بڑبڑایا کرتا تھا۔ کچھ بولتا رہتا تھا۔ جولیس کو اس کی ذہنی حالت پر شک ہوا تھا۔ ایک بار اس نے بہت پاس جا کر سنا تو وہ بائبل کے کچھ وعظ دوہرا رہا تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو اینجلو؟''

''اوں؟'' اس نے چونک کر دیکھا تھا پوپ کی طرف: ''آیتوں کی پٹیاں کھول رہا ہوں۔''

جولیس ثانی جانتا تھا وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ان اینٹ گارے کی' چونے سے بنی ہوئی دیواروں میں وہ چہرے ڈھونڈ رہا تھا۔ یسوع کا چہرہ' مریم کا چہرہ' پطرس' یوحنا اور یہودہ کا چہرہ۔ وہ جن کے ہاڑ ماس کے پاؤں تو نظر آتے تھے' لیکن چہرے بائبل کی آیتوں میں لپٹے ہوئے تھے۔

جبرئیل کی صورت کے کئی خاکے اس نے کاغذوں پر بنائے تھے۔ جولیس نے پوچھا تھا:

''جبرئیل کا خاکہ کیسے بنایا تم نے؟ وہ تو اس خاکی دنیا سے نہیں ہے۔''

''اس کی آواز سنی تھی۔ پرانے عہد نامے میں!''

''تو پھر خدا کی آواز بھی سنی ہوگی تم نے!'' جولیس نے مذاق کیا تھا۔

''اس کی خاموشی سنی تھی!''

جولیس کو یقین ہو گیا تھا' اس نے صحیح مصور کا انتخاب کیا ہے: ''سنکی ہے!'' اس نے ویٹی کن کمیٹی سے کہا تھا: ''لیکن سسٹین چیپل کی نقاشی صرف وہی کر سکتا ہے۔''

مریم کا ماڈل' اینجلو نے اپنی ماں سے چنا تھا اور اس روز چنا تھا جس دن اس نے اپنی ماں کو ایک بانس پر پانی کے دو ڈول لٹکا کر' کندھوں پر اٹھاتے دیکھا تھا۔ ایسی ہی کوئی توانا عورت ہوگی جس نے نبی کا بوجھ اپنی کوکھ میں سنبھالا ہوگا۔ آگ جلا کر جب اس کی ماں' اس کے باپ کے نہانے کے لیے پانی گرم کر رہی تھی تو اس نے بہت غور سے اپنی ماں کا تمتماتا ہوا چہرہ دیکھا تھا۔ آگ کی لپٹوں کے پیچھے' دہکتا ہوا' سرخ' گرم' کندن کی طرح تپا ہوا چہرہ...... کاغذ پر اس نے بہت سے اسکیچ بنائے تھے اس چہرے کے۔

اس رات اس نے چولہے کے سامنے بیٹھی ماں سے کہا بھی تھا: ''تو نے یسوع کو جنم کیوں نہیں دیا؟''

''اس لیے کہ تیرا باپ مل گیا تھا۔ وہ دیکھ' شراب پی کے دھت پڑا ہے۔ جا' سنبھال اسے!''

اپنے باپ کو دکھانے کے لیے اس نے' اسی وقت ایک گتے پر بڑا سا اسکیچ بنا کر اس کے پلنگ پر لٹکا دیا تا کہ وہ دیکھ لے کہ پینے کے بعد وہ کیا لگتا ہے۔ نیچے لکھا تھا:

''باپ' اگر تو یہ نہ ہوتا' تو ماں مریم ہوتی!''

لیکن اس کی ماں کو وہ اسکیچ بہت پسند آیا۔ ہمیشہ اپنے پاس رکھا۔ آخر تک اس سے کہتی رہی: ''ایسا ہی ایک بت بنا دے نا باپ کا۔ بہت معصوم لگتا ہے!''

اور وہ ہمیشہ یہی کہہ کر ٹالتا رہا: ''کوئی سنگِ مرمر ہی نہیں ملتا' جس کا کردار میرے باپ سے میل کھاتا ہو......''

وہ بہت سال پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں وہ بولوگنا میں رہتے تھے۔ گلی کے نکڑ کا پب اس کا مخصوص اڈہ تھا اور وہی اڈہ اس کے باپ کا تھا۔ باپ مے خانے کے اندر بیٹھ کر پیتا تھا' اور اینجلو بوتل لے کر پب کے باہر آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ سامنے بیٹھے خوانچے والے سے بار بار گرم مونگ پھلیاں خرید کے کھاتا رہتا۔ خوانچے والا جتنی بار مونگ پھلی تولتا تھا' کچھ دانے خوانچے سے زمین پر گر جاتے تھے اور سامنے کھڑا ایک ننگا بچہ ہر بار اٹھا کر انہیں خوانچے میں واپس رکھتا اور ایک دانہ منہ میں ڈال لیتا تھا اور پھر اگلے گاہک کا انتظار کرتا تھا۔ اسی تماشے کے لیے وہ بار بار مونگ پھلی خریدتا تھا۔ اس بچے کے بہت سے خاکے بنائے تھے اس نے' اور کئی سال بعد جب ''میڈونا آف برجیس'' کا بت بنایا تو ننھے یسوع کے لیے اس بچے کا ماڈل استعمال کیا تھا۔ چھوٹا سا ننگا یسوع!

وہی دن تھے جب پہلی بار مائیکل اینجلو کو پوپ نے' سینٹ پیٹرز کے سسٹین چیپل میں پرانے اور نئے عہد نامے کی تمثیلیں منقش کرنے کے لیے کہا تھا۔ اینجلو صرف اس لیے ملاقات کو روم پہنچ گیا تھا کہ اٹلی کا ہر مصور اور سنگ تراش اس کام کے لیے اپنی جان دھڑ کی بازی لگانے کو تیار تھا۔ تواریخ میں لافانی ہو جانے کے لیے یہ ایک کام ہی کافی تھا۔ لیکن مائیکل اینجلو کو لافانی ہو جانا ہی کافی نہیں تھا۔ اس فانی زندگی کے لیے بھی اس کی کچھ شرائط تھیں۔ اسے سنگِ مرمر کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ پوپ جولیس ثانی نے وعدہ تو کیا' لیکن رقم نہیں دی۔

''تمہیں پتھر سے کیوں اتنا لگاؤ ہے؟ رنگوں سے کیوں نہیں؟''

''رنگ دوسروں سے مل کر اپنا رنگ چھوڑ دیتے ہیں۔ بدل جاتے ہیں۔ سنگِ مرمر ایسا نہیں کرتا۔''

اور اب وہ رنگوں سے بھی اتنا ہی اوبھ گیا تھا' جتنا روم سے!

چار مہینے گزر چکے تھے۔ چیپل کی نقاشی اب آخری حصے تک آ گئی تھی۔ وہ عیسیٰ کا ''لاسٹ سپر'' منقش کرنا چاہتا تھا لیکن ہر بار اس کا تخیل ایک ہی چہرے پر آ کر خالی ہو جاتا تھا۔ یہودہ! عیسیٰ کا تیرہواں شاگرد جس نے سونے کے تیس ٹکڑوں کے لیے اپنے پیر و مرشد کو رومیوں کے حوالے کر دیا۔ صلیب پر چڑھوا دیا۔

جولیس ثانی کی بے تابی بھی بڑھنے لگی تھی۔

اینجلو بھی سارا سارا دن کاغذ کالے کرتا رہتا۔ پرانے پرانے اسکیچ نکال کر انہیں پھرولتا'

ان پر کام کرتا، لیکن کسی چہرے سے تسلی نہ ہوتی۔

اور ایک دن اچانک' روم کے ایک چھوٹے سے گندے سے پب میں اسے یہودہ مل گیا۔ ضرورت سے زیادہ چمکدار آنکھیں' مچلتی' پھرتیلا' بار بار اِدھر اُدھر تھوکتا تھا۔ عمر سے پہلے ہی پیشانی چوڑی ہوگئی تھی۔ بولتا تھا تو الفاظ اتنی تیزی سے نکلتے تھے جیسے جیب پھٹنے پر سارے سکے ایک ساتھ گر پڑیں۔ ایک دینار کی ریزگاری لینے آیا تھا۔ اینجلو کے پاس اور اس کی بوتل کا حصے دار بن بیٹھا۔ اینجلو جب باہر نکل رہا تھا تو وہ کسی اور سے دینار کی ریزگاری مانگ رہا تھا۔

اینجلو اسے اپنے ساتھ چیپل میں لے آیا سودا طے کرنے' اور اسے بتایا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اسے یہودہ کی شکل میں نقش کرنا چاہتا ہے۔ وہ لافانی ہو جائے گا۔ اسے چادریں اٹھا اٹھا کر ساری دیواریں اور چھت دکھائی۔ وہ حیرت زدہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر اپنی اس خدمت کے لیے ایک اچھی خاصی رقم کا مطالبہ کیا جو اینجلو دینے کے لیے تیار ہوگیا۔ پھر اس نے کچھ رقم پیشگی چاہی اینجلو نے وہ بھی دے دی۔ وہ کچھ روز باقاعدگی سے آتا رہا چیپل میں۔ اینجلو اسے بیٹھک کے لیے بلاتا تھا۔ ایک روز اینجلو کے پرانے اسکیچ پھرولتے ہوئے اس نے 'بولوگنا' کے بچے کے بارے میں پوچھا......''یہ بچہ کون ہے؟''

''بولوگنا میں رہتا تھا۔ بہت سال پہلے کی بات ہے۔ اسے ننھے یسوع کی صورت دی تھی میں نے۔''

''اس کا نام یاد ہے تمہیں؟''

''ہاں۔ مارسولینی۔''

وہ آدمی مسکرایا۔ اس نے اپنی قمیض کی آستین اٹھائی۔ بانہہ پر کھدا ہوا نام دکھایا:

''مارسولینی''

''میں وہی یسوع ہوں جسے تم یہودہ نقش کر رہے ہو!''